اسلامی عائلی قوانین

(مجموعہ مقالات مسلم فیملی لاء لیکچر سیریز)

مرتب: منور سلطان ندوی

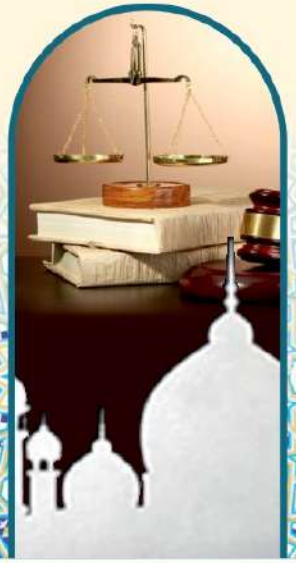

مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ

اسلامی عائلی قوانین

(مجموعہ مقالات مسلم فیملی لاء لیکچر سیریز)

منور سلطان ندوی

Printed by Maktaba Ahsan, Lucknow

Shariah Academy
For Research & Studies
Nadwatul Ulama, Taigore Marg. Lucknow.U.P.(India)
E-mail. : shariahacademynadwa@gmail.com www.mtsnadwa.org

Rs-420/-

اسلامی عائلی قوانین

(مجموعہ مقالات مسلم فیملی لا لکچر سریز)

مرتب

منور سلطان ندوی

(رفیق علمی مجلس تحقیقات شرعیہ واستاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

ناشر

مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ

تفصیلات

نام کتاب	:	اسلامی عائلی قوانین
نام مرتب	:	منور سلطان ندوی
صفحات	:	۳۶۴
سن اشاعت	:	اکتوبر ۲۰۲۳ء
قیمت	:	

ناشر

مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ

ملنے کے پتے:

۱۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲۔ مکتبہ ندویہ، احاطہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۳۔ مکتبہ احسان، نزد شباب مارکیٹ، ندوہ روڈ، لکھنؤ

فہرست

	عناوین	صفحہ
	مقدمہ :مولانا سید محمد بلال عبدالحی حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)	۵
	پیش لفظ: مولانا عتیق احمد بستوی (سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ)	۹
	عرض مرتب: منور سلطان ندوی (رفیق مجلس تحقیقات شرعیہ)	۱۳
۱	خاندانی اور گھریلو نزاعات کے حل میں دارالقضاء کا کردار مولانا عتیق احمد بستوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ)	۱۹
۲	اسلام کا قانون نکاح مولانا ڈاکٹر محمد علی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، رفیق مجلس تحقیقات شرعیہ)	۳۵
۳	اسلام کا نظام طلاق اور اس کی قسمیں مولانا مفتی محمد ظفر عالم ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، مفتی دارالافتاء)	۶۴
۴	کیا طلاق واقع ہونے کے لئے تحکیم اور اشہاد ضروری ہیں؟ مولانا مفتی محمد زید مظاہری ندوی (استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم ندوۃ العلماء)	۱۰۹
۵	تفویض طلاق اور اس کی شکلیں مولانا رحمت اللہ ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، رفیق مجلس تحقیقات شرعیہ)	۱۳۴
۶	خلع کی حقیقت اور اس کے شرعی وقانونی پہلو مولانا مفتی محمد ظفر عالم ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، مفتی دارالافتاء)	۱۴۶
۷	فسخ نکاح (مفقود الخبر، غائب غیر مفقود، عدم ادائے نفقہ) مولانا محمد مستقیم ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، قاضی دارالقضاء)	۱۶۲

۸	فسخ نکاح (بسبب ظلم وزیادتی وشقاق بین الزوجین) مولانا مفتی محمد راشد حسین ندوی (مہتمم مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی)	۱۷۳
۹	طلاق کے بارے میں سپریم کورٹ کے فیصلے۔ایک جائزہ مولانا عتیق احمد بستوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ)	۱۸۳
۱۰	حضانت: شرعی قوانین کے تناظر میں مولانا مفتی محمد ظفر عالم ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، مفتی دارالافتاء)	۲۰۴
۱۱	والدین، اولاد، قریبی رشتہ دار اور بیوی کا نفقہ منور سلطان ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، رفیق مجلس تحقیقات شرعیہ)	۲۱۳
۱۲	عدت شرعی نقطہ نظر اور ضروری احکام ومسائل منور سلطان ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، رفیق مجلس تحقیقات شرعیہ)	۲۳۴
۱۳	نسب: شرعی نقطہ نظر مولانا مفتی مسعود حسن حسنی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، مفتی دارالافتاء)	۲۵۱
۱۴	ہبہ۔شرعی نقطہ نظر مولانا شمیم احمد ندوی (استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء)	۲۷۶
۱۵	وصیت کے احکام مولانا ڈاکٹر محمد نصر اللہ ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، رفیق مجلس تحقیقات شرعیہ)	۲۷۹
۱۶	اسلام کا نظام میراث اور اس میں خواتین کا حصہ مفتی محمد زید مظاہری ندوی (استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم ندوۃ العلماء)	۲۹۷
۱۷	اسلام میں یتیم پوتوں کی میراث مولانا عبید اللہ اسعدی (شیخ الحدیث جامعہ عربیہ، ہتھورا، باندہ)	۳۳۲
۱۸	یکساں سول کوڈ کا قانونی اور تاریخی جائزہ مولانا عتیق احمد بستوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ)	۳۴۲

مقدمہ

از: مولانا سید محمد بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

زندگی میں سماج کی اہمیت ہمیشہ تسلیم کی گئی ہے، اس بھری پری دنیا میں کوئی فرد تنہا انسانی قدروں کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا، آپس کے تعلقات اور ایک دوسرے کی ضرورت کی تکمیل سے سماج بنتا ہے، ہر جگہ اور ہر دور میں معاشرہ کے اصحاب فکر نے اس کی طرف توجہ کی ہے، اس کے لیے ضروری قوانین بنائے ہیں اور سماج کو اس پر ڈالنے کی کوشش کی ہے، لیکن ان تمام کوششوں میں سب سے زیادہ مؤثر، وسیع اور کامیاب کوشش جزیرۃ العرب کی سرزمین پر ہوئی، جہاں سماج برائیوں کی سرحدوں کو چھو رہا تھا۔

معاشرہ کو پاک کرنے کی یہ سب سے پہلی آواز تھی جو کوہِ صفا سے بلند ہوئی، جو لوگ برائیوں کے خوگر ہو چکے تھے ان کے لیے یہ صدا نامانوس تھی، بہتیرے بھلے مزاج لوگ تھے انہوں نے آواز پر لبیک کہا اور اس کو دل کی آواز سمجھا، اور یہیں اس سماج کی بنیاد پڑی جس سے زیادہ بہتر، پرسکون اور فطرتِ انسانی سے قریب تر سماج کا تجربہ اس سے پہلے نوعِ انسانی کو نہیں ہوا تھا، اس کی اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس سماج کی بنیاد وحی الٰہی تھی، آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے آخری بار اس زمین سے آسمان کا رابطہ ہوا، اور رب کائنات نے انسانوں کے لیے وہ آخری اور کامل ومکمل نظام زندگی عطا فرمایا جس کو قیامت تک باقی رکھنے کا فیصلہ کر دیا گیا۔

اس سماج کی تشکیل کا آغاز مکہ میں ہوا اور اس کی تکمیل مدینہ منورہ میں ہوئی، پہلی

مرتبہ اس وسیع پیمانہ پر ایسا باریک اور لطیف نظام زندگی عملی طور پر لوگوں کے سامنے آیا، سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس کی تفصیلات ہی نہیں بیان فرمائیں بلکہ اس کا ایسا عملی نمونہ پیش کیا کہ اس سے زیادہ بہتر کا تصور بھی نہیں ہوسکتا، اللہ تعالی نے قرآن مجید میں اس کی گواہی دی ہے، ارشاد ہے "ولکم فی رسول اللہ أسوۃ حسنۃ" (تمہارے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بہترین نمونہ موجود ہے) یہی وہ اسلامی سماج ہے جس میں عائلی اور خانگی زندگی کے لیے بھی ایسے باریک اصول موجود ہیں جن کو پیش کرنے سے کوئی بھی دنیا کا مذہب یا سماج قاصر ہے۔

موجودہ دور میں خانگی زندگی یا گھریلو نظام کے بارے میں عام طور پر سکوت اختیار کر لیا جاتا ہے کہ یہ ذاتی (Personal) معاملہ ہے، آدمی اس میں آزاد ہے، اس کو اختیار ہے کہ وہ ایسا پسندیدہ نظام اور طریقہ کار اختیار کرے کہ کسی کو اس میں دخل دینے کی گنجائش نہیں۔ یہ وہ مغربی نقطۂ نظر ہے جس کے اثرات وسیع سے وسیع تر ہوتے نظر آرہے ہیں کہ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس نقطۂ نظر کو ذرائع ابلاغ (Media) کی سہولت حاصل ہے۔

جبکہ موجودہ مزاج یہ بنتا جارہا ہے کہ خوبصورت پیکنگ کے ساتھ کیسا گھٹیا اور بے قیمت مال بازار میں لے آیا جائے وہ بیش قیمت بن جاتا ہے، اسی طرح عائلی زندگی کے بارے میں مغربی نقطۂ نظر کا حال ہے، خوبصورت الفاظ اور جاذب نظر وشوق انگیز سیاق وسباق کے ساتھ اس انداز پر نقطۂ نظر پیش کیا جارہا ہے کہ اس کے علاوہ دوسرے نقطہائے فکر دقیانوسی نظر آنے لگتے ہیں، اور جدید تعلیم یافتہ لوگ ان پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے، حالانکہ یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ جدیدیت میں تنظیم کو خاص اہمیت حاصل ہے، کوئی چھوٹا کام بھی کرنا ہوتا ہے تو اس کی تنظیم (Planning) ضروری سمجھی جاتی ہے، تو یہ خاندانی نظام جس پر پورے سماج کی بنیاد ہے اس کی تنظیم نہ کی جائے اور اس کے اصول نہ بنائے جائیں، یہ ایک مہمل سی بات معلوم ہوتی ہے۔

مگر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاندانی نظام کے بارے میں مغربی نقطۂ نظر بھی بے مقصد نہیں ہے، اس کے پس پشت ایک پورا فلسفہ ہے، ایک بڑی پلاننگ ہے، اور موجودہ دور کا میڈیا یورپ وامریکہ کی سرپرستی میں اس کے حصول کے لیے ہمہ تن مشغول ہے، وہ مقصد یہ ہے کہ دنیا میں خاندانی نظام اس طرح بگاڑ کر رکھ دیا جائے کہ انسانی صلاحیتیں سوخت ہو جائیں اور سوچنے کا صرف ایک طرز فکر بن جائے جو مغربی طاقتوں کے حق میں ہو، ضرور ان کے پیچھے بھی اصل ہاتھ یہودیوں کا ہے جنہوں نے امریکہ کو اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے اور عام طور پر مسیحی دنیا ان کے آگے سپر ڈال چکی ہے۔ ایسی صورت حال میں مسلمانوں کے اوپر بڑی ذمہ داری آتی ہے کہ وہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے عائلی نظام زندگی کو دنیا کے سامنے اس انداز سے پیش کریں کہ کم از کم وہ لوگ جن کی فطرت ابھی مسخ نہیں ہوئی ہے، وہ غور کر سکیں اور حقیقت ان کے سامنے آسکے، اس سلسلہ میں علمائے کرام نے مختلف انداز میں کتابیں مرتب کی ہیں اور ان سے عمومی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

عائلی زندگی سب سے زیادہ اتار چڑھاؤ کا شکار رہتی ہے، آئے دن نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں جن سے مسلم معاشرہ عمومی طور پر متاثر ہو رہا ہے، اس لیے ضرورت تھی کہ اس سلسلہ میں اسلام کی رہنمائی اور اس کے عادلانہ نظام کو پیش کیا جائے۔ اس مقصد کے تحت ندوۃ العلماء کے شعبہ ''مجلس تحقیقات شرعیہ'' نے عائلی زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا اور ''مسلم فیملی لا لیکچر سیریز'' کا ماہانہ سلسلہ شروع کیا، تفہیم شریعت کے ان پر گراموں میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور خاص کر ججز اور ان وکلاء کو مدعو کیا گیا جو ''فیملی لا'' سے متعلق مقدمات کو دیکھتے ہیں، تاکہ ان کے سامنے اسلام کے عائلی قوانین پوری طرح واضح ہو سکیں اور جو اشکالات پیدا ہو سکتے ہیں ان کو دور کیا جا سکے، الحمدللہ یہ پروگرام کامیاب ہوئے اور ان کے خاطر خواہ نتائج سامنے آئے۔

ان پروگراموں میں مختلف موضوعات پر قیمتی مقالات پیش کیے گئے، زیر نظر

کتاب انہیں مقالات کا مجموعہ ہے جسے مولانا منور سلطان ندوی (رفیق علمی مجلس تحقیقات شرعیہ) نے سلیقہ کے ساتھ مرتب کر کے پیش کیا ہے، امید ہے کہ اس سے عمومی طور پر استفادہ کیا جائے گا۔

بلال عبدالحی حسنی ندوی
(ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

پیش لفظ

از مولانا عتیق احمد بستوی
(سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء)

الحمدللہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی النبی الامین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین ،امابعد!

مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء کے اہداف ومقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے اس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ اسلام کے عائلی قوانین (نکاح وطلاق، میراث وغیرہ) جنہیں آج کل ''مسلم پرسنل لاء'' کے نام سے جانا جاتا ہے کے مختلف موضوعات پر مجلس کی نگرانی میں ایسے محاضرات (لکچرس) کا اہتمام کیا جائے جس میں ان موضوعات کے بارے میں شرعی نقطۂ نظر، کتاب وسنت اور ادلہ شرعیہ کی روشنی میں آسان اسلوب میں پیش کیا جائے، ان محاضرات میں زیادہ تفصیل سے کام نہ لیا جائے، ہر موضوع کے اہم اور بنیادی نکات کی وضاحت پر اکتفا کیا جائے اور دور حاضر میں اس موضوع کے بارے میں جو غلط فہمیاں اور شبہات پیدا کئے جارہے ہیں، انہیں اطمینان بخش طریقہ پر ختم کرنے کی کوشش کی جائے، اس طرح کا مطالبہ وکلاء اور قانون دانوں کی طرف سے بھی آرہا تھا اور مختلف پروگراموں میں علماء کے ساتھ شریک ہونے کے بعد باصلاحیت اور معتبر وکلاء میں بھی یہ احساس بڑھ رہا تھا کہ مسلم پرسنل لا کے مختلف اہم موضوعات کے بارے میں ہماری معلومات ادھوری ہیں، اس کے ازالے کی شکل یہی ہے کہ علماء ان موضوعات پر تیاری کے ساتھ لکچر دیں اور وکلاء اور قانون دانوں کو ان کے بارے میں سوالات کرنے کا پورا موقع

دیا جائے، تاکہ اسلام کا صحیح قانون ہمارے سامنے آئے اور اسلامی قوانین کے بارے میں شکوک وشبہات کے جو کانٹے چبھ رہے ہیں انہیں خوشگوار ماحول میں دور کرسکیں۔

طبقہ علماء میں بھی اس بات کا احساس پایا جاتا تھا کہ مسلم پرسنل لا سے متعلق ہندوستان میں رائج قوانین کے بارے میں ہماری واقفیت بہت کچھ ناقص ہے اور موجودہ قوانین کی اصطلاحات سے ناواقف ہونے کی بنیاد پر وکلاء اور ججز کے ساتھ افہام وتفہیم میں دشواری پیش آتی ہے، لہذا اگر اسلام کے عائلی قوانین اور مسلم پرسنل لا کے موضوعات پر ایسی مشترکہ نشستیں ہوں جس میں وکلاء اور ماہرین قانون کے ساتھ علماء اور اصحاب افتاء کی بھی شرکت ہو اور دونوں طبقات کے درمیان تبادلۂ خیالات اور افادہ واستفادہ کا موقع فراہم ہو تو ایسی نشستیں علماء اور اصحاب افتاء کے لئے بھی حد درجہ مفید ہوسکتی ہیں اور دور حاضر میں اسلامی شریعت کی تفہیم میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔

انہی محرکات اور تقاضوں کے تحت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ اور حضرت مولانا محمد حمزہ حسنی ندویؒ سابق ناظر عام ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مشورے سے ماہانہ فیملی لالکچر سریز کا انعقاد ۶/ دسمبر ۲۰۲۲ء سے شروع ہوا، الحمدللہ یہ سلسلہ بہت پسند کیا گیا لکھنؤ کے ہائی کورٹ، فیملی کورٹ، سیشن کورٹس وغیرہ کے موقر وکلاء اور بعض ججز اس میں شرکت کرتے رہے، اسی طرح ندوۃ العلماء کے اساتذہ خصوصاً نوجوان اساتذہ نے اس پروگرام میں بڑی دلچسپی لی اور پابندی سے شرکت کرتے رہے، مختلف اصحاب تحقیق علماء اور وکلاء کو شرعی اور قانونی موضوعات پر مقالات پیش کرنے، اظہار خیال کرنے کے لیے دعوت دی جاتی رہی، الحمدللہ بڑے خوشگوار اور سنجیدہ ماحول میں یہ پروگرام منعقد ہوتے رہے، اب تک اس سلسلہ کے سترہ لکچرس مجلس تحقیقات شرعیہ کی زیر نگرانی پیش کئے جاچکے ہیں، بعض موضوعات پر مذاکرے کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں متعدد اہل علم نے اپنا نقطۂ نظر رکھا اور تبادلہ خیالات کئے۔

ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ فیملی لاسریز کا یہ سلسلہ تسلسل کے ساتھ جاری

ہے اور جن موضوعات پر لکچر ہو چکے ہیں، یہ موضوعات اسلام کے عائلی قوانین کے بڑے حصے کا احاطہ کرتے ہیں۔

فیملی لا لکچر سریز کے پروگراموں کو انجام دینے کی ذمہ داری مجلس تحقیقات شرعیہ کے رفیق جناب مولانا منور سلطان ندوی (مرتب فتاویٰ ندوۃ العلماء) کے ذمہ کی گئی تھی، عزیز موصوف پوری دلچسپی اور بڑی محنت ولگن کے ساتھ مجلس تحقیقات شرعیہ کے دیگر رفقاء کے تعاون سے اس فیملی لکچر سریز کے پروگرام کو انجام دے رہے ہیں، ہر لکچر کے لئے عنوان کا انتخاب، لکچر دینے والوں کی تلاش، لکچر تیار کرنے والوں سے بار بار رابطہ کرنا، وقت پر لکچر کو حاصل کرنا، ان کی کمپوزنگ وتیاری، دعوت ناموں کا اجراء، ایسے بہت سے کام ہیں جو اس سلسلہ کو قائم کرنے کے لئے برابر انجام دینے پڑتے ہیں، اللہ تعالیٰ عزیز موصوف اور مجلس تحقیقات شرعیہ کے دیگر تمام رفقاء ومعاونین کو جزائے خیر عطا فرمائے، یہ لوگ بڑی مستعدی اور ذمہ داری کے ساتھ مجلس کے تمام کاموں کو انجام دے رہے ہیں۔

ندوۃ العلماء کے ذمہ داران: موجودہ ناظم جناب مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم اور موجودہ ناظر عام ندوۃ العلماء جناب مولانا سید محمد جعفر مسعود حسنی ندوی صاحب کی خصوصی توجہ مجلس تحقیقات شرعیہ کے کاموں پر رہتی ہے، ان حضرات کی سرپرستی وتوجہ کی وجہ سے یہ کام رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب کی عمر میں برکت دے اور ترقیات سے نوازے۔ آمین

فیملی لکچر سریز میں اب تک جو مضامین پیش کئے گئے تھے، اس کا مجموعہ ''اسلامی عائلی قوانین'' کے نام سے مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء کے پانچویں فقہی سیمینار کے موقع پر شائع کیا جارہے، ان کی ترتیب کی ذمہ داری عزیز گرامی مولانا منور سلطان ندوی کے ذمہ کی گئی تھی، جسے انہوں نے خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کیا۔

اللہ سے دعا ہے کہ مقالات کا مجموعہ انتہائی مفید ثابت ہو، اسلامی عائلی قوانین کی توضیح وتشریح اور ان کے بارے میں پیدا ہونے والی غلط فہمیوں اور شبہات کے ازالہ میں ہر

طرح کامیاب رہے، مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء اس کی بھی کوشش کرے گی کہ ان مقالات کو انگریزی، ہندی اور دوسری زبانوں میں منتقل کیا جائے تاکہ اس کی افادیت کا دائرہ وسیع ہو اور اس کام کے اثرات دور دور تک پہونچے۔ آمین

عتیق احمد بستوی
سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ
ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۱۷/ اکتوبر ۲۰۲۳ء

عرض مرتب

عصری تعلیم یافتہ افراد، خصوصا وکلاء اور قانون سے وابستہ افراد کو اسلامی شریعت کے مقاصد، شرعی احکام کے مصالح اور اس کی حکمتوں سے واقف کرانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، کیونکہ یہی افراد عدالتوں میں اسلامی شریعت کی ترجمانی اور وکالت کرتے ہیں، اس ضرورت کی تکمیل کے لئے مختلف انداز سے کوششیں ہورہی ہیں، خاص طور پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ 'تفہیم شریعت'' کے عنوان سے مستقل اس جانب توجہ دے رہا ہے، اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں نے ایک سنجیدہ، علمی اور ٹھوس کوشش شروع کی، 'مسلم فیملی لا لکچر سریز' اسی کوشش کی عملی تصویر ہے۔

مجلس تحقیقات شرعیہ کے احیاء کے بعد دیگر کاموں کے ساتھ اس جانب بھی توجہ دی گئی، مجلس کے ارکان مشاورت کی ایک نشست میں فیملی لاء کے موضوع پر ایک سلسلہ وار پروگرام کرنے کے بارے میں گفتگو ہوئی، چنانچہ مجلس کے سکریٹری مولانا عتیق احمد بستوی صاحب نے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ، اور مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندویؒ (یہ دونوں حضرات اس وقت بقید حیات تھے) کے سامنے اس کام کی ضرورت وافادیت اور اس کی تفصیلات رکھی، ان حضرات نے مذکورہ پروگرام کی نہ صرف اجازت مرحمت فرمائی بلکہ اس خیال کی بڑی تحسین کی، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نے تو ایک موقع پر یہاں تک فرمایا کہ ''یہ کام ندوہ ہی کرسکتا ہے اور ندوہ کو یہ کرنا چاہیے''۔

چنانچہ مجلس کے ارکان مشاورت کے باہم مشورہ سے اس کے موضوعات طے کئے

گئے، پروگرام کا منہج یہ طے ہوا کہ پرسنل لاء سے متعلق جو موضوعات آتے ہیں، ان میں سے ہر موضوع پر ایسا علمی لکچر پیش کیا جائے جو جدید ذہن کو مطمئن کرسکے، ابتدائی ایک دو پروگراموں میں وکلاء اور قانون دانوں کے سامنے موضوع سے متعلق صرف شرعی نقطہ نظر کی وضاحت کی گئی، لیکن اس کے بعد یہ طے پایا کہ ہر موضوع پر دو لکچرس ہوں، ایک شرعی نقطہ نظر سے اور دوسرا اس موضوع سے متعلق ملکی قانون کے حوالے سے، ۶ دسمبر ۲۰۲۰ء کو اس سلسلہ کا پہلا پروگرام کلیۃ اللغۃ کے پروگرام ہال میں منعقد ہوا، مولانا مفتی محمد ظفر عالم ندوی (استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے اسلام میں طلاق کے نظام پر پُرمغز مقالہ پیش کیا، الحمدللہ یہ پروگرام توقع سے بہت زیادہ کامیاب رہا، جہاں شرکاء (جو وکلاء اور قانون داں حضرات تھے) نے اس کی بھرپور ستائش کی، وہیں اس پروگرام کے مہمان خصوصی جناب ظفریاب جیلانی صاحبؒ نے اسے موجودہ وقت کی بڑی دینی خدمت سے تعبیر کیا۔

مسلم فیملی لا لکچر سریز کے جو بنیادی موضوعات طے گئے تھے وہ قریب قریب مکمل ہوگئے ہیں، دسمبر ۲۰۲۰ء سے اگست ۲۰۲۳ء تک کل سترہ پروگرام ہوچکے ہیں، جن میں تین موضوعات پر مذاکرے ہوئے، باقی تمام موضوعات پر مقالے پیش کئے گئے، اکثر پروگرام میں دوران لکچر شرکاء کو مقالات پیش کئے گئے اور بعض مقالات کا ہندی ترجمہ بھی شرکاء کو فراہم کیا گیا، اب تک جہاں نکاح، طلاق، خلع، فسخ نکاح، نفقہ، وصیت، حضانت، میراث، میراث میں عورتوں کا حصہ جیسے خالص دینی موضوعات پر لکچرس ہوئے وہیں یونیفارم سول کوڈ اور مذہبی آزادی کے حدود جیسے وقت کے حساس مسائل پر بھی مذاکرے ہوئے، اسی طرح ملکی قانون سے متعلق موضوعات میں بیوی پر شوہر کی زیادتی، ڈومیسٹک وائلینس ایکٹ (Domestic Violence Act)، عدالتوں میں دائر طلاق سے متعلق مقدمات کی قانونی بنیادیں، طلاق سے متعلق سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے بعض فیصلوں کا جائزہ، قانون انفساخ نکاح مسلمات ایکٹ ۱۹۳۹ء، نکاح، وصیت، ہبہ، اور حضانت وحق پرورش سے متعلق ملکی قانون جیسے موضوعات شامل ہیں، ان موضوعات پر ماہرین

قانون کے نہایت مفید علمی لکچرس ہوئے۔

اس بات کی پوری کوشش کی گئی کہ جہاں شریعت سے متعلق موضوعات پر شریعت کے ماہرین کے لکچرس ہوں وہیں قانون سے متعلق موضوعات پر لاء کے پروفیسرز اور سینئر وکلاء کو زحمت دی جائے، چنانچہ اس سلسلہ وار پروگرام میں طبقہ علماء میں مولانا عتیق احمد بستوی، مولانا عبیداللہ اسعدی (شیخ الحدیث جامعہ عربیہ باندہ)، مفتی محمد زید مظاہری ندوی، مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مولانا محمد مستقیم ندوی، مفتی محمد راشد حسین ندوی (مہتمم مدرسہ ضیاء العلوم، رائے بریلی)، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا ڈاکٹر محمد نصر اللہ ندوی، مولانا ڈاکٹر محمد علی ندوی اور راقم سطور کے محاضرات پیش ہوئے، وہیں ملکی قانون پر لکچر دینے والوں میں ڈاکٹر مصطفیٰ کمال شیروانی (سابق ڈپٹی وائس چانسلر نجیار یونیورسیٹی تنزانیہ)، پروفیسر ڈاکٹر نسیم احمد جعفری (صدر شعبہ قانون انٹگرل یونیورسیٹی لکھنؤ)، پروفیسر کمال احمد خان (شعبہ قانون لکھنؤ یونیورسیٹی)، پروفیسر یوسف افضال (شعبہ قانون انٹگرل یونیورسیٹی لکھنؤ)، پروفیسر وحید عالم (شیعہ کالج آف لاء، لکھنؤ)، ایڈوکیٹ عامر نقوی (ہائی کورٹ)، ایڈوکیٹ عتیق الزماں صدیقی (ہائی کورٹ لکھنؤ)، ایڈوکیٹ صبیح احمد، ایڈوکیٹ مرزا غوث، ایڈوکیٹ مجتبیٰ شیروانی، ایڈوکیٹ ریحان انصاری، ایڈوکیٹ مشتاق احمد صدیقی کے اسمائے گرامی شامل ہیں، ان حضرات کے لکچرس ریکارڈ نہیں ہو سکے، اس لئے یہ مجموعہ ان قیمتی باتوں سے خالی ہے، البتہ ان حضرات سے درخواست کی گئی ہے، انشاء اللہ آئندہ ان کی تحریروں کا کوئی مجموعہ شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ان پروگراموں میں محاضرین کے علاوہ مہمان خصوصی اور صدر پروگرام کی حیثیت سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اکثر سینئر اساتذہ بطور خاص مولانا محمد زکریا سنبھلی ندوی، مولانا خالد ندوی غازیپوری، مولانا عبدالعلی فاروقی (مہتمم دارالعلوم فاروقیہ، کاکوری)، مولانا جہانگیر عالم قاسمی (انجمن فلاح دارین لکھنؤ)، مولانا خالد رشید فرنگی محلی اور ماہرین قانون میں جناب ظفریاب جیلانیؒ، ریٹائرڈ جج جناب صبغت اللہ صاحب، ریٹائرڈ جج جناب

ایس ایم حسیب صاحب، ریٹائرڈ جج جناب مشیر عباسی صاحب، ریٹائرڈ جج جناب بدرالدجی نقوی صاحب، جناب سلیمان رحیم آبادی اور دیگر اہل دانش شامل ہوتے رہے ہیں۔

اس مجموعہ میں تین ایسے مقالات بھی شامل ہیں جو گذشتہ دنوں کورٹ بند ہونے اور پروگرام نہ ہونے کی وجہ سے پیش نہیں ہو سکے، مولانا محمد شمیم احمد ندوی، مولانا مسعود حسن حسنی ندوی کے مقالات اور راقم سطور کا ایک مقالہ اسی نوعیت کے ہیں، یہ مقالات اسی پروگرام کے لئے لکھوائے گئے تھے، اس لئے انہیں شامل اشاعت کیا گیا ہے۔

اس مجموعہ میں شامل اکثر مقالات میں تصحیح کے علاوہ کوئی ترمیم نہیں کی گئی ہے، البتہ بعض مقالات زیادہ طویل تھے، ان کو مختصر کیا گیا ہے، کتاب کی ضخامت بڑھ جانے کی وجہ سے ایسا کرنا ضروری تھا۔

فیملی لاء لکچر سریز کے مقالات کو قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے بے پناہ قلبی مسرت ہوئی رہی ہے، مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء کی جانب سے پیش ہونے والی اس منفرد کاوش کا یہ علمی تحفہ ہے، اس موقع پر مجلس کے رکن مشاورت مولانا حفظ الرحمٰن ندویؒ (سابق استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء و رکن مجلس مشاورت مجلس تحقیقات شرعیہ) اور ممتاز قانون داں جناب ظفریاب جیلانیؒ کا ذکر کرنا بھی مناسب ہوگا، اول الذکر اس پروگرام کے اولین محرکین میں سے تھے، ان کے افکار و تجربات سے مجلس کو بہت فائدہ پہونچ رہا تھا، وہیں جیلانی صاحبؒ جب تک روبصحت تھے نہ صرف پابندی سے پروگرام میں شریک ہوتے رہے بلکہ اس پروگرام کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، اللہ تعالی ان دونوں کو اپنی شایان شان بدلہ عطا فرمائے۔

مخدوم گرامی حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی صاحب (ناظم ندوۃ العلماء) اور استاذ گرامی مولانا عتیق احمد بستوی (سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ) کی قیمتی تحریریں اس مجموعہ کی افادیت کو دوچند کر رہی ہیں، موجودہ ناظر عام مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی صاحب مجلس کی سرگرمیوں سے بڑی دلچسپی لیتے ہیں، میں ان تمام حضرات کا سپاس

گزارہوں،اس موقع پرمولانا کمال اختر ندوی (مشیرناظرعام) کویادنہ کرنابڑی ناانصافی ہوگی کہ اس پروگرام کی افادیت ومعنویت کو بڑھانے میں ان کا بڑا کردار ہے،اسی طرح مجلس کے دوباحثین برادرم محمد مرغوب الرحمٰن ندوی اور برادرم کلیم اللہ خان ندوی بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں،ان دونوں نے اس مجموعہ کی پروف ریڈنگ میں بڑی محنت کی،اللہ تعالی ان کے علم وعمل میں برکت عطافرمائے،اورانہیں علم دین کا سچا خادم بنائے۔

اللہ تعالی اس کوشش کوقبول فرمائے،اوراسے میرے لئے ذخیرآخرت بنائے۔

آمین یارب العالمین۔

منورسلطان ندوی

رفیق مجلس تحقیقات شرعیہ،ندوۃ العلماء

۱۰/اکتوبر۲۰۲۳ء

مقالات

خاندانی اور گھریلو نزاعات کے حل میں دارالقضاء کا کردار

مولانا مفتی عتیق احمد بستوی
(سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

نظامِ قضاء اور مسلمان

تاریخ کے ہر دور میں مسلمان جہاں بھی رہے خواہ وہ حاکم بن کر رہے یا محکوم بن کر، انہوں نے نظام قضاء برپا کرنا اپنا اولین دینی فریضہ تصور کیا، اس لیے کہ قضاء شرعی کے بغیر مسلم معاشرے کے لیے اسلامی زندگی کا تصور ممکن نہیں، تاریخ اسلام کے ہر دور میں دارالقضاء اور مسلم قاضیوں کے بے لاگ فیصلوں نے عدل وانصاف، مساوات انسانی اور قانون شریعت کی بالادستی کی ایسی روشن مثالیں دنیا کے سامنے پیش کی ہیں جن کا تصور بھی دنیاوی عدالتیں نہیں کرسکتیں، ہمارے مسلم قاضیوں نے قانون کی بالادستی قائم رکھتے ہوئے ایک معمولی رعیت کی درخواست پر خلیفۃ المسلمین، سلطانِ وقت اور بڑے بڑے جابر امراء کو فریق مقدمہ کی حیثیت سے دارالقضاء میں طلب کیا ہے اور ان کے خلاف فیصلوں کو نافذ کیا ہے، قاضیوں کے ان بے لاگ فیصلوں نے دعوتِ اسلام کے لیے راہیں ہموار کیں اور غیر مسلموں کے قلوب قبول اسلام کے لیے کھول دیئے۔

ہندوستان میں قضاء شرعی کا نظام

ہندوستان میں سب سے پہلے جنوبی ہند اور گجرات کے ساحلوں پر مسلمانوں کے قدم پہنچے، قرون اولیٰ کے یہ مسلمان اکثر وبیشتر تجارت کے سلسلے میں ہندوستان وارد

ہوئے، ان تاجروں نے ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں، دعوت اسلام کا فریضہ بھی انجام دیا، یہ ابتدائی دور ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت واقتدار، سطوت وشوکت کا دور نہیں بلکہ ان کی محکومیت کا دور تھا، پھر بھی انہوں نے اپنی آبادیوں میں قضاء شرعی کا نظام قائم کیا اور اس وقت کے ہندو راجاؤں اور حکمرانوں نے مذہبی رواداری کا ثبوت دیتے ہوئے مسلمان قاضیوں کی قانونی حیثیت تسلیم کی، ان کے فیصلوں کو واجب التسلیم قرار دیا، اولوالعزم مسلمان سلاطین وفاتحین نے سرزمین ہند کو فتح کرنے کے بعد پورے ہندوستان میں اسلام کا نظام عدل نافذ کیا اور تقریباً مسلمانوں کے پورے دور اقتدار میں ہندوستان پر اسلامی قانون کی بالادستی رہی، لیکن مسلم سلاطین نے غیر مسلموں کے مذہبی معاملات میں ادنیٰ مداخلت نہیں کی، غیر مسلموں کو ان کے مذہب اور رسم ورواج پر عمل کرنے کی پوری آزادی دی، ان کے مذہبی امور وعبادات کا انتظام وانصرام بالکلیہ انہیں کے مذہبی پیشواؤں، پنڈتوں اور پروہتوں کے ہاتھوں میں دے دیا، ہندوؤں کو ان کے پرسنل لا پر عمل کرنے اور اپنے تنازعات ہندو پرسنل لا کے مطابق فیصل کرانے کی پوری آزادی دی۔

انگریزی دور میں نظامِ قضاء

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد انگریزوں نے ہندوستان پر حکمرانی شروع کی تو انہوں نے اسلامی تہذیب وثقافت کا ہر نقش ہندوستان سے مٹا دینا چاہا، تمام شعبہ ہائے زندگی کی طرح انہوں نے محکمۂ عدلیہ سے بھی اسلام کے اثرات محو کرنے کا منصوبہ بند پروگرام بنایا، تدریجاً انہوں نے اسلامی قوانین منسوخ کرکے اپنے وضع کردہ قوانین ہندوستان کی عدالتوں میں نافذ کئے، ۱۸۵۷ء کی جنگ میں چونکہ مسلمانوں نے قائدانہ رول ادا کیا اور ہندوستان میں برطانوی قصرِ استعمار کی بنیادیں متزلزل کردیں، اس لیے انگریزوں نے حالات پر قابو پانے کے بعد مسلمانان ہند کو ظلم وستم کا خصوصی نشانہ بنایا،

مسلمانوں کو من حیث القوم فنا کے گھاٹ اتارنے اور انہیں مذہب کے عزیز ترین سرمایہ سے محروم کرنے کا جو طویل المیعاد منصوبہ انگریزوں نے تیار کیا اسی کا ایک جزء یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کا اسلامی تشخص ختم کر دیا جائے اور مسلمانان ہند کو اسلامی قانون سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا جائے، اس منصوبہ کے تحت ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے بڑی برق رفتاری کے ساتھ عدلیہ کا پورا ڈھانچہ تبدیل کر کے رکھ دیا، ۱۸۶۲ء میں اسلامی تعزیرات کو منسوخ کر کے تعزیرات ہند کا نفاذ عمل میں آیا، ۱۸۶۴ء میں زبردست قدم اٹھاتے ہوئے برطانوی حکومت ہند نے مسلمان قاضیوں کی تقرری موقوف کر دی، ۱۸۶۴ء سے قبل ہر علاقہ میں حکومت سے مسلمان قاضی مقرر کئے جاتے تھے، جو مسلمانوں کے خانگی اور عائلی تنازعات میں شریعت اسلامی کے مطابق فیصلے دیا کرتے تھے، ۱۸۶۴ء میں نظام قضاء کے خاتمہ کے بعد مسلمان مجبور ہو گئے کہ اپنے خالص خانگی اور عائلی جھگڑے، نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق قضیے بھی غیر مسلم ججوں کی عدالت میں لے جائیں، ۱۸۷۲ء میں اسلامی قانون شہادت کی حکمرانی عدالتوں سے ختم کر دی گئی، اس کی جگہ انسانی ذہنوں کا تراشا ہوا قانون شہادت نافذ کیا گیا، غرضیکہ ایک ایک کر کے اسلامی قصرِ عدالت کی ساری اینٹیں جدا کر کے پورے عدالتی نظام کو غیر اسلامی خطوط پر استوار کیا گیا، اور یہ سب کچھ سنگینوں کی نوک پر جبر و تشدد کے سہارے کیا گیا، مسلمانوں کی آہ و فریاد، نالہ و احتجاج نے کوئی اثر نہیں کیا۔

امتداد زمانہ کے ساتھ انگریزوں کے جوشِ غضب میں اور جذبۂ انتقام میں قدرے کمی ہوئی، مسلمانوں میں بھی ایک طبقہ پیدا ہوا، جس نے برسر اقتدار قوم سے مستقل رسہ کشی قوم مسلم کے لیے مضر سمجھ کر انگریزوں سے رسم و راہ پیدا کی، مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان نفرت و عداوت کی جو گہری خلیج پیدا ہو گئی تھی، اسے پاٹنے کی کوشش کی، دوسری طرف انگریز حکام نے محسوس کیا کہ ظلم و انتقام کی پالیسی خود حکومت کے حق میں مضر ہے، ہندوستانی مسلمانوں کا حقیقت پسندانہ مطالعہ کرنے کے بعد انگریز مبصرین اس نتیجہ تک پہنچے کہ مسلمان

مذہب کے سلسلے میں سب سے زیادہ حساس واقع ہوئے ہیں اور برطانوی حکومت ہند سے مسلمانوں کی نفرت و عداوت کا سب سے اہم سبب ان کے دینی معاملات میں صریح مداخلت ہے، بالآخر مرکزی مجلس قانون ساز کے مسلم اراکین کی تحریک اور کوششوں سے ۱۹۳۷ء میں شریعت ایکٹ منظور ہوا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''وراثت، نکاح، فسخ نکاح بشمول طلاق، ایلا، ظہار، لعان، خلع، مبارات، نفقہ، مہر، ثبوت نسب، امانت، جائیداد، حق شفعہ، ہبہ اور اوقاف کے معاملات میں مسلمان لازمی طور پر مسلم پرسنل لا کے تابع ہوں گے، وصیت اور تبنیت کے معاملات میں مسلم پرسنل لا کا اطلاق اختیاری ہوگا۔''

شریعت ایکٹ کے بعد

شریعت ایکٹ منظور ہونے سے اسلامی قانون کے ایک جزء کو جسے ہم عائلی قوانین سے تعبیر کرتے ہیں، قانونی تحفظ حاصل ہوا لیکن عائلی قوانین کے تعلق سے دو پہلو شریعت ایکٹ منظور ہونے کے بعد بھی نظر ثانی اور ترمیم کے محتاج تھے: (۱) مسلمانوں کے عائلی اور معاشرتی نزاعات کا فیصلہ کرنے کے لیے مسلم قاضیوں کا تقرر شرعاً ضروری تھا، کیونکہ غیر مسلم جج کا فیصلہ ان معاملات میں خواہ اسلامی قانون کے مطابق ہی کیوں نہ ہو شرعاً نافذ العمل نہیں ہوتا، لہٰذا اگر ایک غیر مسلم جج خالص شریعت اسلامی کے مطابق ایک مسلمان عورت کا نکاح فسخ کرتا ہے تو شرعاً نکاح فسخ نہیں ہوتا اور وہ عورت دوسرا نکاح کرنے کی مجاز نہیں ہوتی، شریعت ایکٹ مسلمانوں کے لیے اسی وقت کا آرمد و مفید ہو سکتا تھا جب کہ مسلمانوں کے عائلی مقدمات کے فیصلے اور شریعت ایکٹ کے نفاذ کے لیے ہر علاقہ میں مسلمان قاضی مقرر کئے جاتے۔ (۲) دوسرا قابل توجہ پہلو یہ تھا کہ مسلمانان ہند کی غالب اکثریت چونکہ حنفی المسلک ہے، اس لیے عدالتیں عملاً اس کی پابند تھیں کہ شریعت ایکٹ کے دائرے میں آنے والے تنازعات میں فقہ حنفی کے مطابق فیصلہ کریں، فقہ حنفی کی رو سے فسخِ نکاح کے سلسلے میں قاضی کا دائرہ اختیار محدود سے محدود تر ہے، عورتوں پر شوہروں کے مظالم

دن بدن بڑھ رہے تھے، اسلامی شریعت سے دوری کی وجہ سے بہت سے شوہر بیویوں کے حقوق ادا کرنے میں بڑی کوتاہی برت رہے تھے، شوہر کی مفقود الخبر ی، عدم ادائے نان ونفقہ، بلاوجہ ضرب وکوب اور مظالم وغیرہ کی وجہ سے بہت سی عورتیں زندگی سے عاجز تھیں، اس طرح کے حالات میں بھی فقہ حنفی کی رو سے نکاح فسخ کرنے کا اختیار قاضی کو حاصل نہیں، اس پوری صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ شوہروں کے مظالم سے رہائی کے لیے بعض مسلمان عورتیں ارتداد کا راستہ اختیار کرنے لگیں، مسلمان عورتوں کے ارتداد کے بعض ایمان سوز، روح فرسا حوادث پیش آئے۔

علماء کا کارنامہ

دوسرے مسئلہ کی طرف اس دور کے اکابر علماء اور فقہاء نے پوری توجہ کی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی نگرانی وسرپرستی میں ''الحیلۃ الناجزۃ'' کی تالیف کا انقلاب انگیز کارنامہ انجام پایا، عورتوں پر ہونے والے مظالم کا سدباب کرنے کے لیے ضرورت شدیدہ کی بناء پر چند اسباب فسخ کو فقہ مالکی سے اختیار کیا گیا اور فسخ نکاح کے سلسلے میں قاضی کے دائرہ اختیار کو وسعت دی گئی تاکہ ستم رسیدہ عورتوں کی دادرسی قاضی کے ذریعہ کی جاسکے اور مسلمان عورتیں ارتداد جیسے ایمان سوز اقدام کا خیال دل میں نہ لائیں، حضرت تھانویؒ نے ان مسائل پر محض اپنا فتویٰ صادر نہیں فرمایا بلکہ تمام قابل ذکر علماء ہند کا ان مسائل پر اتفاق حاصل کیا۔

الحیلۃ الناجزۃ کی تالیف کے بعد حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور دوسرے اکابر علماء نے مجلس قانون ساز کے بعض اراکین کو اس پر آمادہ کیا کہ ''الحیلۃ الناجزۃ'' کی روشنی میں فسخ نکاحِ مسلمین کے سلسلے میں ایک بل مجلس قانون ساز میں منظور کرائیں، اس بل کا مسودہ بھی حضرات علماء نے تیار کرکے دیا، قاضی بل کا مسودہ بھی اسی کے ساتھ منسلک تھا، سید محمد احمد کاظمی نے یہ مسودۂ قانون مرکزی مجلس قانون ساز میں پیش کیا اور تین سال کے بحث و

مباحثہ کے بعد ۱۹۳۹ء میں قانون ''فسخ نکاح مسلمین'' پاس ہوا مگر بعض نام نہاد مسلم اراکین مجلس قانون ساز کی پرزور مخالفت کی وجہ سے فسخ نکاح کے لیے مسلم قاضی کی شرط ختم کردی گئی اور مسلمانوں کا ایک بڑا مذہبی مسئلہ حل ہوتے ہوتے رہ گیا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دہوں میں پورا ہندوستان تحریک آزادی کے نعروں سے گونج رہا تھا، ہندوستان کی تمام قومیں ہندوستان کی آزادی کے لیے جان ومال کی بازی لگارہی تھیں، آزادی کی جدوجہد میں مسلمان کسی قوم سے پیچھے نہیں تھے، تحریک آزادی میں مسلمان علماء، قائدین اور عوام، اپنی تناسبِ آبادی سے کہیں زیادہ حصہ لے رہے تھے، تحریک خلافت نے آزادی کی جنگ میں ایک نئی روح پھونک دی تھی، کانگریس آزادی کی جدوجہد کرنے والی سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی، کانگریس کے صف اول کے قائدین میں بہت سے مسلم رہنما اور علماء شامل تھے، جمعیۃ علماء ہند کانگریس کے شانہ بشانہ جدوجہد آزادی میں شریک تھی، اس لیے آزادی سے پہلے کانگریس نے اپنی متعدد سالانہ کانفرنسوں کی قراردادوں میں مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے مسئلہ کو شامل کیا، اور مسلمانوں سے صریح وعدہ کیا اور یقین دہائی کرائی کہ آزادی کے بعد مسلم پرسنل لا کا پورا تحفظ کیا جائے گا اور اس میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔

آزادی کے بعد

آزادی کی صبح بڑی قربانیوں اور تمناؤں کے بعد طلوع ہوئی، لیکن یہ صبح جس کا مدتوں سے انتظار تھا، مسلمانوں کے لیے بڑی بھیانک ثابت ہوئی، تقسیم ملک کے نتیجہ میں نفرت وعداوت کا بادل پورے ملک پر چھا گیا، بے گناہوں کے خون سے ہندوستان کی زمین لالہ زار ہوگئی، ہندوستانی مسلمان بے پناہ خوف وہراس میں مبتلا ہوگئے، مسلمانوں نے آزادی کا جو سہانا خواب دیکھا تھا وہ بکھر کر رہ گیا، انہیں حالات میں آئینِ ہند مرتب اور منظور ہوا، دستور ہند کے واضعین نے مذہب، زبان، تہذیب کی آزادی کو بنیادی حقوق میں

شامل ضرور کیا لیکن مذہب کی آزادی کا دائرہ کہاں تک ہے؟ اس کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کی اور اس کا دائرہ کے تعین عملاً عدلیہ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا، حیرت ہے کہ جس دستور ہند میں پسماندہ اقوام اور بعض اقلیتوں کے تعلق سے معمولی جزئیات کی تفصیل موجود ہے، اسی دستور میں اقلیتوں کے پرسنل لا کے تحفظ سے متعلق ایک جملہ بھی موجود نہیں، ستم بالائے ستم یہ کہ دستور ہند کے واضعین نے مسلم اراکین کی مخالفت کے باوجود دستور ہند کے ''مملکت کے رہنما اصول'' کے حصہ میں دفعہ ۴۴ کے عنوان سے یکساں سول کوڈ کا شوشہ چھوڑا ہے اور اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے سروں پر ننگی تلوار لٹکا دی ہے تا کہ جب بھی حالات سازگار ہوں اقلیتوں کے پرسنل لا کا سر قلم کیا جا سکے۔

موجودہ حالات کا جائزہ

موجودہ حالات میں مسلمانوں کو اپنی تہذیب وثقافت، ایمان وعقیدہ، قانون وشریعت کے سلسلے میں برطانوی دور حکومت سے بھی زیادہ بھیانک اور سنگین صورت حال کا سامنا ہے، آج کل ہندوستان میں مذہب اسلام اور اسلامی شریعت خصوصاً اسلام کے عائلی قوانین پر ہر طرف سے وار ہو رہے ہیں، ایک طرف حکومت ہند ہے جو یکساں سول کوڈ کے لئے مسلسل اور منظّم جدوجہد کر رہی ہے تا کہ ہندوستانی عدالتوں سے اسلامی شریعت کی آخری نشانی یعنی مسلم پرسنل لا کو محو اور شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء کے ''مضر اثرات'' کو زائل کر سکے۔

دوسری طرف ہندو احیاء پسند تنظیمیں اور ہندو فرقہ پرست پریس ہے، یہ لوگ ہندو سماج سے ''ستی'' جیسی شرمناک، انسانیت سوز رسم کا تقدس تو ختم نہیں کر سکے، ایک نئے عہد میں قدم رکھنے کے باوجود ''ستی'' جیسے کتنے ناسور ہندو سماج میں فروغ پا رہے ہیں، ہندو سماج میں جہیز اور تلک کی تباہ کاریاں پورے شباب پر ہیں، آئے دن اخبارات میں اس سلسلے میں شرمناک خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں، ہندو احیاء پرست اور ''مصلحین'' اپنے سماج کی خبر لینے کے بجائے مسلم خواتین کی ''ہمدردی'' میں گھلے جا رہے ہیں، مسلم خواتین خصوصاً مطلقہ عورتوں

کو مسلمان مردوں کے ''مظالم اور پنجۂ استبداد'' سے رہائی دلانے کے لئے ان کی رات کی نیندیں اڑ گئی ہیں اور دن کا سکون غائب ہو گیا ہے، اسلام دشمن فرقہ پرست پریس مسلم سماج کی تصویر بہت بگاڑ کر پیش کر رہا ہے اور ہر مضمون کی تان اسی پر جا کر ٹوٹتی ہے کہ مسلمان خواتین کی بدحالی کا بنیادی سبب مسلم پرسنل لا ہے، لہٰذا مسلم پرسنل لا ختم کیا جانا چاہئے۔

تیسری طرف نام نہاد ترقی پسندوں اور تجدد پسندوں کا گروہ ہے، یہ لوگ اگرچہ نسلاً مسلمان ہیں، لیکن لادینی تعلیم وتربیت، ایمان سوز افکار ونظریات کے نتیجہ میں اسلامی شریعت اور اسلامی عقائد سے ان کا اعتماد اٹھ چکا ہے، اپنے ماضی سے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے، یہ لوگ قرآن وسنت اور مبادیٔ اسلام کے بارے میں بھی شک وشبہ میں مبتلا ہیں اور خالص ملحدانہ افکار وعقائد میں گرفتار ہیں، لیکن نسلاً مسلمان ہونے اور مسلم سماج سے بہت سے مفادات وابستہ ہونے کی وجہ سے واضح طور پر مسلم پرسنل لا کو ختم کرنے کی بات نہیں کہہ سکتے، اس لئے اسلام کے عائلی قوانین میں اصلاح وترمیم اور اس کی نئی تعبیر وتشریح کی ضرورت پر زور دیتے ہیں، اس کے لئے کانفرنسیں کرتے ہیں اور فضا ہموار کرتے ہیں، لطف کی بات یہ ہے کہ اس طبقہ کی طرف سے نکاح وطلاق ومیراث کے جن مسائل میں اصلاح وترمیم کی تجویزیں بار بار دہرائی جاتی ہیں، ان میں سے نوّے فیصد ایسے مسائل ہیں جن کا تعلق قیاس واجتہاد سے نہیں بلکہ قرآن وسنت کے صریح احکام سے ہے، نام نہاد مسلمان تجدد پسندوں کا یہ طبقہ ہمارے لئے سب سے زیادہ خطرناک ہے، اس طبقہ کی دسیسہ کاریوں اور شک انگیزیوں کا بڑے پیمانے پر پردہ چاک کرنا ہمارا سب سے اہم فریضہ ہے، کیونکہ اسلام دشمن طاقتیں ''نسلی مسلمانوں'' کے اسی طبقہ کو آلۂ کار بنا کر اسلام کے عائلی قوانین میں دخل اندازی کی راہیں ہموار کرتی ہیں۔

کئی دہائیوں سے ہندوستانی عدلیہ کا طرز عمل بھی اسلام کے عائلی قوانین کے تعلق سے مسلمانوں کے لئے خاصا پریشان کن اور اضطراب انگیز ہو گیا ہے، ہندوستان کا یہ معزز ادارہ جس نے متعدد موقعوں پر عدل وانصاف کا نام روشن کیا، اور انتہائی نازک موقعوں پر

بڑے عادلانہ اور جراتمندانہ فیصلے دئے، مسلم پرسنل لا کے مسئلہ میں گومگو میں مبتلا نظر آتا ہے، اور مسلم پرسنل لا کے قضیے میں اس کی حیثیت جج کے بجائے فریق کی ہوگئی ہے، ۱۹۸۵ء میں سپریم کورٹ کی آئینی بینچ نے شاہ بانو کیس میں جو فیصلہ دیا اس نے عدلیہ کے اس خطرناک رجحان کو واضح کردیا، اس فیصلہ میں ایک طرف بڑے صریح اور تیکھے انداز میں حکومت کو یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کا مشورہ دیا گیا، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ شریعت (ایکٹ) کی پابندی عدلیہ کو سخت ناگوار ہے، دوسری طرف نفقۂ مطلقہ اور حقوق مطلقہ کے سلسلہ کی قرآنی آیات کی ایسی من مانی تشریح کی گئی جس کی تائید چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں کسی مفسر، فقیہ وعالم کے قول سے نہیں ملتی۔

نظامِ قضاء کی ضرورت

ہندوستان ہی نہیں دنیا کے جس خطے میں بھی مسلمان آباد ہیں، نظامِ قضاء قائم کرنا ان کا ایک اہم دینی فریضہ ہے، تمام مسلمانوں سے خواہ وہ کسی ملک یا خطہ کے رہنے والے ہوں، قرآن وسنت کا مطالبہ ہے کہ اگر باہم اختلاف ونزاع کی صورت پیدا ہوجائے تو اسلامی شریعت کے مطابق اپنے تنازعات کا فیصلہ کرائیں، اس مقصد کے لئے ہر شہر اور خطہ میں قاضی کا ہونا ضروری ہے، جو اسلامی شریعت پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ فہم وفراست، تقویٰ ودیانت کے اوصاف سے بھی متصف ہو، قرآن مجید میں ان لوگوں پر سخت نکیر کی گئی ہے جو ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود اپنے تنازعات اسلامی شریعت کے مطابق حل نہیں کراتے۔

اَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنِ يَزْعُمُوْنَ أَنَّهُمْ آمَنُوْا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ، يُرِيْدُوْنَ أَنْ يَّتَحَاكَمُوْ إِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ أُمِرُوْا أَنْ يَّكْفُرُوْا بِهِ وَ يُرِيْدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلَالاً بَعِيْداً۔ (سورہ نساء آیت: ٦٠)

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ جو (کتاب) تم پر نازل ہوئی اور جو (کتابیں) تم سے پہلے نازل ہوئیں ان سب پر ایمان رکھتے ہیں اور چاہتے یہ

ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جاکر فیصلہ کرائیں، حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اس کا انکار کریں اور شیطان (تو یہ) چاہتا ہے کہ ان کو بہکا کر رستے سے دور ڈال دے۔

اللہ جل شانہ نے اس حقیقت کو بڑے زور وتاکید کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے والے اپنے مقدمات دارالقضاء میں لے جائیں اور وہاں سے صادر ہونے والے فیصلے کو دل وجان سے تسلیم کرکے اس پر عمل پیرا ہوں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (سورہ نساء، آیت: ٦٥)

تمہارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کردو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں، تب تک مومن نہیں ہوں گے۔

قرآن کریم کی متعدد آیات میں نبی اکرم ﷺ کو قانون الٰہی کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جو لوگ قانون شریعت کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے انہیں فاسق، کافر اور ظالم کہا گیا ہے۔

نصب قاضی کا شرعی حکم

فقہائے اسلام نے متفقہ طور پر نصب قاضی کو فرض قرار دیا ہے، امام علاء الدین ابوبکر کاسانی متوفیٰ ۵۸۷ھ نے لکھا ہے:

”نصب القاضی فرض لأنه ینصب لإقامة أمر مفروض و هو القضاء، قال اللّٰه تعالی: ﴿ یا داؤد إنا جعلناك خلیفة فی الأرض، فاحکم بین الناس بالحق.....﴾ وقال تبارك وتعالی لنبینا المکرم علیه أفضل الصلاة والسلام: ﴿ فاحکم بینهم بما أنزل الله﴾ فکان نصب القاضی لإقامة الفرض، فکان فرضا ضرورة۔“ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع)

قاضی مقرر کرنا فرض ہے کیونکہ قاضی کا تقرر ایک فرض کام کی انجام دہی کے لئے ہوتا ہے، وہ فرض کام قضاء ہے، اللہ تعالی نے فرمایا: اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کرو، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے نبی اکرم ﷺ سے فرمایا: ان لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کئے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ کیجئے..... چونکہ قاضی کا تقرر ایک فرض کی انجام دہی کے لئے ہوتا ہے، لہٰذا لازماً تقررِ قاضی فرض ہوا۔

شمس الائمہ امام سرخسیؒ متوفی ۴۹۰ھ لکھتے ہیں :

"إعلم أن القضاء بالحق من أقوى الفرائض بعد الإيمان بالله وهو أشرف العبادات۔" (كتاب المبسوط لشُمس الدين السرخسي، ج١٦، ص ٥٩)

جان لو کہ حق کے مطابق فیصلہ کرنا ایمان باللہ کے بعد اہم ترین فرائض میں سے ہے اور ساری عبادتوں سے اشرف عبادت ہے۔

ہندوستان میں قضاء شرعی کی ضرورت

ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد اکابر علماء کو ہر دور میں نظام امارت اور نظام قضاء کے قیام کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ متوفی ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۸۲۳ء وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے انگریزی تسلط کے بعد ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ جاری کیا، شاہ صاحبؒ نے اس بات پر بھی اپنے فتاویٰ میں زور دیا کہ ہر علاقہ کے مسلمان اپنا امیر مقرر کرلیں اور اسی کے ماتحتی میں وہ تمام اجتماعی کام انجام دیں جو امیر وقاضی کے بغیر انجام نہیں پاسکتے ہیں:

''امامت جمعہ در دارالحرب اگر از طرف کفار والی مسلمان در مکانے منصوب باشد، باذن او درست وإلاّ مسلمانان را باید کہ یک کس را کہ امین ومتدین باشد رئیس قرار دہند کہ باجازت وحضور او اقامت جمعہ واعیاد وانکاح من لا ولی من الصغار وحفظ مال غائب ویتام

وقسمات ترکات متنازع فیھا علی حسب السہام می نمودہ باشد'' (مجموعہ فتاویٰ عزیزی ص ۳۴)۔

اگر کفار کی طرف سے مسلمان والی دارالحرب کے کسی مقام پر مقرر ہو تو اس کی اجازت سے جمعہ قائم کرنا درست ہے، ورنہ مسلمانوں کو چاہئے کہ ایک امین اور متدین شخص کو خود ہی سردار (والی) مقرر کرلیں جس کی اجازت سے جمعہ اور عیدین قائم کی جائیں، اور اس کے حکم سے ان نابالغوں کا نکاح پڑھایا جائے جن کا کوئی والی نہیں ہے، غائب اور یتیموں کے مالوں کی حفاظت کی جائے اور نزاع والے ترکات کو حصص شرعیہ کے مطابق تقسیم کیا جائے۔

علامہ انور شاہ کشمیری متوفی ۱۳۵۲ھ-۱۹۳۳ء نے جمعیۃ العلماء کے اجلاس ہشتم منعقدہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں تحریر فرمایا تھا :

'' آج اگر اعداد وشمار سے کام لیا جائے اور نظر تدقیق وتفتیش سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں ایسی عورتوں کی تعداد جو اپنے خاوندوں کے جور وستم کی تختۂ مشق بنی ہوئی ہیں یا خاوندوں کے مفقود اور لاپتہ ہوجانے کی وجہ سے نان شبینہ کی محتاج ہیں، یا ظالم شوہروں نے ان کو معلقہ بنا کر چھوڑ رکھا ہے، لاکھوں تک پہنچتی ہے، ایسی مظلوم عورتیں جب کہ کسی طرح اپنے خاوندوں کے جور وستم سے خلاصی حاصل نہیں کرسکتیں تو وہ بے بسی اور بے کسی کے عالم میں بدحواس ہوکر ارتداد کی طرف متوجہ ہوتی ہیں، ہندوستان میں اس قسم کے دلخراش اور ناگفتہ بہ کتنے ہی کیس ہوچکے ہیں جو مسلمانوں کی بدقسمتی میں ایسا اضافہ کرتے ہیں، جس کا جبر ناممکن ہے، ایک مسلمان کا مرتد ہوجانا بھی مسلمانوں کے لئے مصیبت کبری ہے، پھر بالخصوص عورتوں کا ارتداد معاذ اللہ ثم معاذ اللہ نہایت سخت مہلکہ ہے، خدا نہ کرے عورتوں میں اس قسم کی تحریک سرایت کرے۔.....دردمند مسلمانوں کا اس وقت سب سے بڑا فریضہ ہے کہ وہ ان بے کس اور بے بس مظلوم عورتوں کی گلوخلاصی کا پہلی فرصت میں سامان کریں اور اس کی ایک ہی سبیل ہے کہ محکمۂ قضاء قائم کرانے کی کوشش کریں اور محکمۂ قضاء ان بے چاریوں کے مصائب کا علاج کرے''۔ (خطبۂ صدارت جمیعۃ العلماء اجلاس پشاور مطبوعہ

''سچ''، لکھنؤ ۲۷ جنوری ۱۹۲۸ء، ص ۴)

علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے مذکورہ بالا سطروں میں جس بھیانک صورت حال کی تصویر کشی کی ہے، میرے خیال میں اس کی سنگینی میں دن بہ دن اضافہ ہوتا گیا، ''قانون انفساخ نکاح مسلمین'' کے ساتھ اگر ''قاضی بل'' بھی پاس ہوگیا ہوتا تو غالباً ستم رسیدہ عورتوں کی بدحالی کا علاج ہوجاتا لیکن اولاً موجودہ پیچیدہ تر عدالتی نظام میں انصاف حاصل کرنا ہمالیہ کی بلندترین چوٹی سر کرنے سے کم نہیں ہے، ہماری سرکاری عدالتوں میں سب سے گراں اور کمیاب چیز انصاف ہے۔ ثانیاً اگر ایک مظلوم عورت ''قانون انفساخ نکاح مسلمین'' کے تحت موجودہ غیر اسلامی عدالتوں سے نکاح فسخ کرانے میں کامیاب ہوگئی تو یہ فسخ نکاح شریعت اسلامی کی نگاہ میں معتبر نہیں ہے، لہٰذا نظام قضاء کی ضرورت جوں کی توں قائم رہی۔

دارالقضاء قائم کرنے کی کوششیں

ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کے بعد اور دارالقضاء کے نظام ختم کئے جانے کے بعد علماء نے خاص طور سے اس بات کو محسوس کیا کہ مسلمانوں کے وہ مسائل جو اجتماعی نظام قائم کئے بغیر حل نہیں ہوسکتے، ان کے لئے پورے ملک میں قضا کا نظام قائم کیا جائے اور مسلمانوں کا یہ مزاج بنایا جائے کہ وہ اپنے آپسی اختلافات خصوصاً گھریلو تنازعات (فیملی میٹرس) کو اسلامی شریعت کی روشنی میں حل کرنے کے لئے دارالقضاء کا نظام برپا کریں، تاکہ سہولت کے ساتھ شریعت کے مطابق ان کے مسائل حل ہوسکیں۔

اس سلسلہ کی سب سے پہلی کوشش قدیم صوبۂ بہار (موجودہ وقت کے صوبۂ بہار، صوبۂ اڑیسہ اور صوبۂ جھارکھنڈ) میں ہوئی، وہاں کے علماء، مشائخ اور قائدین نے امارت کا نظام قائم کیا، اور اس کے تحت مختلف اضلاع میں دارالقضاء کا نظام قائم کیا، اور عوامی سطح پر ذہن سازی کے لئے پوری محنت کی، صوبۂ بہار میں دارالقضاء کا آغاز .....میں ہوا، الحمدللہ اکثر اضلاع میں اور بعض علاقوں میں تحصیلوں تک میں دارالقضاء قائم ہیں، اور ان

کے ذریعہ مسلمانوں کے اختلافات خصوصاً فیملی میٹرس سے متعلق تنازعات کا حل اسلامی شریعت کے مطابق ہوتا ہے، اور لوگ انہیں بخوشی قبول کرتے ہیں، اور ان پر عمل کرتے ہیں، ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض دفعہ فیملی کورٹس کے ججز اور مختلف عدالتوں کے جج اپنے ہاں دائر معاملات میں جبکہ فریقین مسلمان ہوں انہیں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اپنا یہ جھگڑا جس کا مذہب سے تعلق ہے اسے دارالقضاء میں لے جا کر حل کرو، ہمارا وقت برباد نہ کرو۔

صوبۂ بہار کو دیکھ کر بعض اور صوبوں میں بھی امارت کا نظام قائم ہوا، اور ضلع اور تحصیل کی سطح پر دارالقضاء قائم کرنے کی کوشش کی گئی، چنانچہ صوبۂ آسام اور اس سے متصل چند چھوٹے چھوٹے صوبوں میں امارت کا نظام قائم کرکے دارالقضاء قائم کرنے کی بڑے پیمانہ پر کوششیں ہوئیں، چنانچہ صوبۂ آسام میں بھی بڑی تعداد میں دارالقضاء قائم ہیں، جن کے ذریعہ مسلمانوں کے فیملی تنازعات کا حل خاص طور سے کیا جارہا ہے، اور لوگ اسے قبول کررہے ہیں، صوبۂ کرناٹک اور صوبۂ آندھراپردیش میں بھی امارت اور دارالقضاء کی کوششیں ہوئیں، وہاں بھی کچھ مقامات پر دارالقضاء قائم ہیں، اور وہ اپنا کام کررہے ہیں، لیکن مختلف اسباب کی وجہ سے انہیں زیادہ وسعت نہیں مل سکی۔

بورڈ کی طرف سے دارالقضاء کے قیام کی کوششیں

۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ قائم ہوا، وحدت کلمہ کی بنیاد پر اس پلیٹ فارم پر تمام مسلک ومشرب کے مسلمانوں کو مجتمع کیا گیا، مسلم پرسنل لا بورڈ کا بنیادی مقصد ہندوستان میں اسلامی شریعت کا تحفظ ہے، اور اسلامی شریعت میں مداخلت کی تمام کوششوں کو روکنا ہے، خواہ وہ قانون ساز اداروں کے ذریعہ ہو، یا عدالتوں کے ذریعہ، یا انتظامیہ کے ذریعہ، اور مسلمانوں میں یہ شعور بیدار کرنا کہ اسلامی شریعت کا تحفظ خود ان کے ہاتھوں میں ہے، اگر مسلمان اپنی زندگی میں شریعت کے احکام پر عمل کریں، اور اپنے جھگڑے شریعت کے مطابق حل کریں تو ان شاء اللہ شریعت محفوظ رہے گی، اور ہر قسم کی سازش اور دخل

اندازی ناکام ہوگی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے ابتدائے قیام ہی سے مسلمانوں کو متوجہ کیا کہ وہ کم ازکم ضلع کی سطح پر دارالقضاء قائم کریں، اور اپنے گھریلو اختلافات کو شریعت کی روشنی میں دارالقضاء سے حل کرائیں، چنانچہ بورڈ کی تحریک پر کئی مقامات پر دارالقضاء قائم ہوئے، لیکن بورڈ کے ذمہ داروں نے محسوس کیا کہ اس کام میں تیز رفتاری نہیں آرہی ہے، لہٰذا بورڈ نے فیصلہ کیا کہ جن صوبوں میں امارت کا نظام نہیں ہے (اور اکثر صوبے ایسے ہی ہیں) وہاں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ خود دارالقضاء قائم کرنے کی کوشش کرے، اور دارالقضاء بورڈ کی نگرانی میں رہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا فورم ہے، اس میں تمام مسالک، اداروں اور بڑی تنظیموں کی شرکت ہے، لہٰذا بورڈ کو بجا طور پر مسلمانان ہند کا نمائندہ کہا جاسکتا ہے، شرعاً اس کا پورا جواز ہے کہ بورڈ کے متفقہ فیصلے کے بعد صدر بورڈ دامت برکاتہم کی طرف سے مختلف اضلاع اور علاقوں میں قاضی نامزد کئے جائیں، اور بورڈ کی طرف سے ان کے کاموں کی نگرانی ہو، اس کام کے لئے بورڈ نے دارالقضاء کمیٹی قائم کی، اور اس کا کنوینر مقرر کیا، یہ کمیٹی الحمدللہ بورڈ کے ذمہ داروں کی رہنمائی، اور مشورہ سے دارالقضاء قائم کرنے ان کے کاموں کا جائزہ لینے اور ان سے متعلق مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے مختلف صوبوں میں دارالقضاء قائم ہیں، جو بحسن وخوبی اپنے کاموں کو انجام دے رہے ہیں، سب سے زیادہ تعداد صوبۂ مہاراشٹر میں ہے، وہاں بورڈ کے ۳۵/دارالقضاء ہیں، جن میں سے پانچ ممبئی میں ہیں، یوپی میں بورڈ کے ۱۹/دارالقضاء ہیں، صوبۂ گجرات میں ۳، مدھیہ پردیش میں ۳، راجستھان میں ۵، ہریانہ میں ۳، دہلی میں ایک، چھتیس گڈھ میں ایک، کرناٹک میں دو، پنجاب میں ایک اور گوا میں ایک دارالقضاء ہے۔

الحمدللہ پورے ہندوستان میں دارالقضاء قائم کرنے اور اپنے معاملات کو دارالقضاء

کے ذریعہ حل کرانے کا رجحان بڑھا ہے، کووڈ ۱۹/اور لاک ڈاؤن کی وجہ سے دارالقضاء کی سرگرمیاں متاثر رہیں، لیکن جوں جوں حالات بہتر ہورہے ہیں سرگرمیاں بحال ہورہی ہیں، اور نئے دارالقضاؤں کے قیام کے مطالبے بڑھ رہے ہیں۔

بڑی خوش آئند بات ہے کہ دارالقضاء میں آنے والے معاملات میں سے عموماً پنچانوے (۹۵) فیصد معاملات فریقین کی باہمی رضامندی سے حل ہوجاتے ہیں، فریقین جب قاضی کے سامنے ایک ساتھ بیٹھتے ہیں اور قاضی ان کی باتوں کو سننے کے بعد انہیں آپس میں صلح کرنے کی ترغیب دیتا ہے، اور نفسانیت اور ضد پر اڑنے کے نقصانات بتاتا ہے، اور پوری غیر جانبداری اور ہمدردی کے ساتھ ان کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو فریقین کسی نہ کسی بات پر متفق ہوجاتے ہیں، اور جھگڑا خوش اسلوبی کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے، بہت کم معاملات میں ایسا ہوتا ہے کہ فریقین کسی بات پر راضی نہ ہوسکیں، اور قاضی کو دونوں کی خواہش پر اپنا فیصلہ سنانا پڑے۔

یہ پہلو بھی بڑا اہم ہے کہ دارالقضاء سے رجوع ہونے والی ۹۵/فیصد خواتین ہوتی ہیں، رجوع ہونے والوں میں مردوں کا تناسب صرف پانچ فیصد ہے، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دارالقضاء کے نظام سے خواتین کو زیادہ فائدہ پہنچتا ہے، اور زیادہ تر انہیں کی دادرسی ہوتی ہے، دارالقضاء کا نظام سارے مسلمانوں کے لئے خاص طور سے خواتین کے لئے اللہ کی بڑی رحمت ہے۔

آرگنائزر دارالقضاء کمیٹی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مطابق بورڈ کے دارالقضاؤں سے سالانہ اوسطاً دو ہزار سے زائد معاملات حل کئے جاتے ہیں۔

☆☆☆☆

اسلام کا قانون نکاح

ڈاکٹر مفتی محمد علی ندوی

(استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

نکاح کی تعریف ومقاصد

نکاح کی تعریف: نکاح "مرد وعورت کے درمیان شرعی اصولوں پر کیا گیا معاہدہ" ہے۔(الدر المختار مع تنویر الأبصار، ص 177) جس کے نتیجہ میں ایک دوسرے کے ساتھ جنسی تعلق جائز اور پیدا ہونے والی اولاد کا نسب شرعاً ثابت ہو جاتا ہے اور باہم حقوق وفرائض عائد ہو جاتے ہیں۔

عقد نکاح کا مقصد نسل انسانی کی بقاء، عفت وعصمت، باہمی الفت وموانست اور سکون کا حصول ہے۔

اسلام میں نکاح ایک طرف عقد ہے یعنی دو فریقوں کے درمیان معاہدہ ہے، دوسری طرف ایک مقدس عمل اور عبادت ہے، عبادت اسلئے ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں دئے گئے حکم کی تعمیل ہے، نیز حصول عفت وعصمت کا ذریعہ ہے، اس لئے شرعاً نکاح محض "دیوانی معاہدہ" نہیں بلکہ عبادت بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے مسجد کے نورانی اور پاکیزہ ماحول میں منعقد کرنے کی تلقین کی گئی ہے، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں:

أعلنوا هذا النكاح، واجعلوه في المساجد (رواہ الترمذی، باب ماجاء فی إعلان النکاح، حدیث نمبر:1089)

یعنی ''یہ نکاح اعلانیہ طور پر کرو اور مسجد میں اس کا اہتمام کرو۔''

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''أفضل المساجد'' یعنی مسجد حرام میں حضرت میمونہؓ سے رشتۂ ازدواج منسلک کیا تھا۔

نیز اس پر مسرت موقع پر خطبۂ مسنونہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد وثناء، قولِ سدید اور تقویٰ وورع کی نصیحت نکاح کے مذہبی تقدس کو اُجاگر کرتی ہے۔

نکاح نسلِ انسانی کی بقاء کا ذریعہ اور خواہشِ نفسانی کی تکمیل کا مہذب طریقہ ہے۔

شادی سے پہلے استخارہ کرنا

شادی سے پہلے استخارہ کرنا بہتر ہے، کیونکہ کسی جائز کام کے کرنے یا چھوڑنے کا فیصلہ تائیدِ غیبی سے حاصل کرنے کے لیے نمازِ استخارہ ادا کرنا ایک مسنون عمل ہے، نبی اکرم ﷺ ہمیں تمام معاملات میں استخارہ کی اس طرح تعلیم فرماتے تھے جیسے قرآن حکیم کی سورت کی تعلیم فرماتے تھے۔

اگر ایک دن استخارہ کرنے سے کچھ نظر نہ آئے تو یہ عمل سات دن تک جاری رکھنا مفید ہوگا۔ اِن شاء اللہ! خواب میں نظر آنے والی علامات سے مثبت یا منفی اشارہ مل جائے یا کوئی اور طریقہ، لیکن یاد رہے صرف استخارہ کی بنیاد پر آنکھیں بند کر کے شادی نہ کی جائے بلکہ پسند وناپسند اور دیگر معاملات کا ظاہری آنکھوں سے بھی اچھی طرح دیکھ بھال کر فیصلہ کرنا چاہیے۔

رفیقۂ حیات کی تلاش (انتخابِ زوجین)

نکاح کے سلسلہ کی اہم ترین کڑی شریکِ حیات کی تلاش ہے۔ اس حوالے سے شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ عورت کے حسب ونسب، مال وزر اور حسن وجمال سے زیادہ اس کی دینداری کے پہلو کو دیکھا جائے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان منقول ہے:

"تنكح المرأة لأربع خصال: لمالها ولحسبها ولجمالها ولدينها، فاظفر

بذات الدين تربت يداك“

”چار خصلتوں کی وجہ سے عورت سے نکاح کیا جاتا ہے، اس کے مال کی وجہ سے اور اس کے حسب کی وجہ سے (خاندان "نسب"، خاندانی وجاہت) اور اس کے جمال کی وجہ سے اور اس کے دین کی وجہ سے، لہٰذا تو دین والی کو اختیار کر (پھر بطور تکیہ کلام کے فرمایا) تیرے ہاتھ خاک آلود ہو جائیں۔“

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

اَلدُّنْيَا مَتَاعٌ وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا: الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ۔ (مسند أحمد: 6567)

دنیا متاع ہے اور دنیا کی بہترین متاع نیک عورت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کے چار اسباب: خاندان (نسب)، خاندانی وجاہت (حسب)، مال و دولت اور دین و اخلاق میں چوتھے (دین و اخلاق) کو درست بنیاد بتایا ہے، یہی معیار شوہر، داماد اور بہو کے انتخاب میں بھی ہونا چاہئے۔

پیغام نکاح

نکاح کا پیغام ایسی خاتون کو دینا جائز ہے جس کے ساتھ اس شخص کا نکاح فی الحال ہونا صحیح ہو، اس لئے جس مرد و عورت میں دائمی یا عارضی حرمت ہو اس کو نکاح کا پیغام دینا جائز نہیں۔

کسی ایسی خاتون کو نکاح کا پیغام نہ دے، جس کو پہلے سے کسی دوسرے شخص نے نکاح کا پیغام دے رکھا ہو اور اس کی طرف اس خاتون یا اس کے اولیاء کا رجحان معلوم ہو گیا ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

لَا يَبِيعُ الرَّجُلُ عَلَى بَيْعِ أَخِيهِ، وَلَا يَخْطُبُ عَلَى خِطْبَةِ أَخِيهِ، إِلَّا أَنْ يَأْذَنَ لَهُ. (صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب تحریم الخطبۃ علی خطبۃ أخیہ حتی یأذن أو یترک، حدیث نمبر: 1412)

کوئی شخص اپنے بھائی کی بیع پر بیع کرے اور نہ کوئی شخص اپنے بھائی کی اجازت کے

بغیر اپنے بھائی کے پیغام پر پیغام دے۔

اگر کسی شخص نے دوسرے کے پیغام پر پیغام دیا اور نکاح کر لیا تو اس کا نکاح صحیح ہوگا تاہم ایسا کرنے والا گنہگار ہوگا۔

مرد کے لئے جائز ہے کہ وہ اس خاتون کو خود دیکھ لے جس سے وہ رشتہ چاہ رہا ہے:

قال النبی‘ للمغيرة بن شعبة رضی الله عنه حين أراد أن يخطب امرأة: انظر إليها فإنه أحرى أنْ يؤدَمَ بينكما. (سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۱۰۸۷)

عورت کا ایسے مرد کو پیغام دینا جائز ہے جس سے اس کا فی الحال نکاح کرنا درست ہو، عورت کے لئے بھی جائز ہے کہ وہ پیغام دینے والے مرد کو دیکھ لے، ان دونوں کا نکاح سے پہلے تنہائی میں یکجا ہونا حرام ہے۔

منگنی

منگنی نکاح کا وعدہ ہے، فریقین کی باہم رضامندی سے طے پاتا ہے، اگر یہ نہ بھی ہو تو کوئی حرج نہیں، آج کل منگنی ایک باقاعدہ رسم کی شکل اختیار کر چکی ہے اور اسے شادی کا ایک لازمی جزو سمجھا جانے لگا ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ اس رسم کی ادائیگی میں بھی کم و بیش اتنے ہی اخراجات ہونے لگے ہیں جتنے نکاح یا ولیمہ کے موقع پر کیے جاتے ہیں۔

انتخاب زوجین کے بعد وعدۂ نکاح تک منگنی کا عمل درست ہے، کیونکہ اس دوران فریقین کو ایک دوسرے کا مزاج سمجھنے کا موقع بھی مل جاتا ہے لیکن اسے نہایت سادگی سے ادا کیا جانا چاہیے اور اس رسم کی آڑ میں بے جا فضول خرچی جائز نہیں۔ یہ محض نمود و نمائش، وقت اور پیسے کا ضیاع ہے۔

منگنی یا رشتہ کا طے ہو جانا شرعاً ”نکاح کا وعدہ ہے“، جس میں قانونی لزوم نہیں ہے، اگر رشتہ طے ہو جانے کے بعد طرفین میں سے کوئی انکار کرے تو اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے۔

منگنی کے طور پر انگوٹھی پہنا دینا، کچھ نقد دینا، یا کپڑے پہنانا، یا کوئی اور تحفہ دینا نکاح کے

لئے رضامندی کی علامت ہے،لیکن اس طرح کے عمل کی وجہ سے نکاح پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

رشتہ طے ہوجانے کے بعد اگر لڑکے یا لڑکی کا نکاح کسی دوسرے سے ہوگیا تو وہ نکاح صحیح ہوگا،اوراس نکاح کے فسخ کا مطالبہ درست نہیں ہوگا۔

اگر نکاح سے پہلے مہر یا اس کا کچھ حصہ نقد یا سامان کی صورت میں ادا کردیا گیا، پھر کسی وجہ سے نکاح نہ ہوسکا تو اس نقد یا سامان کے واپس لینے کا حق لڑکے کو ہوگا،اور اگر وہ نقد یا سامان باقی نہ ہوتو اس کا بدل لینا جائز ہے،منگنی میں دئے گئے تحائف اگر موجود ہوں اور رشتہ ٹوٹ جائے تو ان تحائف کو واپس لینا جائز ہے۔

بچپن میں کی گئی منگنی کو اولاد بالغ ہونے کے بعد توڑ سکتی ہے،ضروری ہے کہ والدین بچپن میں بچوں کی منگنی کرنے سے گریز کریں، کیونکہ بچوں کی منگنی کردینے کے نتائج بسا اوقات الا ماشاءاللہ ناچاکی کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔

اگر بچوں کی رائے غلط ہے تو دلیل اور محبت سے ان کو اپنے حسنِ انتخاب کا قائل کریں اوران پر زبردستی کا فیصلہ مسلط نہ کریں۔ والدین اپنے بچوں کو اُس حق سے کیوں محروم کرتے ہیں، جو اسلام نے انہیں عطا کیا ہے؟ اگر اس بات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اوراس پر ہر ممکن عمل کیا جائے تو ناکام شادیوں کا بڑی حد تک ازالہ کیا جاسکتا ہے۔

ارکان نکاح

نکاح حرام کو حلال کرتا ہے؛اس لیے اس کے ارکان اور شرائط کو بوقت نکاح ملحوظ رکھنا نہایت ہی ضروری ہے، ورنہ بعض دفعہ نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا ہے اور طویل عرصہ تک لڑکا لڑکی دونوں حرام کاری کرتے رہتے ہیں۔

ایجاب وقبول کی تعریف

نکاح کے طرفین میں سے جس کسی کی طرف سے بھی پہلے اصالتا، ولایتا یا وکالتا نکاح کی پیشکش جن الفاظ میں کی جائے ان الفاظ کو ''ایجاب'' اور دوسری جانب سے جن

الفاظ میں اس پیشکش کو قبول کیا جائے ان الفاظ کو ''قبول'' کہا جاتا ہے۔

ایجاب وقبول کے لئے ضروری ہے کہ زبان سے ایسے الفاظ کہے جائیں جن سے فی الفور طرفین کے مابین رشتہ نکاح قائم ہوجانا معلوم ہوتا ہو، چاہے وہ الفاظ اس مفہوم پر حقیقتا دلالت کریں، یا مجازیا عرفاً، چاہے زبان عربی ہو یا غیر عربی، جیسے نکاح، زواج، بیاہ وغیرہ یا کوئی بھی ایسا لفظ جو بلاتحدید مدت ازدواجی رشتہ کو ظاہر کرتا ہو۔

نکاح صحیح ہونے کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ ایجاب وقبول میں کوئی ایسا لفظ ذکر نہ کیا جائے، جس سے نکاح کا کسی معین مدت کے لئے ہونا معلوم ہو۔

نکاح کی دو قسمیں ہیں: نکاح صحیح اور نکاح غیر صحیح۔

نکاح صحیح وہ ہے جس میں نکاح کے ارکان اور شرطیں پائی جائیں۔

نکاح صحیح ہونے کی شرطیں

شرائط نکاح میں سے بعض وہ ہیں جو ایجاب وقبول کے بیچ ہونے کے لئے ضروری ہیں، بعض وہ شرائط ہیں جن کا تعلق ایجاب وقبول کے الفاظ ادا کرنے والوں سے ہے اور بعض وہ ہیں جن کا تعلق عورت سے ہے۔

ایجاب وقبول سے متعلق شرائط حسب ذیل ہیں:

پہلی شرط:

ایجاب وقبول کی شرطوں میں سے ایک یہ ہے کہ ایجاب وقبول کی مجلس ایک ہو، مثلاً ایجاب جس مجلس میں ہوا اسی مجلس میں قبول ہوجائے ورنہ نکاح منعقد نہیں ہوگا، اگر ایجاب وقبول کی جگہ بدل جائے یا کوئی ایک مجلس سے اٹھ جائے پھر قبول کرے تو نکاح منعقد نہیں ہوگا۔(بدائع الصنائع:۲/۲۳۲، ہندیہ:۱/۲۶۹)

دوسری شرط:

(الف) ایجاب وقبول کا تلفظ کیا گیا ہو،یعنی اگر ایجاب وقبول کرنے والا بولنے پر قادر

ہے اور دونوں مجلس میں موجود ہیں تو ایجاب وقبول کی منظوری زبان سے دیناضروری ہے،مثلاً ایجاب یوں کرے''میں نے آپ سے اتنے مہر کے عوض نکاح کیا'' اورقبول یوں کرے''ہاں میں نے قبول کیا'' اگرایجاب وقبول کے الفاظ لکھ دیے جائیں، یاصرف سرکو ہلا دیاجائے یانکاح نامہ میں صرف دستخط کردیے جائیں توان صورتوں میں نکاح منعقد نہیں ہوگا۔

(ب) اگرنکاح کرنے والوں میں سے کوئی ایک مجلس میں موجود نہ ہو،مگراس کی طرف سے اس کاولی جس کواس نے نکاح کرانے کی اجازت دے رکھی ہو یاوکیل جس کو اس نے نکاح کرانے کاوکیل بنایاہو،موجود ہوتو وہ خوداس کی طرف سے ایجاب یاقبول کرے۔مثلا یوں ایجاب کرے''میں نے فلاں یافلانہ کانکاح آپ سے اتنے مہر کے عوض کیا'' اورقبول اس طرح کرے''ہاں میں نے فلاں یافلانہ کی طرف سے قبول کیا'' یاقاضی ولی اوروکیل کاترجمان بن کراس کی موجودگی میں ایجاب کرےتواس سے بھی نکاح منعقد ہوجائے گا۔

(ج) اگرکوئی ولی یاوکیل بھی موجود نہ ہوتواگرکسی ایک نے ایجاب کو لکھ کربھیجااوردوسرے نے جس مجلس میں اس کوایجاب کی تحریرپہونچی،اسی مجلس میں گواہوں کی موجودگی میں ایجاب کو پڑھ کریاکسی سے پڑھواکرزبان سے قبول کیاتو نکاح منعقد ہو جائے گا۔(ہندیہ:۱/ ۲۶۹-۲۷۰)

(د) ضروری ہے کہ ایجاب وقبول میں ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جن سے فوری طورپرنکاح کاانعقادمعلوم ہو،اگرایجاب یاقبول کوآئندہ زمانہ کی طرف منسوب کیا جائے یاکسی ایسے واقعہ پرمعلق کردیاجائے،جس کے مستقبل میں پیش آنے کاامکان ہےتو نکاح منعقد نہیں ہوگا۔

تیسری شرط

یہ ہے کہ ایجاب وقبول کے صیغے ماضی یاحال کے ہوں،مثلاً میں نے آپ سے نکاح کیایانکاح کرتاہوں کہے،اسی طرح میں نے قبول کیایامیں قبول کرتاہوں،یامجھے قبول

ہے وغیرہ الفاظ کہے،پس اگرمستقبل کے صیغے استعمال کیے جائیں،مثلاً یوں کہاکہ نکاح کروں گا، قبول کروں گایاٹھیک ہے کرلوں گاوغیرہ،تو نکاح منعقد نہیں ہوگا۔(الفقہ الاسلامی وادلتہ:۹/ ۳۵)

چوتھی شرط:

چوتھی شرط یہ ہے کہ ایجاب وقبول کم ازکم دوایسے مسلمان عاقل وبالغ مردیاایک مرد اوردوعورتوں کی موجودگی میں ہو،جوفریقین کے ایجاب وقبول کے الفاظ کوسن سکیں؛لہٰذا اگردوگواہ نہیں ہیں یاگواہ توہیں؛مگرمسلمان نہیں ہیں،یاصرف عورتیں ہیں،یاگواہ بالغ نہیں ہیں،یاعاقل نہیں ہیں تو نکاح منعقد نہیں ہوگا۔

دولہا، دلہن کے ماں باپ اوران کی اولاد بھی نکاح کے گواہ ہو سکتے ہیں لیکن دوسروں کوگواہ بنانا بہتر ہے۔

جدیدٹکنالوجی کے ذریعہ نکاح

ٹیلیفون،موبائل،وہاٹس ایپ،فیس بک،چیٹنگ کے ذریعہ ہویاآڈیوکانفرنس ہو یا ویڈیوکانفرس ہونکاح کسی بھی صورت میں منعقد نہیں ہوگا؛ کیوں کہ دونوں کی مجلس ایک نہیں ہے؛البتہ اگران ذرائع کواستعمال کرتے ہوئے کسی کووکیل بنادیاجائے اوروہ وکیل اپنے مؤکل کی طرف سے گواہوں کی موجودگی میں ایجاب یاقبول کرے تو پھرنکاح منعقد ہوجائے گا۔

کورٹ میرتج

کورٹ میں نکاح کرنے کی صورت میں اگرایجاب وقبول کی ساری شرطیں موجود ہوں تو نکاح منعقد ہوگا، ورنہ نکاح نہیں ہوگا۔مثلاً اگرمتعلقہ افسر کے سامنے صرف کاغذپر دستخط کردیا،زبان سے ایجاب وقبول نہیں کیا۔یادونوں گواہ مسلمان نہیں تھے یاصرف عورتیں گواہ تھیں،تو نکاح منعقد نہیں ہوگا۔

سنن ومستحبات عقد نکاح

ایجاب وقبول سے پہلے خطبہ دینا مسنون ہے۔جس میں سورہ نساء کی پہلی آیت، سورہ آل عمران کی آیت نمبر۱۰۲،سورہ احزاب کی آیت نمبر۷۰،۷۱،اور سورہ حجرات کی آیت نمبر۱۳۔اسی طرح نکاح سے متعلق احادیث مثلاً ''النکاح من سنتی'' وغیرہ کا پڑھنا بہتر ہے۔

مجلسِ نکاح میں تقریر کرنا

مجلس نکاح میں اردو یا مادری زبان میں تقریر کرنا،جس میں نکاح کی فضیلت، مسائل واحکام، اور میاں بیوی کے فرائض وحقوق کو بیان کرنا اور انھیں شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین کرنا مناسب ہے۔نیز طلاق وخلع کے نقصانات کو واضح کرنا اور اس کے مسنون طریقہ کو بھی بیان کر دینا مناسب ہے۔

میاں بیوی کو مبارکباد دینا

نکاح کے بعد میاں بیوی کو دعا اور مبارک باد دینا سنت ہے، مبارکبادی کے الفاظ حدیث میں اس طرح منقول ہیں: بَارَکَ اللہُ لَکُمَا وَجَمَعَکُمَا فِی خَیْرٍ۔ترجمہ: اللہ تعالیٰ اس نکاح میں برکت دے اور تم دونوں میاں بیوی کو خیر میں جمع کر دے۔(بخاری:۶۳۸۶)

نکاح کا اعلان کرنا

حدیث میں ہے: أَعْلِنُوا هٰذَا النِّكَاحَ، وَاجْعَلُوهُ فِي الْمَسَاجِدِ، وَاضْرِبُوا عَلَيْهِ بِالدُّفُوفِ۔(ترمذی:۱۰۸۹)،یعنی کھلے عام نکاح کرو،اس کو مسجد میں قائم کرو اور دف بجاؤ؛ تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ فلاں اور فلانہ کے درمیان نکاح ہوا ہے۔

نکاح کا وقت

نکاح کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے؛البتہ شوال کے مہینے میں اور جمعہ کے دن نکاح کرنا مستحب ہے؛ کیوں کہ نبی کریم ﷺ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ماہ شوال میں

اور جمعہ کے دن نکاح کرنا منقول ہے۔(الدر المختار علی رد المحتار:۳/۸)

نکاح میں بلا وجہ تاخیر ممنوع ہے

نکاح ایک حکمِ شرعی ہے جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب سنت ہے، ایک تو اس کے سنت ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر عمل کرنے میں بلا وجہ تاخیر نہ کی جائے۔دوم یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ: اے علی! تین چیزوں میں تاخیر نہ کرنا: ایک تو نماز میں تاخیر نہ کرنا جب اس کا وقت ہو جائے، دوم: نمازِ جنازہ میں تاخیر نہ کرنا جب وہ تیار ہو جائے، سوم: غیر شادی شدہ لڑکی کے نکاح میں تاخیر نہ کرنا جب اس کے ہم پلہ کوئی مناسب رشتہ مل جائے، مستدرک حاکم (رقم الحدیث:۲۷۴) میں ہے:

"عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ: ثَلَاثٌ يَا عَلِيُّ! لَا تُؤَخِّرْهُنَّ: الصَّلَاةُ إِذَا آنَتْ، وَالْجَنَازَةُ إِذَا حَضَرَتْ، وَالْأَيِّمُ إِذَا وَجَدْتَ كُفُؤًا۔"

اس لیے جب نکاح تیار ہو تو پھر نحوست کے اس بے بنیاد نظریئے کو مدنظر رکھتے ہوئے ان مہینوں کی وجہ سے اس میں تاخیر کرنا نہایت ہی ناپسندیدہ عمل ہے، جس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

شادی سال بھر میں کسی بھی روز ممنوع، منحوس یا معیوب نہیں ہے، شرعی اعتبار سے شادی سال بھر میں کسی بھی روز منع نہیں، بلکہ جب بھی کرنی ہو اس کے لیے سال کے تمام ایام میں سے کسی بھی دن کا انتخاب کیا جا سکتا ہے، اس لیے جو لوگ محرم، صفر، شوال یا کسی بھی مہینے میں نکاح غلط اور منحوس سمجھتے ہیں، ان کی یہ سوچ بے بنیاد ہے، کیونکہ قرآن وسنت سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں، ایسا نظریہ رکھنا دین کے سراسر خلاف ہے۔

ولیمہ کرنا

نکاح کے فوراً بعد چھوارے یا کوئی میٹھی چیز تقسیم کرنا مستحب ہے، اسی طرح نکاح کی

خوشی میں ولیمہ کرنا بھی لڑکے کے لیے مستحب ہے۔اسے چاہیے کہ اپنے اعزہ واقربہ کو اپنی وسعت کے مطابق کھانا کھلائے؛ بشرطیکہ کوئی نام ونمود اور فضول خرچی نہ ہو۔کھانا کھلانے کے تعلق سے لڑکی یا اس کے گھر والوں پر کوئی چیز واجب یا مستحب نہیں ہے۔ولیمہ کرنے کے نام پر لڑکے والے کا لڑکی والے سے کچھ مانگنا درست نہیں۔اگر وسعت نہ ہو تو ولیمہ ہی نہ کرے؛ مگر دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے۔

غیر اسلامی نکاح

ہر دور اور ہر قوم میں نکاح رائج ہے، لیکن سب کی رسم ورواج، قانون، ضابطے اور طور وطریقے الگ الگ ہیں۔

دورِ جاہلیت میں بھی نکاح کے مختلف ضابطے مروج تھے، لیکن اِسلام نے جہاں زندگی کے ہر میدان سے متعلق رہنمائی فراہم کی ہے، وہیں نکاح کے بابت بھی بالتفصیل ہدایات فراہم کی ہیں، جن پر چل کر اِنسانی زندگی کو بہت سہل بنایا جاسکتا ہے، خاندان اور معاشرے کو مثالی بنایا جاسکتا ہے۔ اِسلام نے قبیح اور اِستحصالی رسومات کا خاتمہ کیا اور اِنسانی زندگی کو سہل بنانے والے محاسن کا اِضافہ کرتے ہوئے خالص اِسلامی معاشرے کی داغ بیل ڈالی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اکثر لوگوں میں اس پر بھی مختلف فرسودہ تصورات اور رسومات کی دبیز تہہ جمتی گئی۔قرآن وسنت کے اَحکام کے برعکس نکاح جیسے پاکیزہ عمل کو انتہائی مشکل اور کٹھن بنا دیا گیا۔

غیر اسلامی نکاح بعض تو وہ ہیں جو بالکل ناجائز ہیں، جیسے زمانہ جاہلیت میں مختلف قسم کے نکاح ہوتے تھے اور مرد اور عورت کے درمیان ناجائز تعلقات ہوتے تھے ان کی مثالیں اس زمانے میں بھی مل سکتی ہیں یا ملتی ہیں۔

غیر اسلامی نکاح وہ بھی ہیں جو ہو تو ارکان وشرائط کے ساتھ مگر اس میں غلط رسم و رواج اور غلط باتیں شامل کر لی گئی ہیں، ایسی صورت میں یہ نکاح تو صحیح ہے لیکن یہ رسم و

رواج قابل اصلاح ہیں۔

لڑکی والوں کی طرف سے رخصتی کی دعوت کا حکم

نکاح کے موقع پر لڑکی والوں کی طرف سے کھانے کا انتظام کرنا ولیمہ کی طرح سنت نہیں ہے، ہاں اگر کوئی نمود ونمائش سے بچتے ہوئے، کسی قسم کے زبردستی اور خاندانی دباؤ کے بغیر اپنی خوشی ورضا سے اپنے اعزاء اور مہمانوں کو کھانا کھلائے تو یہ مہمانوں کا اکرام ہے، اور اس طرح کی دعوت کا کھانا کھانا بارات والوں کے لیے جائز ہے، لیکن اگر لڑکی والے خوشی سے نہ کھلائیں تو زبردستی کر کے کھانا کھانا جائز نہیں ہوگا۔

صحیح بخاری میں ہے:"وقال أنس: إذا دخلت على مسلم لا يتهم، فكل من طعامه واشرب من شرابه"۔(۷/ ۸۲، كتاب الأطعمة، باب الرجل يدعى إلى طعام، ط:دارطوق النجاة)

صحیح مسلم میں ہے:عن جابر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:"إذا دعي أحدكم إلى طعام، فليجب، فإن شاء طعم، وإن شاء ترك" (صحیح مسلم۲/۱۰۵۴، کتاب الحج، باب زواج زینب بنت جحش، حدیث نمبر:۱۴۳۰)

محرمات کا بیان

کن رشتہ داروں سے نکاح حلال ہے اور کن سے نکاح حرام ہے؟ اسلام میں اس سلسلہ میں تفصیلی ہدایت دی گئی ہے، اور قرآن مجید کا پورا ایک رکوع اسی مسئلہ سے متعلق ہے۔(النساء:۲۳)

اسلام نے بہت قریبی خونی رشتہ داروں کے علاوہ لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان رشتہ نکاح کو جائز قرار دیا ہے، جیسے: چچازاد، خالہ زاد، ماموں زاد وغیرہ، اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ رشتے تلاش کرنا آسان ہوتا ہے، دونوں پہلے سے ایک دوسرے کی شکل وصورت اور اخلاق وعادات سے واقف ہوتے ہیں؛ اس لئے بعد میں اختلاف اور جھگڑے کی

نوبت نہیں آتی، دوسرے: خاندان میں کچھ ایسے بزرگ ہوتے ہیں، جو دونوں کے نزدیک قابل احترام سمجھے جاتے ہیں، جب کبھی میاں بیوی میں اختلاف پیدا ہوتا ہے تو یہ بزرگ شخصیتیں مسئلہ کو سلجھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور زندگی کی گاڑی پٹری سے ہٹ کر پھر اپنی پٹری پر واپس آجاتی ہے۔

جس عورت سے نکاح ہو رہا ہے وہ اس مرد پر نہ دائمی طور پر حرام ہو نہ عارضی طور پر۔

کسی عورت سے نکاح حرام ہونے کی دو صورتیں ہیں: (الف) ہمیشہ کے لئے حرام ہوتا، جسے حرمت موبدہ کہتے ہیں،

(ب) عارضی حرمت جو خاص حالات یا خاص وقت تک محدود ہوتی ہے، اسے حرمت موقتہ کہتے ہیں۔

حرمت مؤبدہ (دائمی حرمت) کے تین اسباب ہیں: ۱-نسب، ۲-مصاہرت، ۳-رضاعت

حرمت بسبب نسب

نسب کی وجہ سے مندرجہ ذیل عورتوں سے نکاح حرام ہے:

(الف) ماں، نانی، دادی (اوپر تک)۔

(ب) بیٹی، پوتی، نواسی (نیچے تک)۔

(ج) بہن، حقیقی ہو یا علاتی یا اخیافی (باپ شریک یا ماں شریک)۔

(د) پھوپھی اور خالہ، چاہے حقیقی ہو یا علاتی یا اخیافی (باپ شریک یا ماں شریک)

(ہ) بھتیجی حقیقی بھائی کی لڑکی ہو یا علاتی یا اخیافی بھائی کی اور اس کی اولاد (نیچے تک)۔

(و) بھانجی حقیقی ہو یا علاتی یا اخیافی، اور اس کی اولاد (نیچے تک)۔

حرمت بسبب مصاہرت

مصاہرت سے مراد وہ رشتے ہیں جو نکاح کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

مصاہرت کی وجہ سے مندرجہ ذیل عورتوں سے نکاح حرام ہے:

(الف) اپنی منکوحہ کی ماں، نانی، دادی اور تمام ہی اصول۔

(ب) اپنے بیٹے، پوتے نواسے اور تمام ہی فروع کی منکوحہ عورتیں، خواہ پہلے نکاح میں رہ چکی ہوں یا فی الحال نکاح میں ہوں۔

(ج) اپنے باپ، دادا، نانا اور تمام ہی اصول کی منکوحہ عورتیں۔

(د) اپنی ان منکوحہ عورتوں کی اولاد اور اولاد کی اولاد (نیچے تک) جن سے صحبت کر چکا ہو۔

جن صورتوں میں نکاح صحیح سے حرمت مصاہرت پیدا ہو جاتی ہے، ان صورتوں میں محض نکاح فاسد سے حرمت پیدا نہیں ہوگی، البتہ اگر نکاح فاسد کے بعد وطی بھی ہوگئی ہو یا دواعی وطی کا ارتکاب کیا گیا ہو تو حرمت مصاہرت پیدا ہو جائے گی۔

حرمت بسبب رضاعت

ڈھائی سال کی عمر کے اندر لڑکے یا لڑکی نے کسی عورت کا دودھ پی لیا، تو حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی۔

جن صورتوں میں نسبی تعلق کی بنیاد پر نکاح حرام ہوتا ہے، ان سب ہی صورتوں میں رشتہ رضاعت کی وجہ سے بھی نکاح حرام ہوگا۔

دودھ پلانے والی، دودھ پینے والے کی رضاعی ماں ہوگی، اور اس کا شوہر جس کی وجہ سے دودھ اترا ہے دودھ پینے والے کا رضاعی باپ ہوگا۔ دودھ پلانے والی کے اصول و فروع اور اس کے شوہر کے اصول وفروع خواہ دودھ پلانے والی کے بطن سے ہوں یا دوسری بیوی کے بطن سے، دودھ پینے والے پر اور اس کے فروع پر حرام ہوں گے۔

دودھ پلانے والی عورت پر دودھ پینے والی لڑکی کا شوہر نیز ان کے فروع حرام ہوں گے۔

دودھ پلانے والی عورت کے اصول وفروع پر، اسی طرح اس کے شوہر اور شوہر کے

اصول وفروع پر، دودھ پینے والے لڑکے کی بیوی نیز ان کے فروع حرام ہوں گے۔

رضاعت سے حرمت پیدا ہونے کی شرطیں مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) دودھ پلانے والی عورت کی عمر کم سے کم نو سال ہو، اس سے پہلے اگر کسی لڑکی کو دودھ اتر آئے تو وہ دودھ شمار نہیں ہوگا۔

(ب) دودھ اپنی اصلی حالت میں پلایا جائے، اگر دودھ کو جما دیا جائے، یا کسی کھانے کی چیز کے ساتھ ملا کر پکا دیا جائے تو اس سے حرمت ثابت نہیں ہوگی۔

(ج) عورت کا دودھ اگر جانور کے دودھ کے ساتھ ملا کر پلایا جائے، یا کسی دوا یا پانی میں ملا کر پلایا جائے تو دیکھا جائے گا کہ دودھ غالب ہے یا ملائی ہوئی چیز، یا دونوں برابر ہیں، اگر دودھ غالب ہو یا برابر ہو تو حرمت ثابت ہوگی، ورنہ نہیں۔

(د) دودھ براہ راست پستان سے پلایا جائے یا دودھ نکال کر حلق میں یا ناک میں ٹپکایا جائے تو حرمت ثابت ہوگی، اگر کسی اور ذریعہ سے دودھ جسم میں یا معدہ میں داخل کیا جائے تو حرمت ثابت نہیں ہوگی۔

(ہ) اگر دو عورتوں کے دودھ ملا کر پلا دیئے گئے تو دونوں عورتوں سے حرمت ثابت ہوگی۔

(و) یہ بھی ضروری ہے کہ دودھ بچے کے معدہ میں پہنچ جائے، اگر محض پستان منہ میں لیا اور دودھ چوسا نہیں، یا چوسا لیکن اگل دیا تو حرمت ثابت نہیں ہوگی۔

دو عادل مردوں یا ایک عادل مرد اور دو عادل عورتوں کی شہادت ثبوت رضاعت کے لئے ضروری ہے۔

مرد کا اقرار، نکاح سے پہلے اور نکاح کے بعد اور عورت کا اقرار نکاح سے پہلے؛ ثبوت رضاعت کے لئے کافی ہوگا، اور اگر عورت نکاح کے بعد اقرار کرے تو یہ اقرار اس کا دعوی شمار کیا جائے گا، جو گواہوں کے بغیر ثابت نہ ہو سکے گا۔

نکاح صحیح کی قسمیں

نکاح صحیح کبھی موقوف ہوتا ہے اور کبھی نافذ

نکاح صحیح کبھی لازم ہوتا ہے اور کبھی غیر لازم

جس نکاح صحیح میں حسب ذیل شرطیں پائی جائیں وہ نکاح صحیح نافذ کہلائے گا، ورنہ اسے نکاح موقوف کہیں گے:

(الف) اگر مرد و عورت خود ایجاب وقبول کریں، یا ایجاب وقبول کے لئے کسی کو اپنا وکیل بنائیں تو ضروری ہے کہ وہ دونوں اور وکیل سب عاقل و بالغ ہوں، اگر کسی باشعور نابالغ لڑکے یا لڑکی نے اپنا ایجاب یا قبول خود کیا تو نکاح ولی کی اجازت پر موقوف ہوگا اور اگر مجنون نے کیا تو نکاح منعقد نہیں ہوگا۔

(ب) نابالغ یا مجنون لڑکا لڑکی کا نکاح ولی ابعد نے کر دیا تو یہ نکاح ولی اقرب کی اجازت پر موقوف رہے گا۔

(ج) نکاح میں اگر وکیل نے اپنے موکل کے دئے ہوئے اختیارات سے تجاوز کیا تو وہ نکاح موکل کی اجازت پر موقوف رہے گا۔

نکاح لازم اور غیر لازم

نکاح لازم وہ نکاح کہلائے گا جس میں زوجین میں سے کسی کو یا ان کے اولیاء کو نکاح کے فسخ کا اختیار نہ ہو اور اگر فسخ کا اختیار ہو تو غیر لازم ہے۔

مندرجہ ذیل شرطوں کے ساتھ نکاح صحیح لازم ہو جاتا ہے:

(الف) نابالغ لڑکا یا لڑکی کا نکاح باپ دادا نے، یا مجنون مجنونہ کا نکاح باپ دادا یا بیٹے نے کیا ہو۔

(ب) بالغہ عاقلہ نے اپنا نکاح ولی عصبہ کی اجازت کے بغیر کفو میں مہر مثل پر کیا تو نکاح لازم ہوگا۔

(ج) اگر کفائت کے بارے میں دھوکہ نہ دیا گیا ہو تو نکاح لازم ہوگا۔

ان تمام صورتوں میں جن میں نکاح باقی رکھنے نہ رکھنے کا اختیار دیا گیا ہے محض صاحب حق کے نامنظور کر دینے سے نکاح ختم نہیں ہو جائے گا، بلکہ اس کے لئے قاضی کا فیصلہ ضروری ہوگا۔

نکاح غیر صحیح (یعنی باطل اور فاسد اور انکے احکام)

نکاح غیر صحیح وہ نکاح ہے، جس میں ارکان و شرائط نکاح میں سے کوئی رکن یا کوئی شرط مفقود ہو۔

نکاح غیر صحیح کی دو قسمیں ہیں: (۱) نکاح باطل، (۲) نکاح فاسد۔

نکاح باطل وہ نکاح ہے جو شرعاً منعقد ہی نہیں ہوتا

نکاح فاسد وہ نکاح ہے جو نہ صحیح ہو اور نہ باطل، قبل دخول اس کا وہی حکم ہے جو نکاح باطل کا ہے، اور بعد دخول اس پر آثار و احکام نکاح مرتب ہوتے ہیں، ہر دو صورت میں بذریعہ متارکت یا بذریعہ حکم قاضی تفریق ضروری ہے۔

مندرجہ ذیل نکاح باطل ہیں:

(الف) وہ نکاح جس کے ایجاب و قبول میں کوئی ایسی خامی ہو جس کی وجہ سے ایجاب و قبول اپنے شرائط کے مطابق صحیح نہ ہو۔

(ب) ایجاب و قبول کے الفاظ ادا کرنے والوں میں ضروری اہمیت موجود نہ ہو۔

(ج) ایسی خاتون سے نکاح جو قرابت، رضاعت، یا مصاہرت کی وجہ سے نکاح کرنے والے پر حرام ہے، یا وہ عورت دوسرے شخص کی بیوی ہے، یا دوسرے کی عدت میں ہے یا خود نکاح کرنے والے کی مطلقہ ثلاثہ ہے اور حلالہ نہیں ہوا ہے، یا ایسی عورت سے نکاح کرنا جس سے موجودہ بیوی کے رہتے ہوئے نکاح کرنا حرام ہے، یا ایسی عورت سے نکاح کرنا جو نہ مسلمان ہے نہ کتابیہ۔

(د) مرد و عورت میں سے کوئی ایک مرتد ہو، یا مرد غیر مسلم ہو اور عورت مسلمان ہو۔

نکاح باطل کے علاوہ تمام وہ نکاح جو غیر صحیح ہوں، فاسد قرار پائیں گے۔

نکاح فاسد پر وطی سے پہلے احکام نکاح میں سے کوئی حکم مرتب نہیں ہوتا۔

نکاح فاسد میں وطی کے بعد مندرجہ ذیل احکام مرتب ہوں گے:

(۱) مہر مثل اور مقررہ مہر میں جو کم ہو وہ واجب ہوگا اور اگر بوقت نکاح کوئی مہر مقرر نہیں ہوا تھا تو مہر مثل واجب ہوگا۔

(۲) اولاد کا نسب بعض شرائط کے ساتھ ثابت ہوگا۔

(۳) تفریق یا متارکت کے بعد عدت واجب ہوگی (نفقہ نہیں)۔

نکاح صحیح کی قسمیں

نکاح صحیح کبھی موقوف ہوتا ہے اور کبھی نافذ۔

نکاح صحیح کبھی لازم ہوتا ہے اور کبھی غیر لازم۔

جس نکاح صحیح میں حسب ذیل شرطیں پائی جائیں وہ نکاح صحیح نافذ کہلائے گا، ورنہ اسے نکاح موقوف کہیں گے:

(الف) اگر مرد و عورت خود ایجاب و قبول کریں، یا ایجاب و قبول کے لئے کسی کو اپنا وکیل بنائیں تو ضروری ہے کہ وہ دونوں اور وکیل سب عاقل و بالغ ہوں، اگر کسی باشعور نابالغ لڑکے یا لڑکی نے اپنا ایجاب یا قبول خود کیا تو نکاح ولی کی اجازت پر موقوف ہوگا اور اگر مجنون نے کیا تو نکاح منعقد نہیں ہوگا۔

(ب) نابالغ یا مجنون لڑکا لڑکی کا نکاح ولی ابعد نے کر دیا تو یہ نکاح ولی اقرب کی اجازت پر موقوف رہے گا۔

(ج) نکاح میں اگر وکیل نے اپنے موکل کے دئے ہوئے اختیارات سے تجاوز کیا تو وہ نکاح موکل کی اجازت پر موقوف رہے گا۔

نکاح لازم اور غیر لازم

نکاح لازم وہ نکاح کہلائے گا جس میں زوجین میں سے کسی کو یا ان کے اولیاء کو نکاح کے فسخ کا اختیار نہ ہو، اور اگر فسخ کا اختیار ہو تو غیر لازم ہے۔

مندرجہ ذیل شرطوں کے ساتھ نکاح صحیح لازم ہو جاتا ہے:

(الف) نابالغ لڑکا یا لڑکی کا نکاح باپ دادا نے، یا مجنون مجنونہ کا نکاح باپ دادا یا بیٹے نے کیا ہو۔

(ب) بالغہ عاقلہ نے اپنا نکاح ولی عصبہ کی اجازت کے بغیر کفو میں مہر مثل پر کیا تو نکاح لازم ہوگا۔

(ج) اگر کفائت کے بارے میں دھوکہ نہ دیا گیا ہو تو نکاح لازم ہوگا۔

ان تمام صورتوں میں جن میں نکاح باقی رکھنے نہ رکھنے کا اختیار دیا گیا ہے محض صاحب حق کے نامنظور کر دینے سے نکاح ختم نہیں ہو جائے گا، بلکہ اس کے لئے قاضی کا فیصلہ ضروری ہوگا۔

غیر مسلموں کا نکاح

حالت کفر میں مرد و عورت کا کیا ہوا ایسا نکاح جس میں شرع اسلامی کے مطابق صحت نکاح کے سارے ارکان و شرائط پائے جاتے ہوں، دونوں کے قبولیت اسلام کے بعد بھی باقی رہے گا۔

اور اگر غیر مسلموں کے مابین کوئی ایسا نکاح ہوا ہو جس میں صحت نکاح کی بعض وہ شرطیں نہیں پائی جاتی ہوں، جو شرع اسلامی کی رو سے ضروری ہیں تو اس کی دو صورتیں ہیں:

(الف) جو شرائط نہیں پائی جاتی ہیں ان کا تعلق انعقاد نکاح سے ہے، جیسے گواہ کا ہونا۔

(ب) یا وہ شرائط جو اس نکاح میں مفقود ہیں وہ ایسی ہیں جو انعقاد نکاح اور بقاء نکاح دونوں کے لئے ضروری ہیں، مثلاً زوجین کے درمیان محرمیت کا رشتہ نہ ہونا کہ یہ جس

طرح انعقاد نکاح کے لئے ضروری ہے اسی طرح بقاء نکاح کے لئے بھی ضروری ہے۔

پہلی صورت میں زوجین بیک وقت اسلام لے آئیں اور وہ نکاح ان کے مذہب کی رو سے درست تھا تو اس نکاح پر ان کو قائم رکھا جائے گا اور نکاح جدید کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

اور اگر دوسری صورت ہو یعنی اس نکاح میں وہ شرطیں نہ پائی جائیں جو نکاح کے بقاء و استمرار کے لئے ضروری ہیں تو اس صورت میں اگر دونوں میاں بیوی ایک ساتھ اسلام لے آئیں، یا کوئی ایک اسلام لے آیا تو نکاح باقی نہیں رہے گا۔ مثلاً کسی نے حالت کفر میں اپنی بھانجی سے نکاح کر لیا، اب وہ مسلمان ہو جائے یا دونوں مسلمان ہو جائیں، تو یہ نکاح باقی نہیں رہے گا، علیحدگی لازم ہوگی۔

اگر پہلی صورت میں غیر مسلم زوجین میں سے صرف بیوی اسلام لے آئے تو اگر ممکن ہو تو شوہر پر تین بار اسلام پیش کیا جائے گا، اگر شوہر نے بھی اسلام قبول کر لیا تو وہ نکاح قائم رہے گا، اور اگر اس کے بعد بھی شوہر اسلام قبول کرنے سے انکار کر دے یا خاموش رہے (اور) اگر ممکن ہو تو قاضی ان دونوں کے درمیان تفریق کر دے، لہذا عدت گزار کر عورت کسی مسلمان سے نکاح کر سکتی ہے، اور اگر اسلام پیش کرنا یا قاضی کے ذریعہ تفریق کرانا ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں عورت کا تین حیض، یا اگر اسے حیض نہ آتا ہو تو تین ماہ گزر جانے پر، یا حاملہ ہو تو وضع حمل کے بعد، نکاح ختم ہو جائے گا، اور پھر عدت کے بعد اس کے لئے نکاح کرنا جائز ہو جائے گا۔

پہلی صورت میں اگر صرف شوہر اسلام لے آئے اور بیوی کتابیہ ہو تو نکاح باقی رہے گا، اور اگر بیوی غیر کتابیہ ہو اور اسلام پیش کرنا ممکن ہو تو اس پر تین بار اسلام پیش کیا جائے گا، اگر وہ اسلام قبول کرے یا دین کتابی میں داخل ہو جائے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے گی، اور اگر اسلام پیش کرنا یا تفریق کرنا ممکن نہ ہو تو تین حیض یا تین ماہ یا حاملہ ہو تو ولادت کے بعد نکاح خود بخود ختم ہو جائے گا۔

اگر کوئی مسلمان عورت مرتد ہو جائے (عیاذاً باللہ) تو اس کے ارتداد کی وجہ سے

نکاح ختم نہیں ہوگا۔

اگر کسی مسلمان عورت کا شوہر مرتد ہوجائے (عیاذاً باللہ) تو نکاح فوراً ختم ہوجائے گا۔

ولایت نکاح

ولایت عمومی وہ شرعی اختیار ہے، جس کی وجہ سے کسی شخص کا تصرف دوسرے شخص پر اس کی اجازت کے بغیر نافذ ہوتا ہے۔

ولایت نکاح اس شرعی اختیار کا نام ہے، جس کی وجہ سے کوئی شخص نابالغ یا غیر عاقل لڑکے یا لڑکی کا نکاح ان کی اجازت کے بغیر اپنی مرضی سے کرسکتا ہے۔

کسی شخص کو دوسرے پر ولایت نکاح دو اسباب سے حاصل ہوتی ہے، اول قرابت، یعنی نسبی تعلق، دوم امامت، یعنی امیر، خلیفہ یا اس کا نائب، سلطان اور قاضی جنہیں بعض خاص حالات میں نکاح کردینے کا اختیار حاصل ہوجاتا ہے۔

ولی کے لئے شرط ہے کہ وہ مسلمان، عاقل اور بالغ ہو، خواہ مرد ہو یا عورت۔

نابالغ لڑکے یا لڑکی اور مجنون اور معتوہ پر ان کے اولیاء کو ولایت حاصل ہوتی ہے۔

ولایت کی ترتیب

(الف) ولایت بسبب قرابت:

رشتہ داروں میں سے اولاً ان لوگوں کو ولایت حاصل ہوگی جو عصبہ بنفسہ ہوں۔

عصبہ بنفسہ وہ مرد ہیں جن کے ساتھ اس لڑکے یا لڑکی کا رشتہ کسی عورت کے واسطے کے بغیر ہو، جیسے بیٹا، باپ، دادا۔

عصبات کو درج ذیل ترتیب کے مطابق ہی ولایت حاصل ہوگی:

(۱) بیٹا، پوتا اور ان کی اولاد نیچے تک۔

(۲) باپ، دادا، اوپر تک۔

(۳) حقیقی بھائی، علاتی بھائی اور ان کی اولاد نیچے تک۔

(۴) حقیقی چچا، باپ شریک (سوتیلا) چچا اور ان کی اولاد نیچے تک۔

اگر ایک قسم کے چند عصبات ہیں تو ان میں ولایت اس عصبہ کو حاصل ہوگی، جسے قرب قرابت حاصل ہو۔

اگر ایک ہی قسم اور ایک ہی طرح کی قرابت رکھنے والے چند عصبات ہوں تو ہر ایک کو برابر ولایت حاصل ہوگی، ان میں سے جو ولی بھی پہلے نکاح کردے گا وہ نکاح نافذ ہوگا اور دوسرے کا اختیار ختم ہوجائے گا۔

اگر عصبات میں سے کوئی ولی موجود نہ ہو تو دوسرے رشتہ داروں کو ترتیب ذیل کے مطابق ولایت حاصل ہوگی:

(۱) ماں، (۲) دادی، (۳) لڑکی (۴) پوتی، (۵) نواسی (۶) پوتے کی لڑکی نیچے تک، (۷) نواسی کی لڑکی نیچے تک، (۸) نانا، (۹) حقیقی بہن، (۱۰) علاتی بہن (باپ شریک)، (۱۱) اخیافی (ماں شریک) بھائی بہن، (۱۲) اخیافی بھائی بہن کی اولاد، (۱۳) ذوات الارحام بہ ترتیب ذیل:

(۱) پھوپھیاں، (۲) ماموں، (۳) خالہ، (۴) چچازاد بہن، (۵) بہ ترتیب بالا ان کی اولاد۔

(ب) ولایت بسبب امامت:

اگر مندرجہ بالا رشتہ داروں میں سے کوئی ولی موجود نہ ہو تو امیر وخلیفہ کو ولایت حاصل ہوگی، یا اس قاضی کو جسے ولایت نکاح تفویض کی گئی ہو اور پھر نائب قاضی کو جسے قاضی نے یہ اختیار سپرد کیا ہو۔

ولایت کی ترتیب کا مطلب یہ ہے کہ اگر ولی قریب نہ ہو تو ولی بعید کو ولایت منتقل ہو جائے گی اور اگر کسی ولی قریب کے رہتے ہوئے ولی بعید نے نکاح کردیا، تو ولی قریب کی اجازت پر موقوف رہے گا۔

باپ دادا کا کیا ہوا نکاح

باپ دادا کا اپنے نابالغ یا مجنون یا معتوہ لڑکے یا لڑکی یا پوتے پوتی کا کیا ہوا نکاح خواہ کفو میں ہو یا غیر کفو میں، مہر مثل پر ہو یا غیر مہر مثل پر، لازم ہو جاتا ہے، بشرطیکہ باپ دادا معروف بسوء الاختیار، فاسق متہتک یا ماجن نہ ہوں، لیکن اگر وہ معروف بسوء الاختیار، فاسق متہتک یا ماجن ہوں تو غیر کفو میں نکاح منعقد نہیں ہوگا، اسی طرح اگر ایسے باپ دادا نے لڑکی یا پوتی کا نکاح مہر مثل سے بہت کم پر، یا لڑکے یا پوتے کا نکاح مہر مثل سے بہت زیادہ پر، کر دیا تو نکاح منعقد نہیں ہوگا۔

اگر کسی معاملہ میں باپ دادا کی خود غرضی، لالچ اور اپنے ذاتی مفاد یا اپنی کم عقلی کی وجہ سے نہایت نامناسب لڑکے یا لڑکی کے ساتھ اپنے نابالغ، مجنون یا معتوہ لڑکے، لڑکی یا پوتے پوتی کا نکاح کر دینا واضح ہو تو ایسی صورت میں بھی نکاح منعقد نہیں ہوگا، اگرچہ پہلے سے ایسا کوئی تجربہ نہ ہو، مہر مثل سے بہت کم یا زیادہ پر نکاح کر دینے کا بھی یہی حکم ہے کہ ان حالات میں یہ نکاح منعقد ہی نہیں ہوگا۔

اگر باپ دادا نے نابالغ، مجنون، معتوہ لڑکے، لڑکی یا پوتے، پوتی کا نکاح نشہ کی حالت میں غیر کفو میں یا مہر مثل سے بہت کم یا زیادہ پر کر دیا تو نکاح منعقد نہیں ہوگا۔

ولی کا نکاح سے گریز

اگر ولی اپنے زیر ولایت لڑکے یا لڑکی کے نکاح سے بلا عذر معقول گریز کرے، حالانکہ ان کے لئے مناسب رشتہ موجود ہو، اور تاخیر سے مناسب رشتہ چھوٹ جانے کا ڈر ہو، اور فی الحال ان کا نکاح کر دینے میں ان کی مصلحت یقینی ہو، اور اس وقت ان کا نکاح نہ کرنے سے ان کے لئے ضرر کا اندیشہ غالب ہو، تو ایسی صورت میں قاضی کو اختیار ہوگا کہ اس لڑکے یا لڑکی کا نکاح کر دے خواہ وہ نابالغ ہو یا بالغ مجنون، البتہ جہاں قاضی نہ ہو وہاں ولی ابعد کو یہ اختیار ہوگا۔

نکاح کرنے کے طریقے

نکاح کرنے کے چار طریقے ہیں جو حسبِ ذیل ہیں:

اَصالۃً: یعنی نکاح کرنے والا خود ایجاب یا قبول کرے۔ مثلاً لڑکا یا لڑکی دونوں میں سے کوئی ایک دو گواہوں کی موجودگی میں دوسرے سے کہے کہ میں نے آپ سے اتنے مہر کے عوض نکاح کیا اور وہ کہے ہاں میں نے قبول کیا۔

وِلایۃً: یعنی نکاح کرنے والے کا ولی، مثلاً اس کا باپ، دادا، بھائی یا چچا وغیرہ (بالترتیب) اس کی طرف سے ایجاب یا قبول کرے، ایسا صرف اس صورت میں ہوتا ہے؛ جب کہ لڑکا یا لڑکی نابالغ ہو۔ اگر نکاح باپ دادا کے علاوہ کسی دوسرے ولی، مثلاً بھائی، چچا وغیرہ نے کرایا ہے، تب تو ان کو بالغ ہونے کے بعد اختیار ہوگا کہ اس نکاح کو باقی رکھیں یا ختم کر دیں، اور اگر باپ دادا نے کرایا ہے تو یہ اختیار نہیں رہے گا۔ ہاں اگر باپ دادا اپنے فسق و فجور میں مشہور ہوں تو پھر نکاح ختم کرنے کا اختیار ہوگا۔ فقہ کی اصطلاح میں اس کو ''خیار بلوغ'' کہا جاتا ہے؛ مگر اس کے لیے قضاء قاضی شرط ہے، یعنی شرعی دار القضاء میں جا کر قاضی شریعت کی خدمت میں فسخ نکاح کا درخواست دینا ضروری ہے، قاضی محترم تحقیق کرنے کے بعد فسخ کر سکتے ہیں۔

اجازۃً: اگر لڑکا یا لڑکی بالغ ہو تو اس کی طرف سے اجازت یا وکالت کا ہونا ضروری ہے۔ ہمارے معاشرہ میں عموماً لڑکا اور لڑکی کے والدین، اولیاء و سرپرستان نکاح کراتے ہیں، یہ ایک بہتر اور مستحسن عمل ہے؛ کیوں کہ دونوں کے اولیاء اپنی اولاد کی دینی اور دنیاوی بھلائی دیکھ کر ہی نکاح کرائیں گے۔ اسی وجہ سے شریعت میں ولی کی اجازت کے بغیر کیے گئے نکاح کو ناپسندیدہ سمجھا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اولیاء کو حکم فرمایا ہے کہ وہ اپنی بالغ اولاد کا نکاح ان کی رضامندی کے بغیر نہ کریں:

"لَا تُنْكَحُ الْأَيِّمُ حَتَّى تُسْتَأْمَرَ، وَلَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتَّى تُسْتَأْذَنَ"

(بخاری:٥١٣٦)

کیوں کہ ازدواجی زندگی دونوں میاں بیوی کو گزارنی ہے؛اس لیے ان سے اجازت لی جائے۔

اجازت کا مطلب یہ ہے کہ بالغ لڑکا یا لڑکی اپنے ولی مثلاً باپ، دادا، یا بھائی کو اس بات کی اجازت دے دے کہ آپ میرا نکاح فلاں سے کرادیں، یا جس سے چاہیں کرادیں، یا ولی اپنے بیٹے یا بیٹی سے اس بات کی اجازت لے لیں کہ وہ اس کا نکاح فلاں یا فلانہ سے کرانے جارہا ہے، واضح رہے کہ اگر باپ دادا نے کنواری لڑکی سے اجازت طلب کی اور وہ خاموش رہی تو اس کا خاموش رہنا بھی اجازت کے حکم میں ہوگا۔ بہرحال ایسی صورت میں ولی کو بھی اپنے بالغ بیٹے یا بیٹی کا نکاح کرانے کا یعنی ایجاب یا قبول کرنے کا حق ہوگا۔ اجازت دیتے یا لیتے وقت بہتر ہے کہ دو گواہ بھی موجود ہوں۔

وکالۃً: یعنی نکاح کرنے والا لڑکا یا نکاح کرنے والی لڑکی کسی کو ایجاب وقبول کرنے کا زبانی یا تحریری طور پر وکیل بنادے، مثلاً یوں کہے یا لکھ دے کہ میں نے فلاں بن فلاں کو فلانہ بنت فلانہ سے یا فلاں بن فلاں سے اپنا نکاح کرانے کا وکیل بنادیا اور وکیل اس کی طرف سے ایجاب یا قبول کرے۔ مثلاً یوں ایجاب کرے کہ میں نے اپنے مؤکل یا مؤکلہ کو آپ کی زوجیت میں دیا یا میں نے اپنے مؤکل یا مؤکلہ کا نکاح آپ سے کیا۔ قبول اس طرح کرے کہ میں نے اپنے مؤکل یا مؤکلہ کی طرف سے قبول کیا۔

واضح رہے کہ وکیل یا بالغ اولاد کا ولی خود اپنی طرف سے کسی کو نکاح کرانے کی اجازت نہیں دے سکتا ہے اور نہ کسی کو وکیل بنا سکتا ہے؛ اگر کسی نے ایسا کرلیا یعنی ولی نے کسی کو نکاح کرانے کی اجازت دے دی یا کسی کو وکیل بنادیا یا وکیل نے خود کسی دوسرے کو وکیل بنادیا یا نکاح کرانے کی اجازت دے دی اور اس نے نکاح کردیا تو ایسی صورت میں نکاح منعقد نہیں ہوگا۔

ہاں دو صورتیں ایسی ہیں کہ نکاح منعقد ہوجائے گا: (۱) اسی مجلس میں ولی یا وکیل

(اول) بھی موجود ہو، (۲) بعد نکاح جب لڑکی کو اس کی اطلاع ہوئی کہ فلاں نے میرا نکاح فلاں سے کردیا ہے تو وہ انکار نہ کرے تو اس کی خاموشی بھی دلالتہً ایجاب کے حکم میں ہوگی اور نکاح منعقد ہوجائے گا۔ (الدرالمختار علی ردالمحتار:۳/ ۸۵، ہندیہ:۱/ ۲۹۸)

وکالت نکاح

ہر عاقل و بالغ مرد وعورت اس کے مجاز ہیں کہ اپنا نکاح خود کرنے کے بجائے کسی اہل کو وکیل بنائیں اور نکاح سے متعلق اپنے اختیارات اسے سونپ دیں۔

وکالت کی دو قسمیں ہیں: (۱) عمومی، (۲) خصوصی۔

وکالت عمومی یہ ہے کہ عاقل و بالغ مرد وعورت نے کسی کو اپنا وکیل بنا کر یہ کہا کہ تمہیں اختیار ہے کہ میرا نکاح جہاں اور جتنے مہر میں چاہو کردو۔

وکالت خصوصی یہ ہے کہ عاقل و بالغ مرد وعورت نے کسی کو اپنا وکیل بنا کر یہ کہا کہ تمہیں اختیار ہے کہ میرا نکاح فلاں شخص سے اتنے مہر میں کردو۔

ولی بھی اپنے زیر ولایت لڑکے یا لڑکی کیلئے کسی کو وکیل بنا سکتا ہے، اور اس صورت میں بھی وکالت عمومی اور خصوصی ہوسکتی ہے۔

لکھ کر وکیل بنانا یا زبانی دونوں درست ہے، اور اس موقع پر دو گواہوں کی موجودگی مستحسن ہے۔

وکیل کے لئے عاقل ہونا ضروری ہے۔

ایک ہی شخص مرد وعورت دونوں کی طرف سے وکیل یا اپنی طرف سے اصیل اور دوسری جانب سے وکیل ہوسکتا ہے۔

مہر کا مطالبہ وکیل بالنکاح سے نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ وکیل نکاح کی حیثیت سفیر محض کی ہے، اور عقد نکاح کے سلسلہ میں اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے۔

اگر وکیل نے اپنی موکلہ کا نکاح غیر کفو میں کردیا تو یہ نکاح موکلہ کی اجازت پر

موقوف رہے گا۔

اگر مرد کے وکیل نے مہر مثل سے اتنا زیادہ مہر مقرر کر دیا جو مروج مقدار سے نمایاں طور پر زیادہ ہے، یا لڑکی کے وکیل نے اس کے مہر مثل سے اتنی کم مقدار مقرر کی جو اس کے خاندان کے لئے باعث عار ہے، تو یہ نکاح ان پر لازم نہیں ہوگا، البتہ یہ نکاح فضولی کے حکم میں ہے، اگر اسی مہر کے ساتھ وکیل بنانے والے (مرد و عورت) نے نکاح کو قبول کر لیا تو نکاح منعقد ہو جائے گا۔

اگر وکیل کو بغیر کسی قید کے علی الاطلاق اختیار دیا گیا ہو تو بھی وکیل اس کا پابند ہوگا کہ وہ کسی ایسے لڑکے یا لڑکی سے اپنی موکلہ یا موکل کا نکاح نہ کر دے جس میں کوئی بڑا اور نمایاں عیب ہو۔

بالغ لڑکی کی اجازت

ولی اقرب کے لئے ضروری ہے کہ عاقلہ بالغہ کا نکاح اس کی اجازت سے کرے، اگر ایسا نہیں کیا تو نکاح لڑکی کی اجازت پر موقوف رہے گا۔

سنت یہ ہے کہ ولی خود اجازت لینے جائے، اور بہتر ہے کہ رشتہ طے کرنے سے پہلے کسی مناسب ذریعہ سے لڑکی کا عندیہ معلوم کرے۔

اگر ولی اقرب خود اجازت لینے نہ جائے بلکہ کسی کو اپنا وکیل یا قاصد بنا کر بھیجے تو اس وکیل یا قاصد کو چاہئے کہ لڑکی کے سامنے صراحت کر دے کہ وہ اس کے ولی کی طرف سے بحیثیت وکیل یا قاصد اس سے اجازت حاصل کرنے آیا ہے۔

بالغہ کنواری لڑکی سے خود ولی اقرب یا اس کا وکیل یا قاصد اجازت طلب کرے تو اس لڑکی کی طرف سے صراحۃ اجازت ضروری نہیں ہے، بلکہ ایسی چیزوں کا اظہار جو عرف میں اجازت کی علامت ہے، اذن اور رضا سمجھا جائے گا۔

ولی اقرب یا اس کے وکیل یا قاصد کے سوا کوئی اور بالغہ کنواری سے اجازت لے رہا

ہے تو رضا کی علامتوں کا پایا جانا کافی نہیں ہوگا، بلکہ صراحتاً منظوری کے بعد ہی اذن تصور کیا جائے۔

اگر لڑکی سے نکاح کی اجازت لیتے وقت اجازت لینے والے شخص نے ہونے والے شوہر کا متعین طور پر ذکر نہیں کیا تو لڑکی کا خاموش رہنا کافی نہیں ہوگا، بلکہ صراحتا اپنی رضا کا اظہار ضروری ہوگا۔

اجازت لیتے وقت ہونے والے شوہر کا ذکر اس طرح کیا جانا چاہئے کہ وہ متعین ہو جائے، مثلا ہونے والے شوہر کا نام، اس کی ولدیت، اور ضرورت ہو تو سکونت کی بھی تصریح کر دی جائے۔

اجازت لیتے وقت مہر کی مقدار بتا دینا بہتر ہے۔

اگر بالغہ ثیبہ ہو (جس کا نکاح پہلے بھی ہو چکا تھا، اور شوہر کے ساتھ رہ چکی ہے) تو زبان سے رضامندی کا اظہار ضروری ہے۔

تشریح: ثیبہ سے مراد وہ خاتون ہے جس سے نکاح صحیح یا فاسد کے بعد وطی کی گئی ہو، یا اس کے ساتھ وطی بالشبہہ کا تحقق ہوا ہو، یا اس سے بار بار زنا کا صدور ہوا ہو اور عام لوگوں نے اس کو جان لیا ہو۔

اگر بالغہ کنواری کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر ولی اقرب نے کر دیا اور بعد نکاح خود ولی اقرب یا اس کے وکیل یا قاصد یا کسی قابل اعتماد شخص نے لڑکی کو اس نکاح کی خبر دی، اور اس کی طرف سے رضامندی کی کوئی علامت پائی گئی تو اسے نکاح کی منظوری تصور کیا جائے گا، اور اگر لڑکی ثیبہ ہے تو صراحتاً زبان سے منظوری ضروری ہوگی۔

نکاح فضولی

جو شخص بغیر شرعی اختیار کے اپنا یا کسی اور کا نکاح کر دے تو یہ نکاح، نکاح فضولی ہوگا، اور ایسا نکاح اس شخص کی اجازت پر موقوف ہوگا جو اس معاملہ میں شرعاً اختیار رکھتا ہو، اگر

صاحب اختیار نے فضولی کے اس نکاح کو منظور کرلیا تو نکاح نافذ ہوگا، ورنہ باطل ہوجائے گا۔

مثلاً کسی ہوش مند نابالغ نے اپنا نکاح خود کرلیا یا کسی غیر نے نابالغ کا یا بالغ مجنون و معتوہ کا نکاح اس کے ولی کی اجازت کے بغیر کردیا تو یہ تمام صورتیں نکاح فضولی کی ہیں، جو اولیاء کی اجازت پر موقوف رہیں گی، اسی طرح اگر کسی شخص نے عاقل و بالغ کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر کردیا تو یہ بھی نکاح فضولی ہوگا، جو عاقل و بالغ کی اجازت پر موقوف رہے گا۔

☆☆☆☆☆

اسلام کا نظام طلاق اور اس کی قسمیں

مولانا مفتی محمد ظفر عالم ندوی

(استاذ حدیث وفقہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

نظام طلاق اور اس کی قسموں سے متعلق گفتگو کرنے سے قبل اس کی ضرورت اور پسِ منظر پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ انسانی سوسائٹی کی بنیاد مرد وزن کے تعلق پر ہے، اور پاکیزہ سماج کی تشکیل نکاح جیسے پاک اور پائیدار رشتہ سے مربوط ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے مرد وزن کے درمیان کا وہ رشتہ جو پاکیزہ اور پائیدار جذبہ سے قائم ہو نکاح کہلاتا ہے، جو انسان کی جنسی خواہشات کی تسکین کے علاوہ صالح معاشرہ کی خاطر وجود میں لایا جاتا ہے تاکہ فرد اور سماج دونوں خوش گوار زندگی گزار سکیں اور پاکیزہ بنیادوں پر انسانی آبادی نشو نما پاسکے۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جسکو دنیا کا کوئی مذہب اور قانون نظر انداز نہیں کرسکتا، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر مذہب وقانون اور انسانی آبادی کے ہر مہذب سماج نے اس کا ایک نظام پیش کیا ہے اور انسانی سوسائٹی کو بہتر شکل دینے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ اسلام نے مرد وزن کے درمیان اس رشتے کو پاکیزہ اور پائیدار بنانے کے لئے جو نظام پیش کیا ہے، اسے حقیقت کی عینک سے دیکھا جائے تو بلاشبہ قانون و اخلاق کے ہر پیمانہ میں یہ نمایاں خصوصیت اور انفرادی حیثیت رکھتا ہے، جس میں پاکیزگی بھی ہے اور پائیداری بھی ہے قانون فطرت سے ہم آہنگی بھی ہے اور وسعت و لچک بھی جو کسی نظام کی پائیداری اور بہتری کے لئے بنیادی عناصر ہیں۔

مرد وعورت کے درمیان خوشگوار زندگی گزارنے کے اس پاکیزہ اور پائیدار نظام کے باوجود ان کے درمیان کبھی کبھی مزاجی ہم آہنگی نہ ہونے اور معاشی وسماجی ناہمواری ہونے کی وجہ سے ایسی تلخیاں پیدا ہوجاتی ہیں جن کے ہوتے ہوئے دونوں کا ایک ساتھ نباہ دشوار ہوجاتا ہے ،اور زندگی بے کیفی اور انتشار کا شکار ہوجاتی ہے اور بسا اوقات دونوں کے لیے جدائی ہی میں راحت اور بہتری معلوم ہوتی ہے، مذہب اسلام نے اس پس منظر اور ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا حل نظام طلاق کی شکل میں پیش کیا ہے، جس میں فریقین کے حالات کے اعتبار سے مختلف شکلیں بھی پیش کی ہیں، جو شرع اسلامی کی تعبیر میں طلاق، خلع، فسخ، اور تفریق سے معروف ہیں، آگے ہم نظام طلاق اور اس کی اقسام پر آج کی مجلس میں مختصر گفتگو کریں گے، لیکن اس سے قبل اختصارا یہ ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام نے زوجین کے درمیان پیدا ہونے والی تلخی اور نفرت کو دور کرنے کی تدابیر اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے، اولا شوہر کو یہ تعلیم دی ہے کہ زوجین کے درمیان جب تلخی پیدا ہو اور اللہ کے قائم کردہ حدود واحکام پامال ہونے کا اندیشہ ہو تو بیوی کو افہام وتفہیم اور وعظ ونصیحت کے ذریعہ راہ راست پر لانے کی کوشش کرے اگر یہ کوشش کارگر نہ ہو، تو بستر علیٰحدہ کرکے اپنی ناراضگی جتا کر اصلاح کرے، اگر یہ بھی تدبیر کام نہ آئے تو ہلکی مار پیٹ سے کام لے:

﴿والّٰتی تَخَافُونَ نُشُوزَهُنّ فَعِظُوهُنَّ وَاهجُرُوهُنَّ فِی المَضَاجِعِ وَاضرِبُوهُنَّ فَإِن اَطَعنَكُم فَلَا تَبغُوا عَلَيهِنَّ سَبِيلًا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرً﴾(سورة النساء : ٣٤)

ترجمہ: اور جو عورتیں ایسی ہیں کہ تم ان کی سرکشی کا علم رکھتے ہو تو انہیں خوابگاہوں میں تنہا چھوڑ دو اور انہیں مارو پھر وہ اگر تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو ان کے خلاف بہانے نہ ڈھونڈو بیشک اللہ بڑا ہی رفعت والا اور بڑا ہی عظمت والا ہے۔

اگر یہ ساری تدبیریں ناکام ہوجائیں اور زوجین کے ہاتھ سے معاملہ نکل جائے تو اسلام نے دوسرا طریقہ دونوں خاندان کے سمجھدار افراد کے ذریعہ ثالثی کے طور پر فریقین کے

درمیان کی دوری ختم کرکے اتحاد کی صورت پیدا کرنے کی تعلیم دی ہے، فرمانِ خداوندی ہے:

وَاِن خِفتُم شِقَاق بينهما فابعثوا حكما من اهله و حكما من اهلها، ان يريدآ اصلاحا يوفق الله بينهما ان الله كان عليما خبيرا ﴾(سورة النساء، آيت نمبر ٣٥)

ترجمہ: اور اگر تمہیں دونوں کے درمیان کشمکش کا علم ہو تو تم ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک حکم عورت کے خاندان سے مقرر کردو، اگر دونوں کی نیت اصلاح حال کی ہوگی تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت پیدا کردے گا، بیشک اللہ بڑا ہی علم رکھنے والا ہے ہر طرح باخبر ہے۔

خدانخواستہ اگر یہ تدبیر بھی ناکام ہوجائے اور خود فریقین، خاندان کے افراد اور سماج دونون کی جدائی میں خیر سمجھتے ہیں تو اس مجبوری میں طلاق کی ضرورت پیش آجاتی ہے، اسلام نے اس ضرورت کو دیکھتے ہوئے دونوں کے بہتر مستقبل کی خاطر طلاق جیسے ناپسندیدہ طریقے کو اختیار کرنے کی اجازت دی ہے، یہ ایک ضرورت اور مشکل کا حل ہے نہ کہ کوئی پسندیدہ عمل۔

پیغمبرِ اسلام آنحضرت ﷺ نے طلاق کی اجازت کے ساتھ ناپسندیدگی کا بھی اظہار فرمایا ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''أبغض الحلال الى الله الطلاق''

ترجمہ:۔ حلال چیزوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے، (ابنِ ماجہ ١/ص٦٥٠)

حضرت محارب بن دثار سے مروی ہے کہ ''ما أحل الله شيئا أبغض اليه من الطلاق ''(سنن ابوداؤد باب، کراھیۃ الطلاق، ج١/ص٥٢٦) ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ جن چیزون کی اجازت دی ہے اس میں اللہ کے نزدیک طلاق سے زیادہ ناپسندیدہ کوئی عمل نہیں۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: جو عورت نافرمانی کرتے ہوئے اپنے شوہر سے خُلع طلب کرے تو اس پر اللہ، فرشتے اور تمام لوگوں کی لعنت ہو:

أيما امرأة اختلعت من زوجها بغير نشوز فعليها لعنة الله والملائكة والناس اجمعين (مرقاة شرح مشكوة ٥/٢٣٧)

حضرت ثوبانؓ سے مروی ابن ماجہ نے روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"أيما امرأة سألت زوجها الطلاق من غير ما بأس حرام عليها رائحة الجنة" (ابن ماجه ١/٢٦٦)

ان تمام ارشادات نبوی سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں طلاق فی نفسہ کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے اسی لئے فقہاء اسلام نے یہ صراحت کی ہے کہ طلاق بنیادی طور پر بلاضرورت ممنوع ہے اور بوقت ضرورت مشروع یعنی جائز ہے۔ حنفی فقیہ علامہ علاء الدین کاسانی فرماتے ہیں:

ان النكاح عقد مسنون فكان الطلاق قطعا للسنة وتفويتا للواجب (فكان الأصل الحظر والكراهة، إلا أنه رخص للتأديب أو للتخليص، بدائع الصنائع ٣/ ص ٩٠)

نکاح عقد مسنون ہے، طلاق اس سنت کو ختم کرنے اور واجب کو فوت کرنے کا سبب ہے، لہذا اصلا یہ ممنوع اور ناپسندیدہ ہے۔ فقہ حنفی کے مسائل کا مشہور مجموعہ فتاوی ھندیہ میں فقہاء کی رائے درج ہے:

"اما وصفه (الطلاق) فهو أنه محظور نظراً الى الأصل ومباح نظرا الى الحاجة۔ (الفتاوى الهندية، ج ١، ص: ١٤٥)

یعنی (طلاق اصل کے اعتبار سے ممنوع اور ضرورت کی بنا پر جائز ہے، ان کے علاوہ دیگر بے شمار فقہاء نے یہی صراحت کی ہے کہ طلاق اصلا ممنوع ہے، لیکن جب ازدواجی زندگی کا رشتہ قائم رکھنا دشوار ہو جائے اور نکاح کے مقاصد فوت ہو جائیں تب اس کی

اجازت ہوگی اور کسی معقول سبب کے بغیر اگر طلاق دی گئی تو اگرچہ یہ واقع ہو جائے گی، لیکن طلاق دینے والے مرد یا بلا وجہ طلاق کا مطالبہ کرنے والی عورت گنہگار ہوگی۔

غرض کہ طلاق اسلام کی نظر میں اگرچہ ایک ناپسندیدہ عمل ہے لیکن بسا اوقات یہ ایک خاندانی اور سماجی ضرورت بن جاتی ہے جسکی وجہ سے بوقت ضرورت اسکے جواز کو تسلیم کیا ہے اور اس کا ایک وسیع و مکمل نظام ضرورت مند دنیا کے سامنے رکھا ہے۔

ذیل میں اس نظام اور اس کی اقسام کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

نظام طلاق کے سلسلے میں سب سے پہلے ہم اس کی وہ تعریف پیش کر رہے ہیں جس کو اسلامی فقہ و قانون کے ماہرین نے زیادہ جامع تسلیم کیا ہے اور پسند بھی کیا ہے۔

تعریف:۔ شوہر کی جانب سے براہ راست یا بذریعہ وکیل مخصوص الفاظ میں صراحۃ یا کنایۃ فورا یا ایک وقفہ کے بعد رشتۂ نکاح کو ختم کر دینے کا نام طلاق ہے، فقہ حنفی کے مشہور محقق ابن ہمام فرماتے ہیں:

"و في الشرع رفع قيد النكاح بلفظ مخصوص أو بكناية وغيرهما كقول القاضي" فتح القدير لابن همام ٣/ص ٢١

(شرع میں طلاق عقد نکاح کو مخصوص لفظ یا کنائی لفظ یا ان کے علاوہ طریقے جیسے قاضی کے فیصلہ سے ختم کر دینے کا نام ہے)۔

علامہ ابن نجیم مصری کے الفاظ ہیں:

رفع قيد النكاح حالا او مآلا بلفظ مخصوص۔ البحر الرائق ٣/٢٥٣

(طلاق قید نکاح کو فوراً یا نتیجۃً مخصوص لفظ سے ختم کرنے کا نام ہے)۔

علامہ حصکفی کے الفاظ ہیں:

رفع قيد النكاح في الحال بالبائن او المآل بالرجعي بلفظ مخصوص (الدر المختار مع رد المحتار ٢/٤٢٦

(طلاق قید نکاح کو فوراً بائن یا نتیجۃً رجعی طریقہ پر مخصوص لفظ سے ختم کرنے کا نام ہے)

اور فقہاء نے تقریبا انہی الفاظ میں طلاق کی تعریف کی ہے۔

ماضی قریب کے ماہر قانون وفقہ اسلامی کے اسکالر ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن نے طلاق کی جو تعریف اپنی مشہور کتاب مجموعہ قوانین اسلام میں کی ہے وہ مختلف مکاتب فقہ کے فقہاء کی تعریفات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، ہم اس کو یہاں نقل کرنا بے حد مفید سمجھتے ہیں:

شوہر کی جانب سے ''اِصالتاً یا وکالتاً نیابتاً یا تفویضاً مخصوص الفاظ کے ساتھ یا بالکنایہ فی الفور یا بالنتیجہ رشتۂ ازدواج ختم کرنے کا نام طلاق ہے، (مجموعہ قوانین اسلام جلد دوم/ ۳۵۷، دفعہ نمبر ۹۳)

ڈاکٹر موصوف نے جو خود فقہ وقانون کے ماہر ہیں جو الفاظ وتغیرات طلاق کی تعریف میں درج کئے ہیں طلاق کے مفہوم کا پوری طرح احاطہ کرتے ہیں، اسلئے ناچیز کے نزدیک یہ تعریف قابل ترجیح اور لائق اخذ ہے،

رکن طلاق

طلاق کی تعریف کے بعد اسکی بنیاد یعنی رکن طلاق واضح کرنا ضروری ہے، فقہ اسلامی کے ماہرین کی رائے ہے:

طلاق کا مفہوم رکھنے والے مخصوص الفاظ میں سے کسی لفظ کا زبان سے ادا کرنا یا لکھ دینا رکن طلاق ہے، محض طلاق کا خیال کرنے یا دل ہی دل میں طلاق دینے سے طلاق واقع نہیں ہوگی، مشہور فقیہ علامہ حصکفی لکھتے ہیں: وركنه لفظ مخصوص خال عن الاستثناء: علامہ ابن عابدین شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(قوله وركنه لفظ مخصوص) هو ماجعل دلالة على معنى الطلاق مِن صريح أو كناية: (الدرالمختار مع رد المحتار ۲/ ۵۷٤)۔

یہاں لفظ مخصوص سے مراد وہ لفظ ہے جو صراحۃ یا کنایۃ طلاق کے معنی پر دلالت کرے۔

صیغہ یا الفاظ طلاق

رکن طلاق چونکہ تلفظ ہے اور یہ تلفظ عربی یا غیر عربی زبان میں بھی ہوسکتا ہے، خواہ زبان سے ادا کر کے ہو یا تحریر یا اشارہ سے۔

لفظ صریح اور اس کا حکم

زبان یا تحریر سے طلاق کے لئے جو الفاظ استعمال ہوں وہ صریح بھی ہوسکتے ہیں اور کنایہ بھی صریح وہ لفظ ہے جس کی مراد ظاہر ہو اور عرف میں اس کا غالب استعمال طلاق کے لئے ہو، جیسے " أنت طالق وأنت مطلقة"، " الطلاق الصريح هو اللفظ الذى ظهر المراد منه وغلب استعمالهٗ عرفاً فى الطلاق "الفقه الإسلامى وادلته ۷/ ۶۸۹۷۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص لفظ طلاق کے علاوہ کسی ایسے لفظ سے طلاق دے جو اس زبان میں طلاق کے لیے مخصوص ہو تو وہ بھی صریح طلاق کے حکم میں ہوگا۔ طلاق صریح کا حکم یہ ہوتا ہے کہ اس میں طلاق واقع ہونے کے لئے نیت کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ بلانیت بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے، " يقع الطلاق باللفظ بدون حاجة إلىٰ نية أو دالة حال "(حوالہ سابق رص ۶۸۹۹)

لفظ کنایہ اور اس کا حکم

ہر وہ لفظ جس میں طلاق اور اس کے علاوہ دیگر معنی کا احتمال ہو اور لوگوں کے عرف میں معنی طلاق کے لئے معروف نہ ہو۔ مثلاً کوئی اپنی بیوی سے کہے: اخرجى (نکل جاؤ) اذهبى (چلی جاؤ)، امرك بيدك، تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے یہ اور اس قسم کے الفاظ کنایہ کے دائرے میں آتے ہیں۔ "كل لفظ يحتمل الطلاق وغيره ولم يتعارفه الناس فى ارادة الطلاق ۔ مثل قول الرجل لزوجته: الحقى بأهلكِ، اخرجى، اذهبى وامرك بيدك" (الفقه الاسلامى وأدلته ۷/ ۶۸۹۹)

اس کا حکم یہ ہے کہ ان الفاظ سے طلاق کا حکم اس وقت لگایا جائے گا جب کہ ان کا استعمال طلاق کی نیت سے ہو یا دلالت حال یا طلاق کا تذکرہ ہو۔(حوالہ سابق ص:۶۹۰۰)

فقہاء نے لکھا ہے کہ طلاق بالکنایہ کے الفاظ طلاق کے لئے مخصوص نہیں ہوتے مگر وہ الفاظ اپنے اندر معنی کے اعتبار سے یہ احتمال ضرور رکھتے ہیں کہ انہیں طلاق کے لئے استعمال کیا جائے اور قرائن کے ساتھ ان سے طلاق مراد لی جائے، اگر طلاق دینے والا اس لفظ سے طلاق کی نیت کرے گا تو طلاق واقع ہوگی ورنہ نہیں۔

لفظ کنایہ سے طلاق دیانۃً واقع ہوتی ہے

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ طلاق بالکنایہ دیانۃً واقع ہوتی ہے یعنی طلاق دہندہ کا قول بندہ اور خدا کے درمیان معتبر ہوتا ہے قضاءً واقع ہوگی یا نہیں؟ اس بارے میں فقہاء نے صراحت کی ہے کہ قاضی زوجین کے حالات کی تحقیق کرے اور قرائن کا جائزہ لے کر حکم طلاق نافذ کرے۔ اس موضوع پر صاحب بدائع الصنائع امام کاسانیؒ نے بڑی عمدہ بحث اور تفصیلی گفتگو فرمائی ہے، موصوف کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ کنایہ الفاظ استعمال کرتے وقت زوجین حسب ذیل حالتوں میں سے کسی ایک حالت میں ہوں گے:

۱۔ رضامندی کی حالت یعنی وہ الفاظ کنایہ رضامندی کی حالت میں کہے گئے ہوں۔

۲۔ غصے یا جھگڑے کی حالت یعنی وہ الفاظ کنایہ جب کہے گئے ہوں تو کسی بات پر باہم تکرار ہو رہی ہو۔

۳۔ یا باہم طلاق کا تذکرہ ہو رہا ہو۔

لہٰذا اگر رضامندی کی حالت ہے تو تمام الفاظ کنایہ میں عدم نیت کی صورت میں دیانۃً یا قضاءً کسی طرح بھی طلاق واقع نہ ہوگی۔ البتہ دوسری دو حالتوں میں حالات وقرائن اور شواہد کے لحاظ سے بعض الفاظ کنایہ سے قضاءً وقوع طلاق کا حکم دیا جا سکتا ہے۔ علامہ موصوف کے الفاظ ہیں:

وهل يدين فى القضاء؟ فالحال لا يخلو إما أن كا نت حالة الرضا وابتدأ الزوج بالطلاق وإما إذا كانت حالة مذاكرة الطلاق وسوأله وإما ان كانت حالة الغضب والخصومة فاذا كانت حالة الرضاء (وابتدأ الزوج بالطلاق) يدين فى القضاء فى جميع الالفاظ لما ذكرنا ..... وإن كانت حال مذاكرة الطلاق وسواله أو حالة الغضب والخصومة ، فقد قالوا إن الكنايات أقسام ثلثه: فى قسم منها لايدين فى الحالين جميعاً لأنه ما أراد به الطلاق لا فى حالة مذاكرة الطلاق وسؤاله ولافى حالة الغضب والخصومة، و فى قسم منها يدين فى حال الخصومة والغضب ولا يدين فى حال ذكر الطلاق وسؤاله وفى قسم منها يدين فى الحالين جميعاً۔(بدائع الصنائع ۲۳۵/٤)

تحریری طلاق

یہاں ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا محض مفہوم طلاق رکھنے والے الفاظ زبان سے ادا کرنے ہی سے طلاق واقع ہو جاتی ہے یا تحریر سے بھی ہو جاتی ہے اس بارے میں فقہاء نے صراحت کی ہے کہ تحریر سے بھی طلاق ہو جاتی ہے اور تحریر کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں، تحریر کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ کسی کاغذ یا دیوار وغیرہ پر واضح اور باقی رہنے والی ہو فقہاء اسے کتابتِ مستبینہ سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کی دو قسمیں بتاتے ہیں، (۱) مرسومہ (۲) غیر مرسومہ، اگر باضابطہ طلاق نامہ یا مکتوب عنوان کے ساتھ اور بیوی کو مخاطب کر کے لکھا گیا ہو تو اسے کتابت مستبینہ مرسومہ کہتے ہیں، اور اگر یونہی کسی کاغذ کے ٹکڑے یا دیوار پر بیوی کی طرف اضافت کے بغیر صرف یہ لکھے کہ طلاق ہے یا طلاق دی اور یہ تحریر بیوی کو نہ بھیجے تو یہ کتابت مستبینہ غیر مرسومہ ہے۔ کتابت مستبینہ مرسومہ تلفظ کے قائم مقام ہے اور اس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

اور کتابت مستبینہ غیر مرسومہ جس میں بیوی کی طرف طلاق کی نسبت نہ ہو اس سے

طلاق واقع نہیں ہوگی، البتہ اگر شوہر یہ کہے کہ اس سے میری نیت بیوی کو طلاق دینے کی تھی تو طلاق واقع ہوجائیگی۔

اسلامی قانون کی مشہور ومعتبر کتاب فتاوی ہندیہ میں اس کی تفصیل اس طرح ہے:

الكتابة على نو عين مرسو مة وغير مرسو مةونعنى بالمرسومة أن يكون مصدرا ومعنونا مثل ما يكتب الى الغائب وغير المرسومة أن لا يكون مصدرا ومعنونا وهو على وجهين مستبينة وغير مستبينة فا لمستبينة ما يكتب على الصحيفة والحا ئط والأرض على وجه يمكن فهمه وقرائته و غير المستبينه ما يكتب على الهواء والماء وشيئ لا يمكن فهمه وقرائته فهى غير المستبينة لا يقع الطلاق وان نوى وان كا نت مستبينة لكنها غير مرسومه ان نوى الطلاق يقع والا فلا الخ (فتاوى هنديه جلد ۱/۳۷۸، الدرالمختار مع ردالمحتار۲/۵۸۹)

گونگے اور معذور کی طلاق

یہاں یہ سوال بھی اٹھ سکتا ہے کہ اگر کوئی زبان سے یا تحریر سے طلاق ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو کس طرح طلاق دے، مثلاً اگر کوئی گونگا ہو تو اس کے لئے طلاق دینے کی کیا صورت ہوگی؟ قانون اسلامی میں اس کی بھی گنجائش ہے کہ ایسا شخص اشارہ سے طلاق دے، فقہاء نے لکھا ہے کہ: گونگا اور بولنے سے معذور شخص اگر پڑھا لکھا ہو تو وہ بذریعہ تحریر طلاق دے سکتا ہے، لیکن پڑھا لکھا نہ ہو تو اشارہ سے طلاق دینے کی اجازت ہے، مشہور فقیہ علامہ برہان الدین مرغینانیؒ فرماتے ہیں گونگے کی طلاق اشارہ سے واقع ہوگی بشرطیکہ اشارہ معلوم اور مشخص ہو اور اشارہ قائم مقام قول کے تصور کیا جائے گا: "وطلاق الأخرس واقع بالإشارة لأنها صارت معهودة فاقيمت مقام العبارة دفعا للحاجة" هداية ۳۵۹/۲

صاحب بحرالرائق علامہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں:

وله:(وأخرس باشارته) اى لو كان الزوج أخرس فان الطلاق يقع بإشارة لأنها صارت مفهومة فكانت كالعبارة فى الدلالة استحسانا فيصح بها نكاحهٗ، وطلاقهٗ وعتاقهٗ وبيعهٗ وشراؤهٗ سواء قدر على الكتابة أولا۔(البحر الرائق ۴۳۳/۳)

ابن نجیم کے کلام سے معلوم ہوا کہ گونگا اور نطق سے معذور شخص کے لئے اشارہ سے طلاق دینا درست ہے، اگرچہ بعض مشائخ اس کے بھی قائل ہیں کہ گونگا اگر تحریر لکھنے پر قادر ہو تو اشارہ سے طلاق دینا درست نہیں ہے۔ محقق ابن ہمام کا رجحان بھی یہی ہے۔(فتح القدیر۴۲/۳)

یقیناً تحریر پر قدرت کی صورت میں بہتر یہی ہے، تاہم اگر گونگے کے اشارہ سے طلاق کا مفہوم واضح ہوجائے تو طلاق واقع ہوجائے گی، جیسا کہ جمہور فقہاء احناف اور شوافع کی صراحت سے معلوم ہوتا ہے۔(المفصل فى احكام المرأة، الدكتور عبد الكريم زيدان ۴۵۱/۷)

بذریعہ وکالت طلاق

شرع اسلامی میں یہ بالکل واضح ہے کہ شوہر کو طلاق دینے کا حق ہے، بشرطیکہ اس میں اہلیت موجود ہو یعنی وہ عاقل اور بالغ ہو، اسی طرح اسے یہ بھی اختیار ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کے لئے کسی عاقل وبالغ شخص کو اپنا وکیل مقرر کرلے اور اس کے ذریعہ طلاق دے، وکیل طلاق کے لئے ضروری ہے کہ وہ عاقل اور بالغ ہو، اگر وکیل نابالغ ہوگا تو اس کی دی ہوئی طلاق واقع نہ ہوگی، وکیل کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اسے اختیار صراحتاً دیا گیا ہو اور وکیل حسب ہدایت مؤکل اس اختیار کو استعمال میں لائے۔

فقہ حنفی کی مستند کتاب ہدایہ میں ہے:

واذا قال لرجل : طلق امرتى ، فله أن يطلقها فى المجلس وبعده ولهٗ أن

يرجع لانه توكيلٌ وأنهٗ استعانةٌ فلا يلزم ولا يقتصر على المجلس۔(هداية مع فتح القدير ٣/ ١١٦)

فقہ شافعی کی مستند کتاب مغنی المحتاج میں شوافع کا مسلک یہی درج ہے:

ويصح التوكيل في طرفي بيع ونكاح وطلاق ۔(مغنى المحتاج ٢/ ٢٢٠)

یہاں یہ ذکر کرنا بے سود نہیں ہوگا کہ ہمارے ملک کی عدالتوں میں میاں بیوی سے متعلق جو تنازعات جاتے ہیں، وہاں شوہر کی طرف سے مقرر وکیل بسا اوقات اپنی طرف سے مؤکل کی صراحت واجازت کے بغیر بلکہ کبھی کبھی اس کے علم میں لائے بغیر طلاق نامہ اس کی بیوی کو بھیج دیتے ہیں، جیسا کہ دارالافتاء میں گاہے بگاہے اس قسم کے واقعات سے متعلق استفتاءات آتے رہتے ہیں۔ظاہر بات ہے کہ اگر مؤکل کی طرف سے طلاق دینے کی صراحت نہ ہو اور نہ ہی اس کی خبر ہو تو شرعی نقطۂ نظر سے اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔

یہاں یہ بھی دھیان رکھنے کی ضرورت ہے کہ وکیل کو اختیارِ طلاق سونپنے کی صورت میں مؤکل شوہر کو ہر وقت یہ اختیار حاصل ہے کہ وکیل کو دئے ہوئے اختیار کو واپس لے لے یا وکیل کے اس اختیار کو محدود کردے بشرطیکہ وکیل نے اس سے قبل اس اختیار کو استعمال نہ کیا ہو۔

علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

" قوله لأجنبي (طلق إمرأتي) فيصح رجوعهٗ منه ولم يقيد بالمجلس لأنه توكيل محض" (الدر المختار على رد المحتار ج٤/ ص٥٥٥)

تفویض طلاق

شوہر کو جس طرح یہ اختیار حاصل ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کا حق کسی دوسرے کو دے دے یعنی طلاق دینے کا وکیل بنادے اسی طرح اسے یہ بھی اختیار ہے کہ خود بیوی کو طلاق لے لینے کا حق سپرد کردے، اس سپردگی کو تفویض طلاق کہتے ہیں عورت کو اس طرح

خود طلاق لینے کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔اس مسئلہ میں کئی انواع اور تفصیلات ہیں اس لئے ہم اس کو اس مختصر تحریر میں بیان نہیں کرسکتے ہیں، صرف اتنی بات پر اکتفاء کرتے ہیں کہ نظام طلاق میں تفویض طلاق بھی داخل ہے، اور اس کا ایک مستقل باب اور عنوان ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ شوہر کے لئے جائز ہے ہے کہ وہ اپنی زوجہ کو حق طلاق تفویض کردے مگر اس صورت میں خود اس کا حق طلاق ساقط نہ ہوگا اور زوجہ کو شوہر کی طرف سے حق طلاق تفویض ہونے کی صورت میں خود اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار حاصل ہوجائے گا۔

طلاق کا اختیار کس کو ہے؟

اس جگہ عام طور پر بعض اہل علم اور کچھ معترضین کی طرف سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ طلاق کون دے؟ شوہر یا بیوی یا دونوں میں سے ہر ایک یا عدالت؟

اسلام کے نظام طلاق کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ طلاق دینے کا اختیار تو اصلاً شوہر کو ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نظام خاندان کا سربراہ مرد کو قرار دیا ہے، اور اسی کے ذمہ خاندان کے مسائل اور ذمہ داریوں کو سپرد کیا ہے، فرمان الٰہی ہے:

الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض وبما أنفقوا من أموالهم فالصالحات قانتات حافظات للغيب بما حفظ الله۔(سورة النساء:٣٤)

امام جصاصؒ نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: "والمقصود بقوامية الزوج على زوجية في الآية قيامه عليها بالتاديب والتدبير والحفظ والصيانة"(احكام القرآن للجصاص ١٨٨/٢)

ابن العربی فرماتے ہیں: وتولى امرها واصلاح حالها۔ (احكام القرآن ابن العربى ٢/ ٤١٦)

شوہر کو بیوی پر قوام وسربراہ بنانے کا مقصد یہ ہے کہ اسے خاندانی نظام میں اصلاح

وتادیب، تدبیر اور حفاظت وصیانت کی ذمہ داری دی گئی ہے۔

نظام خاندان کے بکھرتے وقت کی نازک گھڑی میں طلاق دینے کا اختیار اور اجازت شوہر ہی کو دی گئی ہے، کیونکہ نکاح سے متعلق تمام ذمہ داریوں بالخصوص مہر، نان ونفقہ ورہائش ودیگر امور کی ذمہ داریاں جس فریق کے سر ہوگی عقل وخرد اور انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ اس پاکیزہ وپائیدار رشتہ کو ختم کرنے کا اختیار بھی اسے ہی حاصل ہو۔

لیکن یہ بھی یاد رہے کہ شرع اسلامی نے شوہر کو مطلق طلاق دینے کا اختیار نہیں دیا ہے بلکہ اس کے لئے کچھ ضابطۂ اخلاق بھی مقرر کیا ہے اور شوہر کو تاکید کی ہے کہ بلاضرورت طلاق دینا سخت گناہ ہے۔ علاوہ ازیں طلاق دینے پر مرد ہی پر ساری مالی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، مہر ہو یا عدت کا نفقہ یا بچوں کے اخراجات اور ان کی پرورش پر ماں کے اخراجات وغیرہ سب مرد کے ذمہ ہوتے ہیں، اس لئے انہیں طلاق دینے کے لئے سو بار سوچنا پڑتا ہے، اور غور کیا جائے تو یہ حقیقت ہے کہ فطرۃً ان کی عقل میں پختگی اور جذبات میں ٹھہراؤ ہوتا ہے جو فیصلہ میں جلد بازی سے روکتا ہے، اس کے برعکس عورت پر نہ مالی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اور نہ ہی خاندانی تقاضوں کے بوجھ جو ان کو سوچنے پر مجبور کرے۔

اس کے برعکس عورت میں صنف نازک ہونے کی بنا پر وفور جذبات پائے جاتے ہیں، جو ان کو فیصلہ میں جلد بازی پر ابھارتے ہیں جس سے پورا خاندان دشواریوں کا شکار ہوسکتا ہیں، اس لئے ان کو طلاق دینے کا اختیار دینا فریقین اور ان کے خاندان کے لئے نقصان دہ ہوسکتا ہے، جو کسی مہذب سماج کے لئے کسی طرح مناسب نہیں، عصر حاضر کے معروف فقیہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی فرماتے ہیں: مشرق سے مغرب تک کسی بھی مہذب معاشرہ میں عورت کو طلاق دینے کا حق نہیں دیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں کے اندر قدرت نے جذبات کا وافر عنصر رکھا ہے اور یہ ان کا عیب نہیں بلکہ ان کا حسن ہے، وفور جذبات سے جہاں محبت کی سوغات ملتی رہتی ہے۔ وہیں اس کی وجہ سے زود رنجی اور جلد بازی پیدا ہوجاتی ہے اور فیصلہ کرنے میں عجلت سے کام لیتی ہے اور پھر جلد اپنے

کئے پر پچھتاتی بھی ہے۔ (مسلم پرسنل لا، اور بعض غلط فہمیاں۔ ص ۶۱-۶۳)

یہ اختیار صرف عدالت کو دینے میں بھی بہت سی دشواریوں کا سبب بنتا، جو فریقین کے لئے قوت، مال، اور عزت ہر لحاظ سے نقصان دہ ہوتا۔ تاہم اسلام نے عورت کے ساتھ زیادتی اور حق تلفی کی صورت میں اسے عدالت کے ذریعہ دشواریوں کو حل کرنے یا علیحدگی اختیار کرنے کا بھی حق دیا ہے۔ غرض کہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ طلاق کا اختیار صرف عورت یا صرف عدالت کو نہ دے کر مرد کو سپرد کرنے میں عورت ہی کا مفاد پنہاں اور اس کی زندگی کے تحفظ کا انتظام ہے۔ اس موضوع پر فقہ وفتاوی کے ماہر اور قانون وقضاء کے رمز شناس، کنوینر شعبہ قضاء آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ مولانا عتیق احمد بستوی مدظلہ العالی کا ایک علمی وتحقیقی رسالہ بعنوان: عائلی تنازعات کا شرعی حل اور شوہر کو حق طلاق کیوں؟ موجود ہے جس میں موضوع کا پورا احاطہ کیا گیا ہے اور لائق مطالعہ ہے، طلاق کا اختیار محض عدالت کے سپرد نہ کئے جانے کی حکمتوں کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا موصوف لکھتے ہیں:

''یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئیے کہ ازدواجی رشتہ بہت حساس اور نازک ہے، بیوی سے شوہر کا دل اچاٹ ہونے اور شوہر کے دل میں نفرت کے جذبات مستحکم ہونے کے اسباب اتنے کثیر اور متنوع ہیں کہ ان میں سے اکثر کو عدالت کی گرفت میں نہیں لایا جاسکتا اور کبھی طلاق کے اسباب اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ انہیں عدالت میں زیر بحث لانا عورت کے مفاد میں نہیں ہوتا بلکہ انہیں راز میں رکھنا ہی عورت کہ بہی خواہی ہوتی ہے''۔
عائلی تنازعات کا شرعی حل اور شوہر کو حق طلاق کیوں؟ ص ۱۴۔

مولانا مدظلہٗ نے اس اجمال کی تفصیل چند مثالوں کے ذریعہ پیش کر کے مرد کے اختیار طلاق کی شرعی حکمتوں کو واشگاف کیا ہے، اس عنوان پر اتنی ہی گفتگو کے ساتھ اب ہم اپنی بات ختم کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

شرائط طلاق

شرائط طلاق میں ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ طلاق دینے والا شوہر ہو یا شوہر کا وکیل یا مفوض الیہ ہو، یہی وجہ ہے کہ کسی صغیر السن بچہ کے والد یا ولی کو اپنے بچہ یا زیر ولایت کی زوجہ کو طلاق دینے کا اختیار نہیں ہے اور شوہر کا یہ اختیار کتاب وسنت سے ثابت ہے، آیت قرآنی ہے: "واذا طلقتم النساء" (سورہ بقرہ : ۲۳۱)۔ دوسری آیت ہے: " فان طلقها فلا تحل لهٗ من بعد حتى تنكح زوجاً غيره" (بقرہ : ۲۳۰)

ان آیات میں خطاب شوہروں سے ہے اور انہی کو یہ اختیار دیا گیا ہے، حدیث نبوی ہے: " الطلاق لمن أخذ بالساق" (طلاق دینے کا حق اسے ہے جو عورت کی عصمت کا مالک ہے) (سنن ابن ماجہ، ج ۱ ص ۶۷۲)

اس قسم کی نصوص کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء نے یہ بات کہی ہے کہ طلاق واقع ہونے کے لئے لازم ہے طلاق دینے والا زوج ہو یا اس کا وکیل یا وہ شخص ہو کہ زوج نے جسے طلاق دینے کا حق سپرد کر دیا ہو۔ بدائع الصنائع ۳/۹۹

اہلیت طلاق

پھر زوج کے لئے بھی یہ شرطیں بیان کیں کہ وہ مکلّف شرع یعنی عاقل، بالغ اور مختار ہو مجبور نہ ہو۔ شیخ وھبہ الزحیلیؒ فقہاء کی تصریحات سامنے رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

"يشترط أن يكون زوجا مكلفاً (عاقلا بالغا) ، مختاراً بالاتفاق" .....

آگے لکھتے ہیں: "فلا يصح الطلاق من غير زوج ،ولا من صبى مميز أو غير مميز ، وأجاز الحنابلة طلاق مميز لعقل الطلاق ولو كان دون عشر سنين" (الفقه الاسلامى وادلته جلد ۹/ ص ۶۸۸۱)

(طلاق دینے والے کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ شوہر کی اہلیت رکھتا ہو یعنی عاقل وبالغ اور اختیار ہو، لہذا جو شوہر اس کی اہلیت نہ رکھتا ہو اس کی طلاق نہیں ہوگی، اسی طرح بچہ کی بھی طلاق نہیں ہوگی خواہ عقل وتمیز رکھتا ہو یا نہیں، البتہ فقہاء حنابلہ نے عقل وتمیز رکھنے والے بچہ کی

طلاق کو معتبر مانا ہے اگر چہ وہ بچہ دس سال سے کم ہو)۔

محقق ابن ھمام نے بڑی اصولی بحث کی ہے اور فرمایا ہے کہ جس طرح دیگر تصرفات شرعی کے لئے مکلّف شرع ہونا شرط ہے اسی طرح طلاق دینے کے لئے بھی مکلّف اور اہلیت کا پایا جانا شرط ہے، آپ لکھتے ہیں:

"ومعلوم من كليات الشريعة أن التصرفات لا تنفذ الا ممن لهٗ أهلية التصرف وأدرناها العقل والبلوغ خصوصا ماهو دائر بين الضرر والنفع خصوصاً ما لا يحل الا لانتفاء مصلحة ضدهٖ القائم (النكاح) كالطلاق فانه يستدعى تمام العقل ليحكم به التمييز فى ذلك الأمر الأخ"(فتح القدير ۳ / ۳۸، ۳۹)

شریعت کے اصولوں میں یہ مشہور ہے کہ صرف انہی کے تصرفات نافذ ہوں گے جن میں تصرف کی اہلیت ہو اور کم سے کم اہلیت عقل وبلوغ کا ہونا ہے، بالخصوص ان مسائل میں جو نفع ونقصان کے درمیان دائر ہوں، خاص طور پر ایسی چیزوں میں جو موجود مصلحت ومفاد یعنی نکاح کے برخلاف حلال ہوں، جیسے طلاق یہ عقل کامل کا تقاضا کرتی ہے تا کہ اس سے نفع ونقصان کے درمیان تمیز رکھی جائے۔

محقق ابن ھمام کے کلام سے معلوم ہوا کہ شرع اسلامی میں کسی عمل کے معتبر ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی مکلّف شرع یعنی بااہل شخص کے ذریعہ وجود میں لایا گیا ہو، باب طلاق میں اہلیت کے لئے عاقل وبالغ ہونا بنیادی شرط ہے، یہی وجہ ہے کہ جو عقل نہ رکھتا ہو مثلاً مجنون (پاگل) یا معتوہ (مغلوب العقل) ہو، اسی طرح جو حد بلوغ کو نہ پہونچا ہو یعنی صغیر وبچہ ہو تو اس کی دی ہوئی طلاق کا اعتبار نہ ہوگا، اسی زمرہ میں مدہوش، مغمیٰ علیہ (جس پر غشی طاری ہو)، نائم (سوئے ہوئے) اور سرسام زدہ بھی آتے ہیں، اسی لئے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ طلاق دینے والا عاقل وبالغ ہو اور طلاق ہوش وہواس اور حالت بیداری میں دی گئی ہو، اگر طلاق دینے والا نابالغ یا مجنون یا کم عقل (معتوہ) یا مدہوش (بے ہوشی والا) یا سرسامی کیفیت میں مبتلا یا نیند کی حالت میں ہو اور طلاق دے دے تو واقع نہیں

ہوگی۔مشہور حنفی فقیہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

"لا یقع طلاق المجنون والصبی والمعتوہ والمرسم والمغمیٰ علیہ والمدھوش والنائم"(الدر المختار علی رد المحتار ۲ / ۵۸۵،۵۸۶)

(پاگل، بچہ، کم عقل، سرسام کی بیماری میں مبتلاء شخص، جس پر بے ہوشی طاری ہو، جن کا شعور باقی نہ ہو اور سوئے ہوئے شخص کی طلاق واقع نہیں ہوگی)۔

فقہاء نے مجنون، معتوہ، اور نابالغ وغیرہ کو طلاق دینے کے سلسلہ میں جو نااہل قرار دیا ہے ان کی نظر میں عام اصول شرع کے علاوہ احادیث نبوی بھی ہیں، ترمذی کی روایت ہے:" کل طلاق جائز الّا طلاق الصبی والمعتوہ" اور بخاری میں یہ الفاظ ہیں: "کل طلاق جائز الا المعتوہ" (بخاری مع حاشیہ السندی ج۳/ ۲۷۲) امام نسائی کی روایت میں ''معتوہ'' کی جگہ مجنون ہے، مجنون اور معتوہ دونوں اختلالِ عقل کے اعتبار سے تقریباً ایک ہیں، اس روایت میں مجنون کے ساتھ صغیر اور نائم کے بھی الفاظ ہیں:

"رفع القلم عن ثلاثہ عن النائم حتی یستیقظ وعن الصغیر حتی یکبر وعن المجنون حتی یعقل أو یفیق" (نسائی ۲/ ۸۵)

روایت کا مطلب یہ ہے کہ یہ تین اشخاص احکام شرعیہ سے بری ہوگئے، ایک سونے والا جب تک جاگ نہ جائے، دوسرا بچہ جب تک بالغ نہ ہوجائے، تیسرا پاگل جب تک صحیح العقل یا افاقہ نہ ہوجائے، ان محدثین کے علاوہ کئی اور محدثین نے یہ روایتیں نقل کی ہیں اور محدث الحاکم نے مذکورہ روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ میں بعض ایسے افراد پائے جاتے ہیں کہ شریعت اسلامی نے جن کے تصرفات کو اہلیت تصرف نہ پائے جانے کی وجہ سے معتبر نہیں مانا ہے۔ ذیل میں ہم ان میں سے چند کی ضروری تشریح اور ان کے تصرف طلاق کا حکم مختصراً درج کررہے ہیں:

بچہ یا نابالغ کی طلاق

اوپر یہ بات آچکی ہے کہ طلاق دینے والے کا بالغ ہونا ضروری ہے لہذا نابالغ کی طلاق اہلیت نہ پائے جانے کی وجہ سے واقع نہیں ہوگی اگرچہ وہ قریب البلوغ کیوں نہ ہو۔ اگر لڑکے نے صغرسنی کی حالت میں طلاق دی اور بلوغ کے بعد اس سابق طلاق کو بحال رکھا تب بھی وہ سابق طلاق واقع نہ ہوگی۔(بدائع الصنائع ۳/ ۹۹-۱۰۰)

نابالغ عقلمند کی طلاق

بعض لڑکے نابالغ ہونے کے باوجود عقلمند نظر آتے ہیں اور معاملات کرنے میں ہوشیار دکھتے ہیں تو کیا ان کی دی ہوئی طلاق واقع ہوگی؟

اس بارے میں جمہور فقہاء کی رائے یہی ہے کہ نابالغ اگرچہ عقل وتمیز رکھتا ہو اس کے باوجود اس کی دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ البتہ فقہاء حنابلہ عقل وتمیز رکھنے والے نابالغ لڑکے کی طلاق کو واقع قرار دیتے ہیں۔ اس مسئلہ پر عصر حاضر کے ماہر فقہ ڈاکٹر عبدالکریم زیدان نے تفصیلی گفتگو کی ہے اور جمہور کے قول کو راجح قرار دیتے ہوئے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ بعض بچوں میں عقل وتمیز کا ہونا اعتبار طلاق کے لئے کافی نہیں ہے، کیونکہ اس قسم کی صلاحیت کا کسی بچہ میں پایا جانا قلیل اور نادر ہے اور نادر پر احکام مبنی نہیں ہوتے بلکہ غالب پر ہوتے ہیں۔

پاگل کی طلاق

پاگل یا مجنون اس شخص کو کہتے ہیں جس کی عقل زائل ہوچکی ہو، فقہاء کے نزدیک مجنون اس شخص کو کہتے ہیں جس کی قوت تمیز جنون کے سبب مختل ہوجائے، اچھے اور برے میں فرق نہ کرسکے اور اپنے افعال کے انجام کو سمجھنے کی قوت نہ رہے، خواہ پیدائشی طور پر یا کسی آفت یا عارضہ کی بنا پر یہ پیدا ہوا ہو۔

فقہاء نے جنون کی دو قسمیں ذکر کی ہیں (۱) جنون مطبق (مسلسل) (۲) جنون غیر مطبق (غیر مسلسل)۔(بحرالرائق ۳/ ۸۹)

جنون مطبق کی حالت میں جوطلاق دی جائے وہ ابتداء ہی سے باطل اور کالعدم قرار پاتی ہے۔ کیونکہ اس حالت میں انسان اپنے مفادات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے، اس لئے اس کی دی ہوئی طلاق واقع نہ ہوگی، صاحب بدائع صراحت کرتے ہیں: " لأن العقل شرط التصرف" بدائع الصنائع ۹۹/۳۔ البتہ جنون غیر مطبق کی صورت میں جس وقت افاقہ ہو اس وقت کی دی ہوئی طلاق کا حکم ایک عاقل شخص کی طلاق کا ہوگا اور ایسی طلاق واقع ہوجائے گی، کیونکہ مجنون غیر مطبق کے تصرفات افاقہ کی حالت میں عاقل شخص کے تصرفات کے مانند ہیں:

"تصرفات المجنون غير المطبق فی حال افاقته كتصرف العاقل"(مجلة الأحكام العدلية ودفعه ۹۸۰)

ایسا پاگل جو مستقل پاگل نہ رہتا ہو افاقہ کی حالت میں اس کے تصرفات کا حکم وہی ہے جو ایک عقلمند انسان کے تصرفات کا ہوا کرتا ہے)۔

معلوم ہوا کہ غیر مطبق میں بوقت افاقہ تصرفات کی اہلیت موجود ہوتی ہے، اس لئے اہلیت پائے جانے کی بنا پر طلاق معتبر ہوگی۔

مغلوب العقل (معتوہ) کی طلاق

شرع اسلامی میں معتوہ اس شخص کو کہتے ہیں جو بے عقل ہو اور بے ربط باتیں کرتا ہو یعنی جو منہ میں آئے بک جائے۔ (فتح القدیر ۳۸/۳)

پیچھے یہ بات گذر چکی ہے کہ احادیث نبوی کی صراحت کے مطابق معتوہ کا تصرف بھی نافذ نہیں ہوتا۔ جمہور فقہاء نے یہ بات کہی ہے کہ معتوہ کی طلاق واقع نہیں ہوگی، البتہ بعض فقہاء نے یہ اضافہ کیا ہے کہ اگر معتوہ نے بحالت افاقہ طلاق کو کسی شرط پر معلق کیا ہو اور پھر دیوانہ ہوگیا اور بحالت دیوانگی وہ شرط پوری ہوگئی تو طلاق واقع ہوجائے گی۔ مثلاً اگر معتوہ نے افاقہ کی حالت میں بیوی سے یہ کہا کہ اگر تم میکہ گئی تو تم کو طلاق ہے پھر اس پر

جنون کی کیفیت طاری ہوئی اور بیوی اب میکہ گئی تو یہ طلاق واقع ہوجائے گی۔ (ردالمحتار ۴۳۷/۲-۴۳۸)

مغشیٰ (جس پر غشی طاری ہو) کی طلاق

غشی کی حالت میں محرک اور حسی قوتیں معطل ہوجاتی ہیں اور بے اختیار نیند کی مانند ہوتی ہے، جو بالعموم ضعف قلب کی وجہ سے طاری ہوتی ہے، ایسی حالت میں انسان کا دل ودماغ قابو میں نہیں رہتا ہے۔ اس لئے اس میں اہلیت تصرف نہیں ہوتی ہے اور ایسا شخص احکام شرع کا مکلّف نہیں ہوتا، اس لئے تمام فقہاء نے صراحت کی ہے کہ مغشیٰ جس پر غشی طاری ہو اس کی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ (بدائع الصنائع ۱۰۰/۳)

مدہوش کی طلاق

مدہوش وہ شخص کہلاتا ہے جس کی عقل جاتی رہے، فقہاء کے نزدیک مدہوش وہ شخص کہلاتا ہے جو کسی صدمہ، مصیبت یا اچانک حادثہ کے سبب عقل کھو بیٹھے۔ ظاہر بات ہے جب عقل زائل ہوجائے تو وہ تصرف شرعی کے لائق نہیں رہتا، لہذا اس کی دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ (بدائع الصنائع ۱۰۰/۳)

نائم (سوئے ہوئے) کی طلاق

سوئے ہوئے شخص کی بھی طلاق واقع نہیں ہوتی، جیسا کہ پیچھے روایت میں یہ تفصیل آچکی ہے کہ ایسے شخص کے تصرفات معتبر نہیں ہوتے ہیں۔

سرسام زدہ اور مغمیٰ علیہ کی طلاق

سرسام ایک قسم کی بیماری ہے جس میں انسان دیوانوں جیسی حرکت کرنے لگتا ہے فقہاء نے لکھا ہے کہ سرسام زدہ شخص کی طلاق واقع نہیں ہوتی ہے، کیونکہ اس کو صحیح العقل قرار نہیں دیا جاسکتا ہے اور اس کی حالت مجنون اور معتوہ کی سی ہوجاتی ہے، جس کی وجہ سے

تصرفات شرعی کی اہلیت ختم ہوجاتی ہے، لہذا اس حالت میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی ہے۔(بحرالرائق ۲/۲۶۸)

حالت نشہ کی طلاق

طلاق دینے کے لئے عقل وشعور اور بلوغ کی شرط رکھی گئی ہے، جس کے تحت مجنون، معتوہ یعنی فاتر العقل اور نابالغ کا ذکر آیا، اسی ضمن میں نشہ میں مبتلا شخص کے طلاق کی بحث آتی ہے، اور یہ سوال پیدا ہوتا رہتا ہے کہ اگر کوئی شخص نشہ کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو یہ طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

اس مسئلہ میں شرع اسلامی سے جو رہنمائی ملتی ہے ہم اس کا حاصل یہاں درج کریں گے لیکن اس سے قبل کیفیت نشہ کی تحدید اور اس کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔

نشہ کی تشریح

نشہ کے لئے عربی زبان میں ''سکر'' کا لفظ آتا ہے، فقہاء کے نزدیک سکر سے نشہ کی وہ کیفیت مراد ہے، جس میں نفع ونقصان کی تمیز نہ کی جاسکے اور جو شخص حالت نشہ میں ہوتا ہے اسے ''سکران'' کہتے ہیں، اور ایسے شخص کی دی ہوئی طلاق کو فقہاء ''طلاق السکر ان'' سے تعبیر کرتے ہیں، فقہاء حنفیہ نے ''سکران'' کی تعریف دو طرح سے بیان کی ہے ایک یہ ہے: "السکر ھو الذی لا یفرق بین الارض والسماء ولا بین الرجل والمرأۃ" (بحر الرائق ۲/۲۶۶) یعنی ''سکران'' وہ شخص ہے جو زمین وآسماں اور مرد وعورت کے درمیان کوئی فرق نہیں کرسکتا۔ دوسری تعریف، "السکر سرور یغلب علی العقل فیھذی فی کلامہ" (فتح القدیر ۳/۴۰) یعنی نشہ ایک سرور کا نام ہے جو عقل پر غالب آجائے اور وہ (شخص مخمور) اپنے کلام میں مغلوب العقل ہونے کی وجہ سے ہذیان بکنے لگے۔ پہلی تعریف امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب ہے اور دوسری صاحبین کی طرف اور ائمہ ثلاثہ کے اقوال صاحبین کی طرف منسوب تعریف کے مطابق ہیں اور یہی تعریف متأخرین علماء نے

بھی پسند کی ہیں۔(ردالمحتار ابن عابدین شامی، کتاب الطلاق ۲/۴۳۴)

حالت نشہ کی طلاق کا حکم

اس مسئلہ میں فقہاء احناف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حالت نشہ میں جو حرام شے سے ہو اور اپنی مرضی سے نشہ حاصل کرنے اور اس سے لذت اٹھانے کے لئے استعمال کیا گیا ہو، طلاق دئے جانے کی صورت میں طلاق واقع ہوجائے گی۔

علامہ کاسانیؒ نے لکھا ہے کہ اگر ''سکران'' (جو شخص نشہ میں ہو) نے اپنی زوجہ کو طلاق دی جبکہ نشہ کسی ممنوع شے سے ہوا ہو، مثلاً، شراب اپنی خواہش سے پی لی اور نشہ میں مبتلا ہوگیا اور اس کی عقل زائل ہوگئی اور اس حالت میں اس نے اپنی زوجہ کو طلاق دے دی تو عام علماء اور صحابہ کے نزدیک وہ طلاق واقع ہوجائے گی۔(بدائع الصنائع ۳/۱۸۳)

لیکن صحابہ میں حضرت عثمانؓ کے نزدیک حالت نشہ کی طلاق واقع نہیں ہوگی اور فقہاء احناف میں امام طحاویؒ اور امام کرخیؒ اسی کے قائل ہیں۔(بدائع الصنائع، ج ۳/۱۸۴)

امام مالکؒ کے نزدیک حالت نشہ کی دی ہوئی طلاق واقع نہ ہوگی، امام شافعیؒ کا بھی ایک قول یہی ہے، لیکن ان کا آخری قول یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ''طلاق سکران'' واقع ہوجاتی ہے، امام احمد بن حنبل کے نزدیک بھی بحالت نشہ طلاق واقع نہیں ہوتی بشرطیکہ وہ شخص نشہ میں اس قدر مبتلا ہو کہ نیک وبد میں تمیز نہ کرسکے۔

اس مسئلہ میں فقہاء کے کلام سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نشہ اگر حرام شے سے استعمال ہوا ہو اور اپنے اختیار سے برائے سرور وکیف استعمال کیا گیا ہو، تو عام فقہاء کے نزدیک طلاق واقع ہوجائے گی۔ البتہ بعض فقہاء اس بنا پر وقوع طلاق کے قائل نہیں ہیں کہ حالت نشہ میں جب عقل زائل ہوجائے اور اس کی وجہ سے وہ اپنے معاملات میں تصرف کا اہل نہ رہے تو اس کی دی ہوئی طلاق کا اعتبار نہیں ہوگا، لیکن اگر حرام شے کا استعمال جبراً کرایا گیا یا غلط فہمی میں خود استعمال کیا تو اس صورت میں تمام فقہاء کے نزدیک طلاق واقع نہیں ہوگی۔

ایک جائزہ

فقہاء کے اقوال و دلائل کا جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حالت نشہ کی طلاق کے وقوع کا سبب زجر وسزا ہے، جیسا کہ صاحب ہدایہ ودیگر فقہاء نے ذکر کیا ہے، اور اس حکم میں وہ عوامل کارفرما نظر آتے ہیں جو اس وقت مسلم معاشرہ پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ جیسا کہ علامہ شامی نے بزازیہ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔ نیز ابن نجیم مصری بزازیہ کا کلام ان الفاظ میں نقل بھی کرتے ہیں:

وفی البزازیه المختار فی زماننا لزوم الحد لان الفساق یجتمعون علیه۔

(البحر الرائق ۴۳۲/۳)

ہمارے زمانہ میں یہ ضروری ہے کہ شراب کے استعمال کی کثرت کو روکنا تھا، جس کو ایک سماجی ردعمل کہا جاسکتا ہے، ورنہ اختلاف صحابہ کی موجودگی میں حتمی طور پر بحالت نشہ طلاق واقع ہونے کا حکم کیوں کر لگایا جاسکتا ہے! اگر ہم اپنے دور بالخصوص موجودہ ہندوستانی معاشرہ کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت مخفی نہیں کہ اس طلاق کے واقع ہونے میں شوہروں کے بجائے عورتوں کی سزا ہوجاتی ہے اور بعض شوہر کسی دوسری جگہ جا کر شادی رچا کر عیش وعشرت کی زندگی گزارتے ہیں، اور بے چاری عورت بچوں کے ساتھ در در پھرتی اور کسمپرسی کی زندگی گزارتی ہے۔ اس لئے فی زماننا یہ ایک قابل غور مسئلہ ہے۔

بنیاد حکم

غور کا ایک گوشہ یہ بھی ہے کہ بنیاد حکم کو تلاش کیا جائے اس اعتبار سے بحالت نشہ طلاق واقع ہونے یا نہ ہونے کا دار ومدار اس حالت پر ہونا چاہئے جس میں طلاق کا فعل سرزد ہو۔ حالت اور کیفیت کے اعتبار سے امام ابوحنیفہؒ کا خیال ہے کہ وہ شخص نشہ کے سبب زمین وآسمان میں فرق نہ کر سکے جب کہ صاحبین کے نزدیک وہ شخص اس قدر نشہ میں ہو کہ اس کی عقل معطل ہوجائے اور ہذیان بکنے لگے۔ لہذا اس کیفیت وحالت کے پیش نظر

اگر نشہ ہلکا ہو اور وہ شخص اپنے افعال کے اثرات کو محسوس کر سکتا ہو تو طلاق نافذ قرار دینی چاہئے، لیکن اگر وہ نشہ سے اس قدر مست ہے کہ اسے گرد وپیش کا ہوش نہیں تو طلاق نہ ہونی چاہئے، لہذا بحالت نشہ مذکورہ بالا حالتوں میں دیکھنا چاہئے اور طلاق کے واقع قرار دیئے جانے کا فیصلہ معاملہ کی نوعیت اور نشہ کی حالت کے پیش نظر طے کیا جانا چاہئے۔

احناف میں امام طحاوی اور امام کرخی اسی نقطۂ نظر کے قائل ہیں اور یہ حضرات عقل ہی کو جو اہلیت کے شرائط میں سے ہے بنیاد بناتے ہیں، علامہ علاء الدین کاسانیؒ ان کی رائے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

وجه قولهم: "أن عقله زائل والعقل من شرائط اهلية التصرف لما ذكرنا، ولهذا لا يقع طلاق المجنون والصبى الذى لا يعقل والذى زال عقله بالبنج والدواء"۔ (بدائع الصنائع ۱۵۸/۳)

ان کے قول کی دلیل یہ ہے کہ نشہ میں مبتلاء شخص کی عقل ختم ہوجاتی ہے اور عقل اہلیت تصرف کی شرائط میں ایک شرط ہے، اس لئے مجنون اور ناسمجھ بچہ اور اس شخص کا حکم عقل بھانگ اور دواء سے زائل ہوجائے اس کی طلاق واقع نہیں ہوتی ہے۔

اس مسئلہ کو فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے بارھویں سیمینار بمقام دارالعلوم الاسلامیہ بستی میں غور وفکر کا موضوع بنایا ہے اور شرکاء سیمینار نے بحث ومباحثہ کے بعد درج ذیل تجویز پاس کی ہے: تجویز ۵: کسی شخص نے شراب یا کسی اور نشہ آور حرام چیز کا استعمال اپنی رضامندی سے جان بوجھ کر کیا اور اسے نشہ طاری ہوگیا، لیکن وہ نشہ کی ابتدائی حالت میں ہے جس میں ایک قسم کا سرور طاری ہوتا ہے، البتہ ہوش وحواس برقرار رہتا ہے اور انسان بات سمجھتا ہے، اسی حالت میں وہ اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے تو اس کی طلاق واقع ہوگی۔ تجویز ۶: اور اگر اس حالت میں اس کو شدید نشہ طاری ہوگیا، جس کی وجہ سے ہوش وحواس برقرار نہ رہا، بالکلیہ ہوش وحواس کھو بیٹھا اور اس حالت میں اس نے الفاظ طلاق استعمال کئے تو اس کی طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں شرکاء سیمینار دو رائے رکھتے ہیں: اکثر حضرات اس صورت

میں عدم وقوع کی رائے رکھتے ہیں۔

اس تجویز میں اگرچہ بحالت نشہ طلاق کے وقوع وعدم وقوع دنوں رائیں آئی ہیں، تاہم ارباب افتاء کے لئے اس مسئلہ سے دوچار لوگوں کے حالات اور ملکی قانون کے تناظر میں رائے قائم کرنا اور فتوی دینا کافی آسان ہوگیا ہے اور احناف کے لئے اپنے مسلک کے دائرہ میں رہ کر بھی فتویٰ دینے کی گنجائش نکلتی ہے۔ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

طلاق مکرہ (مجبور شخص کی طلاق)

شرائط طلاق میں ایک شرط جمہور فقہاء کے نزدیک یہ ہے کہ طلاق دینے والا مختار ہو، مجبور نہ ہو، فقہاء احناف وقوع طلاق کے لئے اختیار کو شرط قرار نہیں دیتے اور حالت اکراہ کی طلاق کو واقع سمجھتے ہیں۔

اکراہ کی وضاحت

اکراہ کیا ہے؟ اور فقہاء کرام نے اس بارے میں کیا کچھ فرمایا ہے؟ یہاں اس کی تشریح اختصاراً صحیح اور ضروری معلوم ہوتی ہے، فقہاء نے اکراہ (جبر) کی تعریف یوں کی ہے کہ جبر کسی شخص کا وہ قول یا فعل ہے جو دوسرے شخص کو اس کی خواہش کے خلاف اس فعل کے کرنے پر مجبور کرے جس کا جبر کرنے والا خواہشمند ہے، علامہ کاسانیؒ نے بدائع الصنائع میں اکراہ، اس کی اقسام اور نتائج پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اکراہ کی دو قسمیں ہیں (۱) اکراہ تام (۲) دوسری اکراہ ناقص۔

(۱) اکراہ تام وہ ہے جس میں انسان مضطر اور مجبور ہوجاتا ہے اور نتیجۃً اس کی رضامندی معدوم اور اختیار سلب ہوجاتا ہے مثلاً قتل یا جسم کے کسی عضو کے قطع کی دھمکی یا ایسی مار کی دھمکی جس سے جان جانے کا خطرہ ہو۔ اکراہ تام کو (اکراہ ملجئ) بھی کہتے ہیں۔

(۲) اور اکراہ ناقص وہ ہے جس میں صرف رضا معدوم ہوتی ہے اور اختیار فاسد ہوجاتا ہے نہ کہ معدوم۔ مثلاً ایسی دھمکی دی گئی ہو جس سے جان جانے یا جسم کے کسی عضو

کے ضائع ہونے کا کوئی اندیشہ نہ ہو مثلاً قید وغیرہ۔ فقہاء اس کو اکراہ غیر ملجئ بھی کہتے ہیں۔ اکراہ علی الطلاق بحث کرتے ہوئے امام کاسانیؒ لکھتے ہیں، طلاق کا تعلق ان امور سے ہے جن کے انعقاد کے لئے ''رضا'' کی ضرورت نہیں اور اکراہ کی صورت میں جو کچھ لازم آتا ہے، وہ یہ ہے کہ ''مکرہ'' (شخص مجبور) کی رضا معدوم ہوجاتی ہے، لیکن ''رضا'' کے معدوم ہونے سے وقوع طلاق پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ بدائع الصنائع ۱۸۲/۷

چنانچہ فقہاء احناف کے نزدیک طلاق مکرہ واقع ہوجاتی ہے خواہ شوہر مجبور ہو، کیونکہ ان کے نزدیک اختیار طلاق واقع ہونے کے لئے شرط کی حیثیت نہیں رکھتا۔ امام کاسانیؒ فرماتے ہیں:

"أما كون الزوج طائعاً فليس بشرطٍ عند اصحابنا وعند الشافعیؒ شرط حتى يقع طلاق المكره عندنا وعنده لا يقع" (بدائع الصنائع ۱۶۰/۳)

مشہور فقیہ علاّمہ برہان الدین المرغینانیؒ طلاق مکرہ کا حکم بیان کرنے کے بعد اس کی دلیل ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں: "ولنا أنه قصد ايقاع الطلاق فی منكوحته فی حال اهليته فلا يعرى عن قضيه دفعا لحاجته اعتباراً بالطائع" (ہماری دلیل یہ ہے کہ مکرہ نے اپنی منکوحہ کو طلاق دینے کا ارادہ اہلیت کی حالت میں کیا ہے جو حکم سے خالی نہیں اور اس نے ایسا اپنی ضرورت یعنی جان گنوانے یا عضو ضائع ہونے سے بچانے کے پیش نظر کیا ہے)۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی خوش دلی سے طلاق دے۔ علامہ موصوف اس دلیل کی معقولیت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "وهذا لانه عرف الشرين واختاراً هو نهما وهذا آية القصد والاختيار الّا أنه غير راض بحكمه وذلك غير مخل به كالهازل" (هدايه ج۲/ ص ۳۵۸)

یعنی مکرہ یہ طلاق اس لئے دے رہا ہے اس کے سامنے دو مصیبتیں ہیں اور اس نے ان میں سے جو ہلکی مصیبت ہے اس کو اختیار کیا اور یہ قصد واختیار کی علامت ہے، البتہ وہ اپنے اس فیصلہ سے راضی نہیں ہے اور راضی نہ ہونا حکم کے نفاذ میں اثر انداز نہیں ہوگا اور یہ

ایسا ہی ہے جیسے کوئی تفریح ومذاق میں اپنی بیوی کوطلاق دے دے تو وہ نافذ ہوجاتی ہے گو کہ وہ راضی نہ ہو۔(ھدایہ۲/۳۵۸)

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین میں اتفاق رائے پایا جاتا ہے لیکن امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک طلاق مکرہ واقع نہیں ہوتی۔ مالکیہ کی کتاب شرح الخرشی میں صراحت ہے: "امامن اکرہ علی الطلاق فلا یلزمہٗ شئ"(شرح الخرشی ۱۸٤/۳)

جن کوطلاق دینے پر مجبور کردیا جائے تو اس پے کوئی حکم لازم نہیں ہوگا۔

شوافع کی مستند کتاب مغنی المحتاج میں ہے:"ولا یقع طلاق مکرہ"(مغنی المحتاج ۲۸۹/۳)

ابن قدامہ حنبلیؒ لکھتے ہیں:''ومن اکرہ علی الطلاق لم یلزمہ" (المغنی ۲۵۹/۸)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مکرہ (شخص مجبور) کی دی ہوئی طلاق حنفیہ کے نزدیک واقع ہوجائے گی لیکن ائمہ ثلاثہ کے نزدیک طلاق واقع نہیں ہوگی۔ البتہ امام مالک اور امام احمد بن حنبلؒ نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ طلاق مکرہ اس صورت میں واقع نہیں ہوگی جبکہ شخص مجبور پر اکراہ ناحق ہو لیکن اگر طلاق سے کوئی شرعی حق متعلق ہو اور اس وجہ سے اس پر جبر کیا گیا تو ایسی صورت میں طلاق مکرہ واقع ہوجائے گی، مثلاً ایک شخص نے اپنی زوجہ سے ایلاء کیا اور اس کی مدت انتظار گزر گئی، شرعاً شوہر کو طلاق دینی چاہیئے لیکن اگر وہ طلاق نہیں دیتا اور ایسی صورت میں حاکم نے اس شوہر پر جبر کر کے طلاق دلوائی تو طلاق واقع ہوجائے گی، جیسا کہ ابن قدامہ المقدسی نے المغنی ۱۱۸/۷ میں اس کو بیان کیا ہے۔

مکرہ کا اقرار طلاق

تاہم تمام فقہاء اس بارے میں متفق ہیں کہ مکرہ کا اقرار طلاق (کہ اس شخص نے اپنی

بیوی کوطلاق دی ہے) خواہ زبانی ہو یا تحریری جو بالجبر حاصل کیا گیا ہو غیر نافذ ہوگا، کیونکہ فی الحقیقت اس نے اپنی بیوی کوطلاق نہیں دی ہے جبکہ وہ جبر کے زیر اثر ایک غلط بات کہہ رہا ہے۔ علامہ ابن نجیم مصری نے بحرالرائق میں لکھا ہے کہ اس صورت میں عدم وقوع طلاق دیانۃً یعنی مابین بندہ اور اس کے خدا ہوگا لیکن قضاءً واقع ہونے کا حکم دیا جائے گا۔ (البحرالرائق ۲٦٤/۳)

بالاکراہ تحریری طلاق

ہمارے ملک میں بسا اوقات بعض سنگین حالات میں عورت اور اس کے گھر والے عورت کے شوہر سے بالجبر تحریری طور پر طلاق حاصل کرتے ہیں، اس سلسلہ میں مختلف قسم کے دباؤ سے کام لیتے ہیں، جو جبر واکراہ کے درجہ میں ہوتا ہے، کیا اس سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ اس بارے میں بھی تمام ائمہ فقہ اس پر متفق ہیں کہ جو طلاق جبراً تحریر کرائی جائے، وہ واقع نہیں ہوگی، جیسا کہ علامہ ابن عابدین شامی اور ابن نجیم مصری نے صراحت کی ہے۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار ۴۳۲/۲، بحرالرائق ۲٦٤/۳)

ان حضرات ائمہ کی دلیل یہ ہے کہ تحریری طلاق زبانی طلاق کے مقابلہ میں ضرورۃً جائز ہے، اور چونکہ یہاں ضرورت نہ تھی اس لئے طلاق جائز نہیں۔ جب فقہاء کے نزدیک بلاضرورت تحریر سے طلاق واقع نہیں ہوتی ہے تو جو طلاق جبراً تحریر کرائی جائے، وہ بدرجہ اولیٰ واقع نہ ہوگی۔ اسی زمرہ میں وہ صورت بھی آئے گی جب کہ عورت کے شوہر سے تحریر شدہ طلاق نامہ پر جبراً دستخط کرایا جائے۔

محل طلاق

طلاق دینے کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ مرد طلاق کا اہل ہو، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جس عورت کو طلاق دی جائے وہ طلاق کی محل ہو، یعنی اس پر شرعاً طلاق واقع کی جاسکتی ہو، اس لئے فقہاء نے بطور شرط یہ بات کہی ہے کہ طلاق چونکہ اس رشتہ کو ختم

کردینے کا نام ہے جو نکاح کے ذریعہ قائم ہوتا ہے، اس لئے عورت کا محل طلاق ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ طلاق دینے والے کی منکوحہ ہو یا طلاق رجعی یا ایک یا دو طلاق بائن کی عدت میں ہو، یہی وجہ ہے کہ اجنبی عورت یا وہ مطلقہ جس کی عدت ختم ہو چکی ہو یا مطلقہ مغلظہ طلاق کا محل نہیں ہے، اور انہیں طلاق دینے سے واقع نہیں ہوگی۔ (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ج۷/ ۶۸۸۸)

لیکن عورت پر طلاق واقع ہونے کے لئے اس کا اس طرح عاقل و بالغ ہونا شرط نہیں ہے، جس طرح مرد کی اہلیت طلاق کے لئے بلوغ اور عقل شرط ہے، لہذا اگر زوجہ نابالغ یا مجنون ہونے کی حالت میں ہو تو اس صورت میں بھی طلاق دی جاسکتی ہے، اور دینے سے واقع بھی ہو جائے گی۔

یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اہلیت طلاق کے متعلق مرد و عورت کے درمیان فرق کیا گیا ہے، کیونکہ طلاق مرد کے قول و فعل سے واقع کی جاتی ہے جس کے لئے عاقل اور بالغ ہونا ضروری ہے۔ اور عورت خود طلاق دیتی نہیں بلکہ اس پر واقع کی جاتی ہے اور واقع ہونے کے لئے عقل و بلوغ شرط نہیں ہے، البتہ تفویض طلاق کی صورت میں عورت اگر خود طلاق دے تو عورت چونکہ اس فعل میں خود مختار ہوتی ہے، ایسی صورت میں عورت کا عاقل و بالغ ہونا ضروری ہے۔

شہادت طلاق

طلاق دینے کے لئے کیا شہادت یعنی دو مسلم مرد گواہوں کا ہونا ضروری ہے یا بغیر شہادت کے بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے؟ یہ سوال موجودہ دور میں دو وجہوں سے اہم ہو جاتا ہے، ایک تو عصر حاضر میں اسلام کے عائلی قانون پر جانب دارانہ مطالعہ کرنے والوں اور نظام طلاق پر بے جا تنقید کرنے والوں کی وجہ سے، دوسری خود طلاق دینے والوں کی ناواقفیت اور اس سے زیادہ ان کی دینی کمزوری کی وجہ سے۔ یہ چیز بارہا دیکھی جاتی ہے کہ بعض لوگ

اپنے مفاد کی خاطر بیوی کو واقف کرائے بغیر اچانک طلاق نامہ بذریعہ عدالت بھیج دیتے ہیں، جس سے فریق مخالف (عورت) کا مفاد متأثر ہوتا ہے اور اس صورتحال سے دوچار فریق شہادت کا مطالبہ کرتا ہے، دوسری طرف اس قسم کے واقعات سے اسلامی شریعت سے پرخاش رکھنے والے ناجائز فائدے اٹھاتے رہتے ہیں۔ اس پس منظر میں یہ پہلو قابل توجہ ہو جاتا ہے کہ کیا نکاح کی طرح طلاق کے لئے بھی شہادت ضروری ہے یا نہیں؟

اس بارے میں شرع اسلامی کا رخ یہ ہے کہ طلاق واقع کرنے کے لئے شہادت نکاح کی طرح شرط یا وجوب کا درجہ نہیں رکھتی بلکہ اس کی حیثیت استحباب کی ہے، چنانچہ قرآن حکیم میں جہاں اللہ تعالیٰ نے طلاق کے احکام بیان فرمائے ہیں وہیں اس ضمن میں یہ آیت بھی آتی ہے: "واَشهدوا ذوی عدلٍ منکم وأقیموا الشهادة للّٰه" (سورۃ الطلاق: ۲)۔ (اور گواہ بنالو اپنے میں سے دو صاحبان عقل کو اور قائم کرو شہادت اللہ کے واسطہ)۔ اس آیت کے بارے میں جمہور مفسرین کی رائے ہے کہ طلاق اور رجعت دونوں موقعوں پر شہادت کا حکم دیا گیا ہے اور یہ حکم استحبابی درجہ کا ہے، جیسا کہ صاحب تفسیر کبیر امام رازی اور امام قرطبی صاحب جامع احکام القرآن اور صاحب تفسیر ابن کثیر وغیرہ نے لکھا ہے۔ آثار صحابہ و تابعین سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، ابن ماجہؒ نے اپنی سنن میں یہ روایت نقل فرمائی ہے:

حضرت عمران بن الحصین سے ایک شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا، جس نے اپنی زوجہ کو طلاق دی تھی، پھر اس سے رجوع کیا اور اس کی طلاق پر کوئی شہادت قائم نہ کی اور نہ ہی اس کی رجعت پر، پس حضرت عمران نے اس شخص سے کہا کہ تم نے خلاف سنت طلاق دی اور خلاف سنت رجوع کیا، اس کی طلاق اور رجعت پر شہادت قائم کرو۔

"عن عمران بن الحصین سئل عن رجل یطلق امراتهٗ ثم یقع بها ولم یشهد علی طلاقها ولا علی رجعتها فقال عمران: طلقت بغیر سنة وراجعت بغیر سنة، اشهد علی طلاقها وعلی رجعتها" (سنن ابن ماجہ ص/۱۴۶)

اس روایت کے پیش نظر تمام ائمہ وفقہاء اہل سنت والجماعت متفق ہیں کہ طلاق ورجعت میں شہادت سنت اور مستحب ہے۔

البتہ اصحاب ظواہر اور فقہاء شیعہ میں جعفریہ ایقاع طلاق کے لئے طلاق دیتے وقت دو عادل گواہوں کی موجودگی کو ضروری اور شرط قرار دیا ہے۔

موجودہ دور کے حالات اور واقعات کے پیش نظر جو سوالات پیدا ہوتے ہیں اس کا جائزہ لے کر مشہور اسلامی قانون داں ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن نے اس سلسلہ میں بہت ہی نکتہ کی بات کہی ہے اور تشفی بخش جواب بھی دیا ہے:

''اصل شہادت طلاق اگر نزاع وانکار کی دلیل کے سبب واجب قرار دی جائے اور اس کو قانون طلاق کا ایک جزء تسلیم کیا جائے تو شہادت کے لزوم کو دوسرے معاملات انقطاع معاہدہ سے متعلق بھی ایک جزء اصلی کی حیثیت سے تسلیم کرنا پڑے گا، جبکہ انقطاع معاہدہ کے لیے شہادت کسی کے نزدیک شرط نہیں، دعویٰ کے اثبات کے لئے ہے بجزء چند استثنائی صورتوں کے، شہادت ایک قاعدہ کی حیثیت سے تسلیم کی جاتی ہے نہ کہ اصل قانون کی حیثیت میں اس کے ایک جزء اصلی کے طور پر۔ (مجموعہ قوانین اسلامی جلد دوم ص ۳۹۱، ۳۹۲ دفعہ نمبر ۱۰۱)

مذکورہ تفصیلات سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ طلاق واقع کرنے کے لئے شہادت کی حیثیت شرط یا واجب کی نہیں ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ سنت اور مستحب کی ہے اور بلاشبہ بعض واقعات میں اس لحاظ سے معاملہ کو سلجھانے میں بے حد مفید ہے۔

اقسام طلاق:

طلاق کی مختلف اعتبار سے مختلف قسمیں ہیں، ذیل میں ہم ان تمام قسموں کو درج کر رہے ہیں:

(الف) باعتبار کیفیت طلاق کی قسمیں:

کیفیت کے اعتبار سے طلاق کی دو قسمیں ہیں: (۱) طلاق سنت یا مسنون (۲) طلاق بدعی یا غیر مسنون

(ب) باعتبار تاثیر طلاق کی قسمیں:

باعتبار تاثیر اس کی تین قسمیں ہیں: (۱) طلاق رجعی (۲) طلاق بائن صغری (۳) طلاق مغلظہ یا بائن کبریٰ۔

ہر ایک کی تفصیل ذیل میں ملاحظہ کریں:

(۱) طلاق سنت یا مسنون: طلاق سنت کا مطلب یہ ہے کہ اس طریقے سے دی جائے جس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دینے کی ہدایت فرمائی ہے یہاں سنت یا مسنون کا مطلب یہ نہیں ہے کہ طلاق دینا مسنون اور کار ثواب ہے، بلکہ طلاق دینا نہ موجب عبادت ہے اور نہ ہی باعث ثواب۔ بلکہ جس طریقہ طلاق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے پسند فرمایا ہے اس کے لئے سنت کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

(۲) طلاق بدعی: اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقہ کے خلاف طلاق دی گئی تو وہ طلاق بدعی یا غیر مسنون کہی جائے گی اور یہ طریقہ طلاق موجب گناہ ہوگا۔

طلاق سنت کی اقسام

احناف کے نزدیک طلاق سنت دینے کے دو طریقے ہیں، اس لحاظ سے اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) طلاق احسن (۲) طلاق حسن

(۱) طلاق احسن (طلاق احسن وقت کے اعتبار سے طلاق سنت کی پہلی قسم ہے)

طلاق احسن یہ ہے کہ شوہر اپنی زوجہ مدخولہ کو ایسے طہر (حیض سے پاک ہو جانے کے بعد کا زمانہ) میں جس میں اس سے صحبت نہ کی ہو اور نہ کوئی طلاق دی ہو اور نہ اس طہر

سے قبل حیض میں طلاق دی ہو، ایک طلاق رجعی دے، پھر اس کو چھوڑ دے، یہاں تک کہ اس کی عدت گذر جائے یا اگر حاملہ ہوتو وضع حمل ہوجائے۔ صاحب بدائع الصنائع امام کاسانیؒ فرماتے ہیں:

”أحسن الطلاق ذوات القرء أن يطلقها طلقة واحدة رجعية فى طهر لا جماع فيه ولا طلاق ولا فى حيضةطلاق ولا جماع ويتركها حتى تنقضى عدتها ثلاث حيضات“ وان كانت حرة وإن كانت أمة حيضتان ۔(بدائع الصنائع جلد ١٨٦/٤)

علّامہ کاسانیؒ نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ طلاق احسن کی بنیاد ابراہیم نخعیؒ کی اس روایت پر ہے کہ صحابہ کرام اس طلاق کو پسند فرماتے تھے کہ عورت کو ایک طلاق دی جائے پھر اس کو چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ تین حیض آ جائیں۔

والأصل فيه ماروى عن ابراهيم النخعى أنه قال كان أصحاب رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم يستحسنون على أن لا يطلقوا للسنة الا واحدة ثم لا يطلقوا غير ذلك حتى تنقضى العدة، (بدائع الصنائع ١٨٦/٤)۔

علّامہ زیلعیؒ کی ”الدرایۃ فی تخریج احادیث الھدایۃ“ میں مزید صراحت ہے:

”روى أن الصحابة كانوا يستحبون أن لا يزيدوا فى الطلاق علىٰ واحدة حتى تنقضى العدة ابن أبى شبيه باسناد صحيح عن ابراهيم كانوا يستحبون أن يطلقها واحدة ثم يتركها حتى تحيض ثلاث حيض “ (الدراية فى تخريج احاديث الهداية علىٰ هامش الهداية ٢/ ٣٥٤)۔

صحابہ کرامؓ یہ پسند فرماتے تھے کہ ایک سے زائد طلاق نہ دی جائے یہاں تک کہ عدت گذر جائے، ابن شیبہ صحیح سند کے ساتھ حضرت ابراہیم سے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ پسند فرماتے تھے کہ ایک طلاق دی جائے پھر بیوی کو اسی حال میں رہنے دے تا کہ آنکہ تین حیض گذر جائے۔(الدرایہ فی تخریج احادیث الھدایہ علی ھامش الھدایہ ج ۲ ص ۳۵۴)

(۲) طلاق حسن:

طلاق سنت کی دوسری قسم طلاق حسن ہے، اور وہ یہ ہے کہ شوہر اپنی زوجہ مدخولہ کو ایسے طہر میں جس میں اس سے صحبت نہ کی ہو ایک رجعی طلاق دے۔ پھر دوسرے طہر میں دوسری اور تیسرے طہر میں تیسری طلاق دے۔ اس حساب سے تین الگ الگ طہر میں تین طلاقیں مکمل ہوں گی۔

امام کاسانیؒ کی عبارت ہے:

وامّاالحسن فى الحرة التى هى ذات القرء أن يطلقها ثلاثا فى ثلاثة أطهار لا جماع فيها (بدائع الصنائع ١٨٧/٤)

طلاق حسن کے سلسلہ میں امام مالک کا نظریہ

عام طور پر فقہاء نے تین طہر میں تین طلاقوں کو حسن کہا ہے اور طلاق احسن اور حسن دونوں کو سنت کے دائرہ میں رکھا ہے، لیکن امام مالکؒ نے اس سے اختلاف کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ ہر طہر میں ایک ایک طلاق دینا طلاق سنت کے دائرہ میں نہیں آتا بلکہ یہ طلاق بدعت میں داخل ہے، طلاق سنت صرف یہی ہے کہ شوہر ایک طلاق دے، کیونکہ طلاق اصلاً ممنوع ہے اور صرف ضرورت کی بنا پر عورت سے چھٹکارا پانے کے لئے جائز کی گئی ہے اور یہ مقصد ایک طلاق سے پورا ہوجاتا ہے، چنانچہ ان کے نزدیک سنت طلاق اس طرح ہوگی کہ شوہر اپنی بیوی کو ایسے طہر میں جس میں جماع نہ کیا ہو ایک طلاق رجعی دے اور عورت کو تین حیض کی عدت گزرنے تک چھوڑ دے اور اس دوران مزید کوئی طلاق نہ دے، امام مالک نے یہ بھی صراحت فرمائی ہے کہ سنت طلاق کے لئے ضروری ہے کہ عدت کے اندر دوسری طلاق نہ دی جائے، کیوں کہ دوسرے اور تیسرے طہر میں دوسری اور تیسری طلاق بلاحاجت ہونے کے سبب مکروہ ہے اسی طرح ان کے نزدیک ایک ساتھ تین طلاقوں کا دینا بھی مکروہ ہے اور خلاف سنت ہے، امام کاسانیؒ لکھتے ہیں:

"وقال مالك لا أعرف طلاق السنة الا أن يطلقها واحدة ويتركها حتى تنقضى عدتها"

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ میں طلاق سنت صرف اس کو سمجھتا ہوں کہ ایک طلاق دی جائے اور بیوی کو اسی حال میں چھوڑ دیا جائے تا کہ عدت گزر جائے۔

"وجه قوله إن الطلاق المسنون هو الطلاق لحاجة والحاجة تندفع بالطلقة الواحدة فكانت الثانية والثالثة فى الطهر الثانى والثالث تطليقاً من غير حاجة فيكره لهذا أكره الجمع كذا التفريق اذ كل ذلك طلاق من غير حاجة" (بدائع الصنائع ٤/ ١٨٧)

مطلب یہ ہے کہ طلاق مسنون وہ طلاق ہے جو ضرورت کی بنا پر دی جائے اور ضرورت ایک طلاق سے پوری ہوجاتی ہے، لہذا دوسری اور تیسری طلاق دوسرے اور تیسرے طہر میں بلاضرورت ہے جو مکروہ ہے، خواہ ایک ساتھ تینوں دی جائے یا الگ الگ طہروں میں کیونکہ یہ بلاضرورت ہے۔

طلاق حسن کے طلاق سنت ہونے کے بارے میں احناف کی دلیل

طلاق احسن کے طلاق سنت ہونے میں ائمہ فقہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، البتہ طلاق حسن کے طلاق سنت ہونے میں امام مالک کا اختلاف پایا جاتا ہے جیسا کہ اوپر اختلاف اور ان کی دلیل ذکر کی گئی ہے۔ احناف اور جمہور فقہاء نے سورۃ طلاق کی اس آیت "فطلقوا هن لعدتهن" کو اپنی دلیل کی بنیاد بنایا ہے، اور یہ وضاحت فرمائی ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ طلاق عدت کے واسطہ ہے، یعنی تین طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں، احناف اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبداللہ ابن عمر کا واقعہ بطور استدلال پیش کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دی، اس بارے میں حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا آپ نے کچھ غصہ کا اظہار کرتے ہوئے

فرمایا کہ عبداللہ نے سنت کی خلاف ورزی کی ہے جیسا کہ تمہارے رب نے حکم دیا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: "من السنة أن تستقبل الطهر استقبالاً فتطلقها لكل طهر تطليقة فتلك العدة التى أمر الله تعالىٰ أن يطلق لها النساء" یعنی مسنون طلاق اس طرح ہوتی ہے کہ تم ہر طہر میں ایک طلاق دو۔ علامہ کاسانیؒ نے احناف کی اس دلیل کو اپنی کتاب بدائع الصنائع ۱۸۸/۴ میں قدرے تفصیل کے بیان فرمایا ہے۔

امام شافعیؒ کا نظریہ

یہاں یہ بیان کرنا فائدہ سے خالی نہیں کہ امام شافعیؒ کے نزدیک بیک وقت تین طلاق بھی سنت طلاق ہیں، جبکہ احناف اور امام مالکؒ کے نزدیک بیک وقت تین طلاقیں سنت نہیں کہلائی جاسکتیں۔ امام شافعیؒ حدیث ملاعنہ سے استدلال کرتے ہیں کہ عویمر بن اشقر العجلانی نے اپنی بیوی کو لعان کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیک وقت تین طلاقیں دیں۔ اگر تین طلاقیں سنت نہ ہوتیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت خاموش نہ رہتے بلکہ اسی وقت عویمر العجلانی سے فرماتے کہ طلاق دینے کا یہ طریقہ درست نہیں۔ امام ابن رشد مالکی نے یہ رائے بدایۃ المجتہد میں ذکر کی ہے، لیکن علامہ کاسانیؒ اپنی کتاب بدائع الصنائع میں ذکر کرتے ہیں کہ امام شافعیؒ بیک وقت تین طلاقوں کو نہ طلاق سنت کہتے ہیں اور نہ ہی بدعت بلکہ مباح خیال کرتے ہیں، موصوف لکھتے ہیں:

قال الشافعىؒ لا اعرف فى عدد الطلاق سنة ولا بدعة بل هو مباح، (بدائع الصنائع ٤/ ١٨٩)

طلاق بدعی اور اس کی اقسام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق کا جو طریقہ بتایا ہے اس کے خلاف طریقہ پر طلاق دی جائے تو وہ طلاق بدعی کہلاتی ہے، جس کو غیر مسنون طلاق بھی کہتے ہیں۔ اور یہ باعث گناہ ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) باعتبار وقت (۲) باعتبار تعداد

(۱) باعتبار وقت : اگر ایسے وقت میں طلاق رجعی دی جائے، جس میں عورت کو حیض آ رہا ہو تو ایسی طلاق بدعی کہلائے گی۔ ایسی صورت میں مرد کو چاہئیے کہ وہ رجوع کرے۔ علامہ برہان الدین مرغینانیؒ اپنی مشہور کتاب ہدایہ میں لکھتے ہیں کہ جو طلاق حالت حیض میں دی جائے اس میں رجوع واجب ہے تا کہ امر کے حقیقی معنی یعنی وجوب پر عمل ہو جائے اور حتی الامکان گناہ سے بچا جا سکے ۔ اور عورت کو بھی طویل عدت سے ضرر نہ پہونچے ۔

والاصح أنه واجب عملاً بحقيقة الامر ورفعاً للمعصية بالقدر الممكن برفع اثره وهى العدة ودفعاً لضرر تطويل العدة۔ (هدايه ۳۵۷/۲)۔

اس وجوب کا ثبوت اس روایت سے ملتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دی اور اس بارے میں حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: اپنے بیٹے (عبداللہ) کو حکم دو کہ وہ رجوع کرے:

"مر ابنك فليراجعها وقد طلقها فى حالة الحيض" "عن عبد الله بن عمرؓ أنه طلق امرأته وهى حائض فى عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال مرهُ فليراجعها"(مؤطا لامام محمد باب طلاق السنة ص: ۲۵۰)

یہ روایت صحیحین و دیگر کتب صحاح میں بھی موجود ہے۔ حیض کی حالت میں طلاق دینا اس مصلحت کی بنا پر غیر مسنون ہے کہ اس وقت مرد کو عورت کی جانب طبعًا رغبت نہیں ہوتی، علاوہ ازیں اس میں عدت کا زمانہ بڑھ جاتا ہے، کیوں کہ جس حیض میں طلاق دی جاتی ہے وہ حیض عدت میں شمار نہیں ہوتا اور عورت کو بے جا زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔ امام کاسانیؒ اس حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ولأن فيه تطويل العدة عليها لأن الحيضة التى صادفها الطلاق فيه غير محسوبة من العدة فتطول العدة عليها وذلك اضرار بها ولان الطلاق للحاجةوهو فى زمان كمال الرغبة وزمان الحيض زمان النفرة فلا يكون

الاقدام عليه (الطلاق) فيه دليل الحاجة الىٰ الطلاق فلا يكون الطلاق فيه سنة بل يكون سفهاً" (بدائع الصنائع ۳ / ۹۴)

اسلئے کہ اس میں عورت پر عدت طویل ہو جاتی ہے، کیوں کہ جس حیض میں طلاق ہوئی ہے عدت میں اس کا شمار نہیں ہوتا ہے، لہذا عورت پر عدت طویل ہو جاتی ہے اور عورت کے لئے یہ نقصان دہ ہے، دوسری بات یہ ہے کہ طلاق ضرورت کی بنا پر دی جاتی ہے اور اسکی ضرورت کمال رغبت کے زمانہ میں پڑتی ہے اور حیض تنفر کا زمانہ ہوتا ہے اور اس میں طلاق پر اقدام پر بنائے ضرورت نہیں ہوگا لہذا اس میں طلاق سنت نہیں ہوگی بلکہ نادانی ہوگی۔ (بدائع الصنائع ۹۴/۳)

اسی طرح وقت کے اعتبار سے وہ طلاق بھی غیر مسنون اور بدعی کہلائے گی جبکہ مرد اپنی بیوی کو ایسے طہر میں (زمانہ پاکی میں) طلاق دے جس میں وہ اپنی بیوی سے صحبت کر چکا ہو۔ ایسی طلاق اس بنا پر خلاف سنت ہے کہ ممکن ہے کہ عورت حاملہ ہو جائے جس کے سبب عورت کو زیادہ عرصہ (وضع حمل تک) عدت گذارنا پڑے۔ دکتور عبدالکریم زیدان اس کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"الحكمة فى ذلك أنه اذا جامعها وهى طاهر، فلا يأمن الزوج من أنها قد حبلت بهذا الجماع فاذا طلقها ثم استبان حملها فقد يندم علىٰ ذلك لانهٗ ما كان يقدم على طلاقها لو علم أنها حامل رعايةً لحملها وايضاً طلاقها بعد وطئها مع احتمال حبلها بهذه الوطئة يجعل الزوج والزوجة فى شك من عدتها أتكون بوضع الحمل اذا تبين انها حامل أم تكون عدتها بثلاثة قروء اذا لم تكن حاملاً" (المفصل فى أحكام المرأة للدكتور زيدان ۴۳۷/۷)

طلاق بدعی کی مذکورہ شکلیں خواہ حالت حیض میں دی ہوئی طلاق ہو یا حالت طہر میں لیکن اس میں صحبت کے بعد طلاق دی گئی ہو اگر چہ غیر مسنون اور بدعی ہوں اس کے باوجود ائمہ اربعہ کے نزدیک واقع ہو جائے گی اور اس قسم کی طلاق دینے والا مرد گنہگار ہوگا۔

علامہ کاسانیؒ طلاق بدعی کا حکم ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

"واما حكم الطلاق البدعة فهو أنه واقع عند عامة العلماء"۔(بدائع الصنائع ۱۵۳/۳)

ابن قدامہ حنبلیؒ لکھتے ہیں:

"فان طلقها للبدعة وهو أن يطلقها حائضاً أو فى طهر أصابها فيه أثم ووقع طلاقه فى قول عامة اهل العلم"۔(المغنى ۹۹/۷)

صاحب مجمع البحرین نے لکھا ہے کہ حالت حیض میں مدخولہ کو طلاق دینا مکروہ وممنوع ہے، جبکہ غیر مدخولہ کو حالت حیض میں طلاق دینا بلا کسی کراہت کے جائز ہے، کیونکہ غیر مدخولہ پر عدت واجب نہیں ہے اور کراہت یا ممانعت عدت طویل ہونے اور عورت کو زحمت میں ڈالنے کی وجہ سے ہے، جس سے غیر مدخولہ کو واسطہ نہیں پڑتا۔(مجمع البحرین لابن الساعاتی، کتاب الطلاق ص۹، مجمع الانھر ۳۸۱/۱-۳۸۳)

(۲) باعتبار عدد:

ایک طہر میں ایک طلاق دینے کے بجائے ایک ہی طہر میں بیک وقت دو یا تین طلاقیں دینا بدعی طلاق کی تعریف میں داخل ہے، خواہ طلاق ایک ہی کلمہ سے ہو یا متفرق کلمات سے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک بلفظ واحد یا بوقت واحد تین طلاقیں دینے سے تین طلاقیں واقع ہوں گی اور اس طرح طلاق دینے والا گنہگار ہوگا، یکبارگی طلاق دینے سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ اس طرح طلاق دینے سے منشأ قرآن "الطلاق مرتان فامساك بمعروف أو تسريح باحسان" کی خلاف ورزی ہوتی ہے، علامہ کاسانیؒ صاحب بدائع الصنائع لکھتے ہیں:

وأما الذى يرجع الى العدد فهو ايقاع الثلاث أو الثنتين فى طهر واحد لا جماع فيه سواء كان على الجمع بان أوقع الثلاث جملة واحدةً أو على التفاريق واحداً بعد واحدٍ، بعد أن كان الكل فى طهر واحد وهذا قول اصحابنا

(بدائع الصنائع ۲۰۲/٤)

مجموعہ قوانین اسلامی از مسلم پرسنل لا بورڈ کے دفعہ ۲۶۶ میں طلاق بدعی کی تمام شکلیں بڑی مختصر اور جامع عبارت میں درج ہیں ذیل میں یہ دفعہ نقل کیا جاتا ہے:

دفعہ (۲۶۶) مدخولہ کو حالت حیض میں طلاق دینا یا ایسے طہر میں طلاق دینا جس میں اس کے ساتھ صحبت کر چکا ہو، یا طلاق بائن دینا یا ایک سے زائد طلاق ایک طہر میں دینا، اسی طرح غیر مدخولہ کو بیک وقت ایک سے زائد طلاق دینا یا نابالغ یا آئسہ کو ایک مہینہ میں ایک سے زائد طلاق دینا، طلاق بدعت ہے۔

آگے دفعہ میں ان تمام شکلوں کی طلاق کا حکم بھی درج ہے:

دفعہ (۲۲۷) طلاق بدعت ممنوع ہے، لیکن اگر کسی نے ایسی طلاق دے دی تو واقع ہو جائے گی اور طلاق دینے والا سخت گنہگار ہوگا۔

(ب) طلاق کی قسمیں باعتبار تاثیر:

تاثیر کے اعتبار سے طلاق کی تین قسمیں ہیں:

(۱) رجعی (۲) بائن (۳) مغلظہ

(۱) طلاق رجعی:

طلاق رجعی اس طلاق کو کہتے ہیں جس میں شوہر کو دوران عدت بلا تجدید نکاح اپنی بیوی سے رجوع کا حق حاصل ہوتا ہے اور اگر رجعت نہیں کی تو عدت گذرنے کے بعد فرقت واقع ہو جاتی ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو صریح لفظوں میں ایک یا دو طلاق دے۔ طلاق کے ساتھ بائن کا لفظ استعمال نہ کرے مثلاً مرد بیوی کی طرف نسبت کرتے ہوئے یوں کہے کہ میں نے تجھے طلاق دی یا طلاق کے ساتھ ایک یا دو کا لفظ بھی استعمال کرے تو یہ طلاق رجعی ہوگی اور مرد عدت کے اندر بیوی سے رجوع کر سکتا ہے خواہ بیوی راضی ہو یا نہ ہو۔ آیت قرآنی: "الطلاق مرتان فامساك بمعروف أو تسريح باحسان" میں واضح کر دیا گیا ہے کہ طلاق دو ہی مرتبہ ہے اور ان دونوں مرتبہ میں یہ لچک

ہے کہ ان سے نکاح بالکل ختم نہیں ہوتا، بلکہ دوران عدت مرد کو اختیار ہے کہ رجوع کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے یا پھر رجوع نہ کرے اور عدت پوری ہونے دے، عدت پوری ہوتے ہی نکاح ختم ہوجائے گا۔ ماخوذ معارف القرآن ۱/۵۰۳

احادیث میں حضرت سودہ ام المومنین اور حضرت حفصہؓ کی طلاق رجعی اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رجوع کا ذکر ملتا ہے جس سے اس مسئلہ میں پوری رہنمائی ملتی ہے۔ فقہاء کرام کی تصریحات بھی موجود ہیں مشہور حنفی فقیہ صاحب ہدایہ علامہ برھان الدین مرغینانیؒ لکھتے ہیں:

واذا طلق الرجل امرأته تطليقة رجعية او تطليقتين فله أن يراجعها فى عدتها رضيت بذلك أو لم ترض.....ولا بد من قيام العدة الخ۔(هدايه ۲/ ۳۷۹)

رجعت کا حق

یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ رجعت کے لئے عورت کی رضامندی ضروری نہیں ہے یہ حق صرف شوہر کو حاصل ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:"وبعولتهن احق بردهن فى ذلك ان ارادوا اصلاحاً" (سورة البقرة آيت ۲۲۸) ترجمہ: ان کے خاوند حق رکھتے ہیں ان کو لوٹا لینے کا اسی مدت میں اگر چاہے سلوک سے رہنا۔ اس قرآنی ہدایت کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ عورت کی رضامندی کے بغیر رجعت ہوسکتی ہے۔

رجعت کا طریقہ

طلاق رجعی میں شوہر کو عدت کے اندر بلا تجدید نکاح رجوع کا حق حاصل ہوتا ہے تو یہ رجوع یا رجعت کا طریقہ کیا ہے؟ اس بارے میں فقہ اسلامی میں جو تفصیلات ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ رجعت عملاً بھی ہوسکتی ہے، مثلاً: شوہر مطلقہ سے بوس وکنار یا میاں بیوی والا تعلق قائم کرلے اور رجعت قولاً بھی ہوتی ہے، مثلاً: شوہر کہے کہ میں نے اپنی بیوی کو لوٹا لیا اور اس کی اطلاع بیوی کو دے دی البتہ قولی رجعت گواہوں (دو مرد یا ایک مرد اور دو

عورتوں) کے سامنے بہتر ہے۔ مجموعہ قوانین اسلامی از مسلم پرسنل لاء دفعہ نمبر ۲۷۲

(۲) طلاق بائن:

طلاق بائن کی دو قسمیں ہیں: ایک بائن صغری، دوسری بائن کبری، جس کو طلاق مغلظہ بھی کہتے ہیں۔

طلاق بائن صغری: طلاق بائن صغری سے ایسی طلاق مراد ہے جس میں فوری طور پر بغیر انقضاء عدت کے فرقت واقع ہوجاتی ہے اور زوجین کے درمیان رشتہ زوجیت منقطع ہوجاتا ہے اور شوہر اپنی بیوی سے دوران عدت رجوع نہیں کرسکتا، البتہ عدت کے بعد اگر فریقین باہم راضی ہو تو از سر نو نکاح کر سکتے ہیں۔ بس اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاق دے اور اس کے ساتھ بائن کا لفظ استعمال کرے یا طلاق کی نیت کے ساتھ کنائی لفظ یا طلاق کے ساتھ شدت وتاکید کے الفاظ استعمال کرے تو ان تمام صورتوں میں امام شافعیؒ کے علاوہ مذاہب ثلاثہ کی رو سے اس عورت پر طلاق بائن واقع ہوجائے گی اور مرد عدت کے زمانے میں اپنی بیوی سے رجوع نہیں کرسکتا۔ البتہ یہی شوہر عدت میں یا عدت گذارنے کے بعد دونوں باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔ (ماخوذ از مجموعہ قوانین اسلام دفعہ ۲۷۲-۲۷۳)

(۳) طلاق مغلظہ یا بائن کبریٰ:

اگر کوئی شوہر اپنی زوجہ کو بیک وقت ایک کلمہ سے تین طلاق دے یا متفرق کلمات سے تین مرتبہ طلاق کا لفظ کہے تو اسی وقت تین طلاق بائن (مغلظہ) ہوجائے گی اور وہ اپنی زوجہ سے رجوع نہ کر سکے گا۔ الا یہ کہ وہ عورت عدت گذرنے کے بعد دوسرے مرد سے نکاح کرے اور اس سے طلاق مل جائے یا نکاح فسخ ہوجائے یا وہ مرجائے تو اس صورت میں عدت ختم ہونے پر فریقین باہمی رضامندی سے نکاح جدید کر سکتے ہیں۔

جمہور صحابہؓ وتابعین وبعد کے فقہاء ومجتہدین ومحدثین کا اب تک یہی مسلک رہا ہے کہ بیک وقت تین طلاق دینے سے تین طلاقیں ہی واقع ہوں گی۔ البتہ بعض حضرات ایک

طلاق واقع ہونے کے قائل ہیں، ابن قدامہ المقدسی نے اپنی کتاب المغنی میں ان حضرات میں حضرت عطاء، طاؤس، سعید بن جبیر، ابوالشعثاء اور عمر بن دینار کے اسماء گرامی لکھے ہیں۔ اور مشاہیر متأخرین میں امام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد ابن قیم بھی اسی مسلک کے قائل ہیں اور ہر ایک نے اپنے اپنے دلائل پیش کئے ہیں، جمہور فقہاء ومحدثین اور علماء سلف جو ایک ساتھ تین طلاق واقع ہونے کے قائل ہیں، اپنے اپنے مسلک کے ثبوت میں متعدد احادیث وآثار صحابہ پیش کرتے ہیں، علماء کرام کی بڑی تعداد نے اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور بڑے قیمتی رسالے بھی تحریر فرمائے ہیں، طوالت سے بچنے کے لئے ہم ان تفصیلات سے گریز کرتے ہیں اور موضوع کو یہیں پر ختم کرتے ہیں۔

اپنی بات

البتہ موجودہ حالات کے پس منظر میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ہندوستانی مسلم سماج میں تعلیم بالخصوص دینی تعلیم کی کمی کی بنا پر آئے دن ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان دینی مسائل میں کمی کے ساتھ غلط فہمیوں کا بھی بڑا اہم رول ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ طلاق اسی وقت واقع ہوتی ہے جبکہ تین بار طلاق کے الفاظ استعمال کئے جائیں، پھر یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ میاں بیوی دونوں جلد ہی ایک ساتھ ازدواجی زندگی گذارنے کے لئے دارالافتاء سے رجوع کرتے ہیں اور جب تین طلاق دینے پر انہیں حرام ہونے کا علم ہوتا ہے تو دونوں واویلا مچاتے ہیں اور جواز کی کوئی راہ نکالنے کے لئے مفتیان کرام سے کبھی درخواست کرتے ہیں اور کبھی دباؤ ڈالتے رہتے ہیں، اور حلالہ جیسے قبیح عمل سے بچنے کے لئے کذب بیانی میں کوئی دریغ محسوس نہیں کرتے اور مختلف حیلے بہانے تلاش کرتے ہیں، جو بذات خود ایک سنگین معاملہ ہے۔

دوسری طرف موجودہ حکومت ہند نے طلاق ثلاثہ بل لاکر جو قانون نافذ کردیا ہے،

اس نے مسلم سماج میں جہاں تشویش کی لہر پیدا کردی ہے، وہیں کمزور دین وعقیدہ رکھنے والے مسلمانوں میں جو اس مسئلہ سے دوچار ہیں، دین وشریعت کو نظر انداز کرتے ہوئے دروغ گوئی سے اپنا مسئلہ حل کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتے اس صورت حال کو سامنے رکھ کر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے جہاں قانونی لڑائی کے لیے قابل ستائش جد وجہد کی ہے وہیں بورڈ سے مرتب ہونے والی کتاب میں ایک دفعہ درج کر کے اس مسئلہ کے حل میں مفتیان کرام اور قانون داں حضرات کے لئے غور وفکر اور رہنمائی کا ایک گوشہ قائم کردیا ہے، مجموعہ قوانین اسلامی کی دفعہ ۲۷۸ کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

اور اگر طلاق دینے والا یہ کہتا ہے کہ اس کی نیت ایک ہی طلاق کی تھی اور اس نے محض زور پیدا کرنے کے لئے الفاظ دہرائے ہیں، اس کا مقصد ایک سے زائد طلاق دینے کا نہیں تھا۔ تو اس کا یہ بیان حلف کے ساتھ تسلیم کیا جائے گا اور ایک ہی طلاق واقع ہوگی، اور طلاق دینے والا یہ کہتا ہے کہ اس کی کچھ بھی نیت نہیں تھی نہ ایک ہی اور نہ دو تین کی تو دیکھا جائے گا عرف میں ایسے مواقع پر تاکیداً الفاظ دہرانے کا رواج ہے یا نہیں، اگر عرف میں غالب یہ ہو کہ ایسے موقع پر لوگ محض کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے بار بار اسی لفظ کو دہراتے ہیں، تو عرف کی تقاضوں کی رعایت کرتے ہوئے الفاظ کی تکرار کو تاکید پر محمول کر کے ایک ہی طلاق واقع ہوجائے گی۔ لیکن اگر عرف ایسا نہ ہو بلکہ الفاظ کی تکرار نیا معنی پیدا کرنے کے لئے معروف ومروج ہو تو ایسی صورت میں ہر لفظ طلاق کو مستقل طلاق پر محمول کیا جائے گا۔ (مجموعہ قوانین اسلامی آل انڈیا مسلم پرسنل لاء۔ دفعہ ۲۷۸)

ناچیز کے نزدیک مستند اہل فقہ وفتاوی کی طرف سے مرتب کردہ مجموعہ قوانین کے مذکورہ دفعہ کو سامنے رکھ کر ارباب افتاء مستفتی کے حال اور حالات کی نزاکت کے پیش نظر فتویٰ دیں تو بہت سے پیچیدہ مسائل حل ہوسکتے ہیں اور مبتلا بہ افراد کے لئے دین سے دوری اور لاپرواہی کے بجائے دین سے قربت اور شریعت کی طرف رغبت کی فضاء پیدا کی جاسکتی ہے۔

هذا ما عندی واللہ اعلم باالصواب۔

کیا طلاق واقع ہونے کے لئے تحکیم اور اشہاد ضروری ہیں؟

مولانا مفتی محمد زید مظاہری ندوی
(استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

احقر کے مقالہ کا موضوع وعنوان سے ظاہر ہے کہ طلاق کی بنیادی شرطیں کیا ہیں؟ کیا طلاق واقع ہونے کے لئے بھی گواہوں کا ہونا یا طلاق دینے سے قبل تحکیم کے سلسلہ کی کاروائی کرنا (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) بھی ایسی شرط ہے کہ اس کے بغیر طلاق واقع نہیں ہوگی؟ پیش نظر مضمون میں ہم انشاء اللہ اسی مسئلہ سے متعلق قرآن وحدیث کی روشنی میں کچھ باتیں عرض کریں گے۔

اسلام ایک جامع اور مکمل دستور حیات ہے، جس میں عقائد، عبادات اور معاملات کے علاوہ معاشرتی مسائل سے متعلق بھی تفصیلی ہدایات موجود ہیں، بلکہ دین کے دوسرے شعبوں مثلاً معاملات سے متعلق صرف اصولی ہدایتیں دی گئیں، اور ایسے ضابطے بتلا دیئے گئے ہیں جن سے بے شمار جزئیات حل کئے جاسکتے ہیں، لیکن معاشرتی زندگی یعنی نکاح، طلاق، عدت وغیرہ سے متعلق صرف اصول وکلّیات کے بیان کرنے پر کفایت نہیں کی گئی، بلکہ نکاح وطلاق سے متعلق تفصیلی احکام اور جزئیات تک بیان کردیئے گئے ہیں جو انسانی عقل وفطرت کے عین مطابق ہیں، طلاق واقع ہونے کے لئے تحکیم واشہاد کے سلسلہ میں قرآن وحدیث کی دی ہوئی ہدایتیں ملاحظہ ہوں:

طلاق دینے سے پہلے دو حَکَم کے ذریعہ معاملہ حل کرنے کی ترغیب

شقاق بین الزوجین یعنی میاں بیوی کے باہمی اختلافات اور آپسی جھگڑوں کو ختم کرنے اور باہم اتحاد واتفاق قائم رکھنے کے لئے قرآن نے جو ہدایات دی ہیں، اس کا پہلا درجہ موعظت ونصیحت، دوسرا درجہ وقتی اعراض اور کنارہ کشی، اور تیسرا درجہ مار پیٹ ہے، جس کی تفصیل ماقبل میں گزری، یہ تین تدبیریں ایسی ہیں کہ گھر کی چہار دیواری میں شوہر وبیوی خود آپس میں اس کے ذریعے اپنا مسئلہ حل کرسکتے ہیں اور آپسی اختلاف کو ختم کرسکتے ہیں، لیکن زوجین کے درمیان اختلاف اگر اتنا شدید ہوچکا، مسئلہ اتنا طول پکڑ چکا ہو اور دونوں کو ایک دوسرے سے شکایتیں ورنجشیں اس قدر ہوں کہ بظاہر اب مسئلہ حل ہونے کی کوئی امید نظر نہ آتی ہو، ایسے حالات میں بھی شریعت کا حکم یہ ہے کہ ابھی بھی طلاق مت دو، بلکہ دوسروں کو درمیان میں ڈال کر مسئلے کو حل کرانے اور ایک دوسرے کو سمجھا کر صلح صفائی اور اتفاق قائم کرنے کی کوشش کرو۔

حضرت سعید بن جبیرؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ اختلاف بین الزوجین کو دور کرنے کے لئے شرعی حکم یہ ہے کہ پہلے مرحلہ میں اس کو نصیحت کرنے اور سمجھانے کی کوشش کرو، اگر نصیحت سے معاملہ حل ہوجائے تو بڑی اچھی بات ہے، ورنہ دوسرے مرحلے میں اس کی اصلاح کے لئے وقتی طور پر ایک مدت کے لئے اس سے کنارہ کشی کرلو، یہ صورت بھی اگر مفید نہ ہو تو سختی سے کام لو، ان تدبیروں کو اختیار کرنے سے بھی اگر اصلاح کی توقع نہ ہو اور باہمی اختلاف بڑھتا ہی جارہا ہو تو پھر اس صورت میں حَکَم کے ذریعہ مسئلہ کو حل کرانے کی کوشش کرے، ایک حَکَم مرد کی طرف سے، دوسرا عورت کی طرف سے، دونوں حَکَم مسئلہ کو سمجھ کر حل کرنے کی کوشش کریں، ابھی تک مصالحت کے جتنے طریقے تھے وہ سب زوجین کی ذات تک محدود اور گھر کی چہار دیواری کے اندر ہی تھے، اور اب جو صورت بیان کی جارہی ہے اس کا تعلق گھر کے باہر کے لوگوں سے ہے، جو درمیان میں پڑ کر مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کریں، شریعت میں ایسے ہی لوگوں کو حَکَم کہتے ہیں۔

"قال القرطبیؒ: قال سعید بن جبیرؒ: الحکم أن یعظها أولا، فإن هي

قبلت وإلا هجرها، فإن هی قبلت وإلا ضربها، فإن هی قبلت وإلا بعث حکماً من أهله وحکماً من أهلها۔" (تفسیر قرطبی، سورہ نساء، جلد ٦، صفحہ ٢٩٠)

حَکَم کون لوگ بن سکتے ہیں اور اس کے مخاطب کون لوگ ہیں؟

حق تعالیٰ کا فرمان ہے:

"وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُواْ حَكَماً مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَماً مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيْدَا إِصْلاَحاً يُوَفِّقِ اللّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللّهَ كَانَ عَلِيماً خَبِيراً۔" (سورہ نساء: ٣٥)

ترجمہ: اور اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہو تو (ان کے درمیان فیصلہ کرانے کے لئے) ایک منصف مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف عورت کے خاندان میں سے بھیج دو، اگر وہ دونوں اصلاح کرانا چاہیں گے تو اللہ دونوں کے درمیان اتفاق پیدا فرمادے گا، بیشک اللہ کو ہر بات کا علم اور ہر بات کی خبر ہے۔

اس موقع پر قرآن نے لفظ "حَکَم" بیان کیا ہے جس سے مراد وہ شخص ہے جس کے اندر اس کام کو بحسن خوبی انجام دینے کی صلاحیت ہو، جس کے لئے بنیادی طور پر تین اوصاف کا ہونا ضروری ہے:

(۱) وہ دونوں حَکَم عادل، ثقہ، دین دار اور دیانت دار ہوں۔

(۲) علم دین سے اتنی واقفیت رکھتے ہوں کہ شریعت کے مطابق ہی مسئلہ کو حل کریں، خلاف شرع کوئی سمجھوتہ نہ کریں، یا خلاف شرع کوئی پابندی اور شرطیں نہ لگائیں یعنی اس سلسلہ کی شریعت کی پوری معلومات رکھتے ہوں خواہ خود صاحب علم ہوں اور کتابوں کے ذریعہ علم حاصل کریں یا اہل علم سے پوچھ کر ضروری معلومات حاصل کریں۔

(۳) تیسرے یہ کہ وہ حَکَم اتنے عقلمند، دور اندیش، صاحب بصیرت ہوں کہ دونوں کی بات سن کر مسئلہ کو حل کرنے اور صلح وصفائی کا سلیقہ بھی رکھتے ہوں، مزاج کے تیز، غصہ میں فیصلہ کرنے والے، جلد باز اور اکھڑ مزاج نہ ہوں، بلکہ ہمدرد اور خیر خواہ ہوں اور نرمی سے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں

(۴) یہ دونوں حَکَم اگر شوہر بیوی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہوں تو زیادہ بہتر ہے، کیونکہ وہ دونوں ہمدرد ہونے کے علاوہ زوجین کے حالات ومزاج سے پوری طرح واقف ہوں گے، ایک حَکَم شوہر کی طرف سے اور ایک بیوی کی طرف سے ہوگا۔

(۵) لیکن اگر شوہر و بیوی کے خاندان میں مذکورہ بالا شرائط واوصاف کے حامل حَکَم موجود نہ ہوں تو ایسی صورت میں خاندان کے باہر صاحب علم ودیانت جو اس کام کو انجام دے سکتے ہوں، ان کو بیچ میں ڈال کر دونوں حکموں کے ذریعے مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی جائے۔

یہ ساری تفصیل امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں مذکورہ آیت کے تحت نقل فرمائی ہے، امام قرطبی کی عبارت درج ذیل ہے:

"والحکمان لا یکونان إلا من أهل الرجل والمرأة، إذ هما أقعد بأحوال الزوجین، ویکونان من أهل العدالة وحسن النظر والبصر بالفقه، فإن لم یوجد من أهلهما من یصلح لذلك، فیرسل من غیرهما عدلین عالمین، وذلك إذا أشکل أمرهما ولم یدر ممن الإساءة منهما، فأما إن عرف الظالم، فإنه یؤخذ له الحق من صاحبه و یجبر علی إزالة الضرر۔" (تفسیر قرطبی، سورہ نسا، جلد ٦، صفحہ ٢٩٠، ٢٩١)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

"وہ یہ کہ ارباب حکومت یا فریقین کے اولیاء یا مسلمانوں کی کوئی مقتدر جماعت یہ کام کرے کہ ان کے آپس میں مصالحت کرانے کے لئے دو حَکَم مقرر کریں، ایک مرد کے خاندان سے دوسرا عورت کے خاندان سے، اور ان دونوں جگہ لفظ "حَکَم" سے تعبیر کر کے قرآن کریم نے ان دونوں شخصوں کے ضروری اوصاف کو بھی متعین کر دیا، کہ ان دونوں میں جھگڑوں کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو، اور یہ صلاحیت ظاہر ہے کہ اسی شخص میں ہوسکتی ہے جو ذی علم بھی ہو اور دیانت دار بھی۔ (معارف القرآن، سورہ نساء، جلد ٢، صفحہ ٤١٣)

(٦) خلاصہ یہ کہ حکم بننے کے سب سے زیادہ اہل زوجین ہی کے خاندان والے ہیں، لیکن خاندان میں ان اوصاف کے حامل اگر موجود نہ ہوں، تو خاندان کے باہر کے

اصحاب علم وعدل جو میسر ہوں، ان کے ذریعہ مسئلہ کو حل کرانے کی کوشش کی جائے۔

(۷) اسلامی حکومت ہو تو امراء و حکام اس کے مخاطب و مکلّف ہیں کہ زوجین کے درمیان اختلاف وشقاق دور کرنے کی مذکورہ بالا قرآنی ہدایت کے مطابق کوشش کریں۔

زوجین اور ان کے فریقین عدالت میں اگر اپنا قضیہ پیش کریں تب تو مذکورہ بالا قرآنی ہدایت کے مطابق مسئلہ حل کرنا عدالت کی ذمہ داری اور ان کا فریضہ ہوگا، اور اگر وہ مرابعہ نہیں کرتے اور شدید اختلاف میں مبتلا ہیں، اور خاندان کے لوگ اس کو حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے یا کرنا نہیں چاہتے تو حکام کے علم میں آجانے کے بعد خود ان پر واجب ہوگا کہ درمیان میں پڑ کر اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کریں، کیونکہ اس کے مخاطب و مکلّف حکام بھی ہیں، امام قرطبی کی عبارت درج ذیل ہے:

"قال القرطبیؒ: الجمهور من العلماء على أن المخاطب بقوله: "وإن خفتم" الحكّام والأمراء۔"(تفسير قرطبی، سوره نساء، جلد ٥، صفحه ١١٥)

(۸) غیر اسلامی حکومت میں مسلمانوں کی کوئی بھی تنظیم یا جماعت ہو جو اس کام کو شرع کے موافق انجام دے سکتی ہو، جن کی علمی صلاحیت اور دیانت پر پورا اعتماد ہو، ان کے ذریعہ بھی یہ کام کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی تصریح سے معلوم ہوا اور مسلمانوں میں ایسی جماعتیں ہونی چاہیے، جو اس کام کو شرع کے موافق انجام دیا کریں۔

(۹) غیر اسلامی حکومت میں کچہری کورٹ میں بھی ایسے مسائل کو حل کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے نظام بنایا جاتا ہے، جس میں زوجین کے مابین تفریق سے بچانے اور رشتہ کو برقرار رکھنے کے لئے دونوں کی باتیں شکایتیں سن کر مسائل کو حل کرنے، صلح وصفائی اور اتحاد واتفاق کی کوششیں کی جاتی ہیں، یہ کوششیں بھی بہت مفید اور مناسب ہیں، ان کے ذریعہ بھی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے، شرط یہی ہے کہ خلاف شرع کوئی کارروائی نہ کی جائے، چونکہ یہ عملہ عموماً دین وشریعت کے احکام ومسائل سے واقف نہیں ہوتا، اس لئے مناسب بلکہ ضروری ہے کہ ان کی تجاویز اور فیصلوں کو اصحاب علم وافتاء

سے دریافت کرلیا جائے کہ اس مسئلہ میں کوئی خلاف شرع بات تو نہیں ہے؟ یا مصالحت میں ان کو بھی شریک کرلیا جائے۔

لیکن کچہری کورٹ میں عموماً فرد واحد (ایک وکیل) ہی ایسے مسائل کو سننے اور سمجھنے کے بعد حل کرنے کی اور سمجھوتے کی کوشش کرتا ہے، جب کہ شریعت کا حکم اور قرآنی ہدایت یہ ہے کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کم سے کم دو حَکَم ہونا چاہیے، ایک مرد کی طرف سے دوسرا اس کی بیوی کی طرف سے، اور دونوں حَکَم شوہر و بیوی کی شکایتوں کو اچھی طرح سمجھ کر سلجھانے کی کوششیں کریں، اس لئے مناسب یہی ہے کہ مسلمان اختلاف بین الزوجین کے مقدمات کو مسلمانوں کی تنظیم اور مقتدر جماعت کے ذریعہ حل کرانے کی کوشش کریں، جو شریعت کے مطابق دو حکموں کے ذریعہ مکمل کاروائی کریں۔

غیر اسلامی ممالک میں دینی مدارس کے تحت اور اس کے علاوہ بھی جو دارالافتاء اور دارالقضاء یا محکمہ شرعیہ قائم ہیں، ان اداروں کے ذریعہ بھی یہ کام بحسن خوبی انجام دیا جاسکتا ہے، وہ حضرات اصحاب علم شریعت کے مطابق پوری کاروائی کریں گے، یعنی فسخ نکاح و تفریق سے پہلے قرآنی ہدایت کے مطابق شوہر و بیوی کی طرف سے دو حکم مقرر کر کے مسئلہ کو حل کرنے اور سلجھانے کی کوشش کریں گے، اور چونکہ اس کام کو انجام دینے کے لئے قوّت قاہرہ ومنفذہ بھی شرط نہیں ہے، اس لئے اصلاح بین الزوجین کے سلسلہ میں یہ کاروائی تمام اہل علم کے درمیان متفق علیہ ہے، اس کے استحسان میں کسی کلام کی گنجائش نہیں۔

تمام لوگوں کو چاہیے کہ اپنے عائلی مسائل اور شوہر بیوی کے درمیان پیش آنے والے اختلافی مسائل حل کرنے کے لئے ان دارالقضاء، دارالافتاء اور محکمہ شرعیہ کی طرف ہی رجوع کریں، اور ہمارے دارالقضاء وغیرہ کے ذمہ داروں کو بھی چاہئے کہ فسخ نکاح وتفریق بین الزوجین سے پہلے اس کی طرف توجہ زیادہ کریں جس کی قرآن نے ہدایت کی ہے، اور لوگوں کو اس سے آگاہ کریں، انشاء اللہ امت کے حق میں ہر لحاظ سے اس کے بہتر فوائد ونتائج سامنے آئیں گے۔

باہم الفت ومحبت پیدا کرنے کے چند ظاہری اعمال اور کچھ باطنی تدبیریں

زوجین کے درمیان طلاق وتفریق واقع نہ ہو ان کا یہ ازدواجی رشتہ برقرار رہے اس کے لئے قرآن وحدیث میں اختلافات ونزاع کو ختم کرنے کے لئے جو ظاہری تدبیریں وہدایات کی گئی ہیں ان کی تفصیل ماقبل میں گزری، ان سب کے علاوہ قرآن حدیث میں زوجین کے مابین اختلاف وشقاق کو ختم کرنے اور اتحاد واتفاق پر زور دینے اور بیویوں کو مطیع اور فرمابردار بنانے اور ان کے درمیان الفت ومحبت پیدا کرنے کے کچھ باطنی اسباب بھی بتائے ہیں، جن کے کرنے سے حق تعالیٰ دونوں کے درمیان الفت ومحبت پیدا فرماتے ہیں ان سب کا خلاصہ دو قسم کے اعمال ہیں، ایک اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کا اہتمام اور بیوی کے ساتھ اچھا برتاؤ، دوسرے خاص دعاؤں کا اہتمام جن کی رسول اللہ ﷺ نے ہدایت فرمائی ہے، ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

حق تعالیٰ کا فرمان ہے:

"إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدّاً۔"

(سورہ مریم:۹۶)

ترجمہ: بیشک جولوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں، خدائے رحمٰن ان کے لئے دلوں میں محبت پیدا کردے گا۔

لیکن اعمال صالحہ صرف نماز روزہ کرنے کا نام نہیں، اخلاق حسنہ کے ساتھ اچھا برتاؤ بھی اعمال صالحہ میں داخل ہیں، جب بندہ اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ سے متصف ہوگا، بیوی بچوں کے ساتھ اس کا برتاؤ اچھا ہوگا تو یقیناً آپس میں الفت ومحبت پیدا ہوگی، چند اعمال کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی ہدایت فرمائی ہے جن سے آپس میں الفت ومحبت پیدا ہوتی ہے، وہ درج ذیل ہیں:

(۱) ابوداؤد کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم جنت

میں داخل نہیں ہوسکتے جب تک کہ تمہارا ایمان کامل نہیں ہوسکتا، اور تمہارا ایمان کامل نہیں، جب تک تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو اور تم میں آپس میں محبت قائم نہیں رہ سکتے، جب تک کہ تم ایک دوسرے کو سلام نہ کرو، روایت کے مختصر الفاظ یہ ہیں:

"عن أبی هريرةؓ قال: قال رسول اللهﷺ: والذی نفسی بيده، لا تدخلوا الجنة حتی تؤمنوا، ولا تؤمنوا حتی تحابوا، أفلا أدلكم علی أمر إذا فعلتموه تحاببتم؟ افشوا السلام بينكم۔"(سنن ابو دائود، كتاب الأدب، باب فی افشاء السلام، حديث ۵۱۹۳)

(۲) ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سلام اور مصافحہ کیا کرو اور دونوں کی تاثیر آپ نے یہ بیان فرمائی کہ اس سے دل کی کدورت وانقباض دور ہوتا ہے، نفرت ختم ہوتی ہے اور محبت قائم ہوجاتی ہے، یہ سلام اور مصافحہ کی تاثیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرمائی ہے، اسی وجہ سے تو اجنبیہ عورت سے سلام کی ممانعت ہے، اجنبیہ سے محبت پیدا ہوگی۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انسؓ سے فرمایا بیٹے جب گھر میں داخل ہوا کرو تو اپنے گھر والوں اور بچوں کو بھی سلام کیا کرو، اس سے تمہارے گھر میں رحمت و برکت کا نزول ہوگا۔

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ آپس میں سلام کرنے سے محبت پیدا ہوتی ہے، دل کا انقباض اور کدورت دور ہوتی ہے، گھر میں رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے، شوہر جب گھر میں داخل ہوکر اپنی بیوی بچوں کو سلام کرے گا تو یقیناً یہ فوائد دونوں کو حاصل ہوں گے، نفرتیں اور دوریاں ختم ہوں گی، رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوگا، اور باہم رنجشیں ختم ہوں گی، اس لئے شوہر وبیوی کے درمیان محبت قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو سلام کیا کریں، شوہر گھر میں داخل ہو تو سلام کرے، خالی ہاتھ ہو تو مصافحہ بھی کرلیا کرے، رسول اللہ ﷺ جب گھر میں داخل ہوتے تو سلام کیا کرتے تھے اور

آہستہ سلام کیا کرتے تھے، تاکہ نیند نہ کھلے، اسی طرح کا اہتمام و برتاؤ آپس میں الفت و محبت پیدا ہونے کا سبب ہوگی۔

ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ شب برأت کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کے وقت اٹھے، دروازہ نہایت آہستہ سے کھولا اور جوتے اٹھائے، یہ صرف اس واسطے کہ عائشہؓ کی نیند نہ کھل جائے، ان کی نیند خراب نہ ہو۔

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ شوہر کو اپنی بیوی کی راحت کا اس درجہ خیال رکھنا چاہیے جتنا کہ رسول اللہ ﷺ خیال رکھتے تھے آپ اس کی بھی فکر کرتے تھے۔

طلاق دینے کی واقعی ضرورت ہو تو طلاق دینے میں شرعاً کوئی حرج نہیں

طلاق دینا اگرچہ اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے، شریعت کی نگاہ میں دنیا بھر کی تمام حلال چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض و قابل نفرت چیز طلاق ہی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"أبغض الحلال إلى الله تعالىٰ الطلاق۔"(سنن ابو دائود، كتاب الطلاق، باب فى كراهية الطلاق، حديث ۲۱۷۸)

یعنی حلال چیزوں میں سب سے زیادہ بری چیز اللہ کے نزدیک طلاق ہے، لیکن بسا اوقات زوجین کے درمیان حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ باہم نباہ بہت مشکل ہوتا ہے، اور ظن غالب اس بات کا ہوتا ہے کہ اب دونوں ایک دوسرے کے حقوق نہیں ادا کر سکیں گے، جس کی وجہ سے ان کی ازدواجی زندگی بدمزہ اور تلخ ہو جاتی ہے، اور ادائے حقوق میں کوتاہی کی وجہ سے دونوں ہی عند اللہ مجرم اور مستحق عذاب ہوں گے، ایسی صورت میں شریعت کا حکم بھی یہی ہے کہ حق تلفی اور ظلم کے وبال اور عذابِ خداوندی سے بچنے کے لئے طلاق دے دو، اور ایسے ہی موقعوں کے لئے شریعت نے مردوں کو طلاق دینے اور عورت کو طلاق لینے کی اجازت دی ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

" يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا

الْعِدَّةَ۔"(سورہ طلاق: ۱)

ترجمہ: اے پیغمبر ﷺ! (آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ) جب تم لوگ (اپنی) عورتوں کو طلاق دینے لگو تو (ان کو زمانہ) عدت (یعنی حیض) سے پہلے (یعنی طہور میں) طلاق دو، اور تم عدت کو یاد رکھو۔

"فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ۔"

(سورہ بقرہ: ۲۲۹)

ترجمہ: اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے، تو ان دونوں کے لئے اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں کہ عورت مالی معاوضہ دے کر علیحدگی اختیار کر لے۔

الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ۔(سورہ بقرہ، :۲۲۹)

ترجمہ: طلاق (زیادہ سے زیادہ) دو بار ہونی چاہئے، اس کے بعد (شوہر کے لئے دو ہی راستے ہیں) یا تو قاعدہ کے مطابق (بیوی کو) روک رکھے (یعنی طلاق سے رجوع کر لے) یا خوش اسلوبی سے چھوڑ دے (یعنی رجوع کے بغیر عدت گذر جانے دے)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل

رسول اللہ ﷺ کی ازدواجی زندگی میں متعدد مرتبہ ایسے واقعات پیش آئے کہ آپ کو بھی اپنی بیویوں کی طرف سے ناگوار حالات سے سابقہ پڑا، اس وقت آپ نے اپنی بیویوں کو وعظ و نصیحت فرمائی، بعض مرتبہ ناراض بھی ہوئے، بعض بیویوں سے اعراض و کنارہ کشی بھی فرمائی، جس کی تفصیل ماقبل میں گزر چکی۔

بعض بیویوں کی طرف سے آپ کو ایسی تکلیف اور صدمہ پہنچا کہ ایک مرتبہ آپ نے اپنی بیوی حضرت حفصہؓ کو طلاق دے دی، پھر اللہ کے حکم سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے کہنے سے رجوع بھی فرما لیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حفصہ بہت عبادت کرنے والی، نماز

پڑھنے والی، روزہ رکھنے والی، اللہ کی طرف رجوع ہونے والی خاتون ہیں، اور جنت میں آپ کی بیوی ہوں گی، چنانچہ آپ نے ان کو رجوع فرمالیا، ابوداؤد شریف کی روایت میں ہے:

"عن عمرؓ: أن رسول اللہ ﷺ طلّق حفصة ثم راجعها۔" (سنن ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب فی المراجعة، حدیث ۲۲۸۳)

"وفی روایة: قال رسول اللہ ﷺ: إن جبرئیل أتانی فقال لی: ارجع حفصة فإنها صوامة قوامة، وهی زوجتك فی الجنة۔" (حاکم، جلد ٤، صفحه ۱۵، طبقات ابن سعد، جلد۸، صفحه ۸٤)

آپ کی بعض بیویوں (حضرت سودہؓ) کے حالات ایسے ہوگئے تھے کہ غالباً آپ نے خطرہ محسوس کیا، اور آپ پر اللہ کا خوف غالب ہوا کہ کہیں مجھ سے ادائے حقوق میں کوتاہی نہ ہوجائے اور اس حق تلفی کی وجہ سے میں عنداللہ جوابدہ ہوجاؤں، اس لئے آپ نے ان کو طلاق دینے کا ارادہ فرمالیا تھا (واللہ اعلم)، لیکن حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کی دینداری، سمجھ داری و دور اندیشی قابل تعریف ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عاجزانہ گزارش کی کہ یارسول اللہ! میرا کچھ بھی مطالبہ نہیں، بیویوں کے پاس رات گزارنے میں جو باری مقرر کی گئی، یارسول اللہ! اس باری کا بھی میرا کوئی مطالبہ نہیں، میں اپنی وہ باری بھی حضرت عائشہؓ کو ہبہ کرتی ہوں، یعنی میری باری میں بھی آپ عائشہ کے پاس رہئے، میرا کسی حق کا بھی کوئی مطالبہ نہیں، آپ مجھے طلاق نہ دیجئے، تاکہ جنت میں مجھے آپ کی رفاقت اور زوجیت کا شرف حاصل رہے، چنانچہ اس کے بعد آپ نے ان کو طلاق نہیں دی اور ان کے حقوق بھی ادا فرماتے رہے، ترمذی کی روایت میں ہے:

"عن ابن عباسؓ قال: خشیت سودةؓ أن یطلّقها النبی ﷺ، فقالت: لا تطلقنی وأمسکنی واجعل یومی لعائشة، ففعل، فنزلت: فلا جناح علیهما أن یصلح بینهما صلحا، والصلح خیر، فما اصطلحا علیه من شیء فهو جائز۔" (جامع ترمذی، أبواب تفسیر القرآن، باب: ومن سورة النساء، حدیث ۳۰٤۰)

طلاق دینے کی بنیادی شرطیں

جہاں تک سوال اس بات کا ہے کہ طلاق دینے کی بنیادی شرطیں کیا ہیں؟ اور طلاق دینے کا حق کس کو ہے؟ ہمارے فقہاء نے اس کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے، بدائع الصنائع، فتاویٰ عالم گیری اور البحر الرائق وغیرہ میں اس کی تفصیلات موجود ہیں، ان میں صرف چند کا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں:

طلاق دینے کا اختیار صرف شوہر کو ہے کسی اور کو نہیں

طلاق واقع کرنے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ طلاق ایسے شوہر کی جانب سے ہو جو عاقل ہو، مجنون، پاگل نہ ہو، بالغ ہو، بچہ یا مراہق نہ ہو، ہوش وحواس کی حالت میں طلاق دی ہو، بے ہوشی میں نہیں، البتہ اگر شراب پی کر نشہ کی حالت میں طلاق دی ہو تو طلاق واقع ہوجاتی ہے، چنانچہ فتاوی عالم گیری میں ہے:

"یقع طلاق کل زوج إذا کان بالغاً عاقلاً سواء کان حراً أو عبداً طائعاً أو مکرهاً۔" (فتاوی عالم گیری، کتاب الطلاق، فصل فیمن یقع طلاقه وفیمن لا یقع طلاقه، جلد اول، صفحه ۳۸۷)

سب سے پہلی بنیادی شرط یہ ہے کہ طلاق دینے والا شوہر ہی ہو، لہٰذا اگر شوہر کا باپ یعنی عورت کا خسر، یا شوہر کا استاد یا شیخ، یا شوہر کا آقا اپنے بیٹے یا شاگرد یا مرید کی بیوی کو طلاق دے بھی دے تو ہرگز طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ شریعت نے یہ اختیار صرف شوہر کو دیا ہے، اور شوہر بیوی کے آپسی واندرونی حالات ومعاملات ان دونوں کے علاوہ کوئی اور پورے طور پر نہیں سمجھ سکتا، اس لئے شریعت نے یہ حق صرف شوہر کو دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے وقت میں ایک قضیہ یہ پیش آیا کہ ایک آقا نے اپنے غلام کا باندی سے نکاح کردیا، بعد میں کسی وجہ سے ناراض ہوکر خود ہی اس رشتہ کو ختم کرکے دونوں کے درمیان تفریق کرنا چاہتا تھا، غلام نے آکر رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی، رسول

اللہ ﷺ نے اس پر تنبیہ کی اور فرمایا طلاق دینے کا اختیار صرف اس کو ہے جو اس کی پنڈلی کا مالک یعنی اس کا شوہر ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"عن ابن عباسؓ قال: أتى النبيﷺ رجل فقال: يا رسول الله! إن سيدي زوجني أمته، وهو يريد أن يفرق بيني و بينها، قال: فصعد رسول اللهﷺ المنبر فقال: يا أيها الناس! ما بال أحدكم يزوج عبده أمته، ثم يريد أن يفرق بينهما، إنما الطلاق لمن أخذ بالساق۔" (سنن ابن ماجه، كتاب الطلاق، باب طلاق العبد، حديث ۲۰۸۱)

اس روایت میں آپ ﷺ نے وضاحت فرمادی کہ عورت کو طلاق دینے کا اختیار اس کے شوہر کے علاوہ کسی اور کو نہیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ اپنے بیٹے اور بہو کے حالات سے خوش اور مطمئن نہیں تھے، چاہتے تھے کہ بہو کو طلاق ہو جائے، بیٹے سے طلاق دینے کو کہا لیکن ان کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی، اس لئے طلاق دینے پر آمادہ نہ ہوئے، لیکن حضرت عمر فاروقؓ کسی معقول وجہ سے ہی اپنے بیٹے سے طلاق دینے پر مصر تھے، حضرت ابن عمرؓ نے پوری تفصیل رسول اللہ ﷺ سے جا کر عرض کی، رسول اللہ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ اپنے والد کی اطاعت کرو، اور اپنی بیوی کو طلاق دے دو، کیونکہ حضرت عمر ایسے نہیں ہیں کہ کسی معقول بنیاد کے بغیر طلاق کا حکم دے دیں، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"عن ابن عمرؓ قال: كانت تحتي امرأة أحبها، وكان أبي يكرهها، فأمرني أبي أن أطلّقها، فأبيت فذكرت ذلك للنبيﷺ فقال: يا عبدالله بن عمر! طلّق امرأتك۔" (جامع ترمذي، أبواب الطلاق، باب الرجل يسأله أبوه أن يطلق زوجته، حديث ۱۱۸۹)

ایک دوسری روایت میں ہے:

"عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال: قال رسول اللهﷺ:........ولا طلاق له فيما لا يملك۔' (جامع ترمذي، أبواب الطلاق، باب

ما جاء لا طلاق قبل النكاح، حديث ۱۱۸۱)

یعنی طلاق دینے کا اختیار صرف اس مرد کو ہے جس کی ملک یعنی نکاح میں وہ عورت ہے۔

اس روایت سے بھی یہی معلوم ہوا کہ طلاق دینے کا اختیار صرف شوہر ہی کو ہے، نہ کہ اس کے باپ یا کسی اور کو، ورنہ حضرت عمرؓ خود ہی بہو کو طلاق دے دیتے، بیٹے سے اصرار کی نوبت ہی نہ آتی۔

طلاق ہونے کے لئے بالغ ہونا شرط ہے، سمجھ دار بچے کی بھی طلاق واقع نہیں ہوگی

اسی طرح طلاق واقع ہونے کے لئے شریعت نے بالغ ہونے کی شرط لگائی ہے، جس کی مدت کم از کم ۱۵/سال ہے، اس سے کم عمر والے شوہر کی طرف واقع نہ ہوگی، الا یہ کہ اس کا بالغ ہونا ثابت ہو چکا ہو، وجہ اس کی یہ ہے طلاق واقع کرنے کے لئے حال اور مآل یعنی موجودہ حالات اور بعد کے نتائج، فوائد ونقصانات پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے، اور بچہ تو بچہ ہی ہوتا ہے، لہو ولعب کا مزاج ہونے کی وجہ سے غور وفکر کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس لئے شریعت نے نابالغ یعنی بچہ اور مراہق کی طلاق کو واقع نہیں کیا، اگر چہ بچہ سمجھ دار ہی کیوں نہ ہو اور ازدواجی رشتہ اچھی طرح سمجھتا بھی ہو، پھر بھی اس کی طلاق واقع نہیں ہوگی، علامہ کاسانیؒ بدائع الصنائع میں تحریر فرماتے ہیں:

"ومنها أن يكون بالغاً فلا يقع طلاق الصبي، وإن كان عاقلاً، لأن الطلاق لم يشرع إلا عند خروج النكاح من أن يكون مصلحة، وإنما يعرف ذلك بالتأمّل، والصبي لاشتغاله باللهو واللعب لا يتأمل، فلا يعرف۔' (بدائع الصنائع، كتاب الطلاق، فصل في شرائط الركن، جلد٤، صفحه ٢١٤)

طلاق واقع ہونے کے لئے شوہر کا عاقل ہونا شرط ہے، مجنون و پاگل اور بے

ہوش کی طلاق واقع نہیں ہوتی، البتہ نشہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع ہوجاتی ہے

طلاق واقع ہونے کی اہم اور بنیادی شرط یہ بھی ہے کہ طلاق دینے والا شوہر عاقل ہو، مجنون، پاگل، مدہوش، بے ہوش نہ ہو، کیونکہ طلاق دینا تصرفات شرعیہ میں سے ہے، جس کے لئے شریعت نے عقل کی شرط کو لازمی قرار دیا ہے، چنانچہ ''بدائع الصنائع'' میں علامہ کاسانیؒ طلاق کے شرائط کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"ومنها أن يكون عاقلاً حقيقة أو تقديراً، فلا يقع طلاق المجنون والصبى الذى لايعقل، لأن العقل شرط أهلية التصرف۔"(بدائع الصنائع، كتاب الطلاق، فصل فى شرائط الركن، جلد٤، صفحه ٢١٣)

اس موقع پر علامہ کاسانیؒ نے امام محمدؒ کے حوالہ سے اس کی بھی وضاحت فرمائی ہے کہ اگر کسی شخص نے نبیذ پیا جس سے اس کو دردسر یا چکر لاحق ہوا، اور اس کی وجہ سے اس کی عقل ٹھکانے پر نہ رہی یا کسی نے افیون یا بھنگ کھالی یا کسی نے کوئی ایسی دوا استعمال کی جس کی وجہ سے اس پر بے ہوشی طاری ہوگئی، اور اسی حالت میں اس نے بیوی کو طلاق دے دی تو ان تمام صورتوں میں اس کی دی ہوئی طلاق واقع نہ ہوگی، علامہ کاسانیؒ کی عبارت درج ذیل ہے:

"وذكر محمد رحمه الله تعالىٰ فيمن شرب النبيذ ولم يزل عقله، ولكن صدع فزال عقله بالصداع، أنه لا يقع طلاقه، لأنه ما زال عقله بمعصية ولا بلذة، فكان زائلا حقيقة وتقديراً، وكذلك إذا شرب البنج أو الدواء الذى يسكر وزال عقله لا يقع طلاقه لما قلنا۔"(بدائع الصنائع، كتاب الطلاق، فصل فى شرائط الركن، جلد٤، صفحه ٢١٤)

البتہ اگر کسی شخص نے شراب پی، اور شراب پینے کی وجہ سے اس کو نشہ آ گیا اور اسی نشے کی حالت میں اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو اس کی دی ہوئی طلاق حنفی مسلک کے مطابق واقع ہو جائے گی، اور یہی مسلک عام علماء اور عام صحابہ کا بھی ہے، جیسا کہ

صاحب بدائع الصنائع نے نقل فرمایا ہے، اور قرآن وحدیث اور عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ شراب پی کر نشہ کی حالت میں طلاق دینے سے طلاق واقع ہوجاتی ہے، علامہ کاسانیؒ کی عبارت درج ذیل ہے:

"وأما السكران إذا طلق امرأته، فإن كان سكره بسبب محظور، بأن شرب الخمر أو النبيذ طوعاً حتى سكر، وزال عقله، فطلاقه واقع عند عامة العلماء وعامة الصحابة، وعن عثمانؓ أنه لا يقع طلاقه، وبه أخذ الطحاوى والكرخى، وهو أحد قول الشافعىؒ۔

وجه قولهم: إن عقله زائل، والعقل من شرائط أهلية التصرف لما ذكرنا، ولهذا لا يقع طلاق المجنون والصبى الذى لا يعقل، والذى زال عقله بالبنج والدواء، كذا هذا، والدليل عليه أنه لا تصح ردته، فلأن لا يصح طلاقه أولى ولنا عموم قوله عزوجل: الطلاق مرتان، إلى قوله سبحانه وتعالى: فإن طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره، من غير فصل بين السكران وغيره إلا من خص بدليل،وقوله عليه الصلوٰة والسلام: كل طلاق جائز إلا طلاق الصبى والمعتوه، ولأن عقله زال بسبب هو معصية فينزل قائما، عقوبة عليه، وزجراً له عن ارتكاب المعصية، ولهذا لو قذف إنساناً أو قتل يجب عليه الحد والقصاص، وأنهما لا يجبان على غير العاقل، دل أن عقله جعل قائما، وقد يعطى للزائل حقيقة حكم القائم تقديرا إذا زال بسبب هو معصية للزجر والردع، كمن قتل مورثه أنه يحرم الميراث، ويجعل المورث حيا زجرا للقاتل وعقوبة عليه۔"(بدائع الصنائع، كتاب الطلاق، فصل فى شرائط الركن، جلد٤، صفحه ٢١٣)

البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور بعض علماء امام طحاویؒ اور امام کرخیؒ اس بات کے قائل ہیں کہ نشہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔

نکاح کی صحت کے لئے گواہوں کا ہونا شرط لازم ہے وقوع طلاق کے لئے نہیں

نکاح ایک ایسا عقد ہے کہ ایک مرد وعورت جو ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہوتے ہیں اور کسی اجنبیہ کی طرف نظر کرنا، اس کا ہاتھ پکڑنا، قریبی تعلقات قائم کرنا ناجائز اور قطعاً حرام ہوتا ہے، اور اس سے جنسی خواہشات پوری کرنے والا زانی سخت سزا اور عذاب خداوندی کا مستحق ہوتا ہے، اجنبی مرد وعورت دونوں ایک دوسرے کے لئے ایسے ہوتے ہیں کہ کسی پر کسی کا کوئی حق نہیں ہوتا، نہ مرد پر نفقہ کی ذمہ داری، نہ ہی عورت پر مرد کی اطاعت کا وجوب، لیکن عقد نکاح کے ذریعہ اجنبی مرد وعورت دونوں ہی ایک دوسرے کے پابند ہوجاتے ہیں، نکاح کے واسطے شوہر اس بات کا التزام اور عہد کرتا ہے کہ میں اپنی منکوحہ کے نفقہ کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں، اور عورت اس بات کا عہد کرتی ہے کہ میں اپنے شوہر کی اطاعت وفرمابرداری کروں گی، اور اس عقد کا اثر یہاں تک پہنچتا ہے کہ شوہر بیوی میں سے کسی ایک کے مرنے کے بعد ہر ایک دوسرے کے مال کا وارث ہوتا ہے، ایک اجنبیہ عورت کہ نکاح سے پہلے جس کا ہاتھ پکڑنا، اس کے ساتھ تنہائی میں ہونا، طرح طرح کی بدگمانیاں اور شکوک میں مبتلا کرتا تھا، لیکن عقد نکاح کے ذریعہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لئے حلال ہوجاتے ہیں، اب نہ کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھنے کی اجازت اور نہ ہی کسی بدگمانی کا موقع، اس لئے شریعت نے نکاح کے منعقد ہونے کے لئے گواہوں کے ہونے کو لازم قرار دیا ہے، کیونکہ یہ تہمت اور بدگمانی کا موقع ہے، اور حکم دیا ہے کہ دو گواہوں کے بغیر نکاح صحیح نہیں ہوگا۔

اور رہ گئی طلاق تو اس میں چونکہ ایک دوسرے پر حقوق کا التزام نہیں، بلکہ جو پابندیاں نکاح کے واسطہ سے ایک دوسرے پر لازم تھیں ان کا اختتام ہوتا ہے، دونوں اب تک جو ایک دوسرے کے لئے حلال تھے، طلاق کے بعد پہلے کی طرح پھر حرام ہوجاتے

ہیں، اور اس میں کوئی شک یا بدگمانی اور تہمت کا موقع نہیں ہوتا، اس لئے شریعت نے اگرچہ وقوع طلاق کے لئے بھی گواہوں کے مقرر کرنے کی ہدایت کی ہے تاکہ دونوں میں کوئی اس کا انکار نہ کرسکے، اور سابقہ حقوق جو نکاح کے واسطہ سے ایک دوسرے کو حاصل تھے، ان کا مطالبہ نہ کرسکے، لیکن شریعت نے نکاح وطلاق دونوں میں اس فرق کو ملحوظ رکھا ہے کہ نکاح میں چونکہ حقوق وعہود کا التزام اور تہمت سے حفاظت ہوتی ہے، اس لئے اس میں گواہوں کے ہونے کو ضروری اور شرط لازم قرار دیا ہے کہ جس کے بغیر نکاح ہی صحیح نہیں ہوگا، اور طلاق میں یہ باتیں نہیں یعنی کوئی تہمت کا موقع نہیں، حقوق کا التزام نہیں بلکہ اختتام ہے، اس لئے اس میں گواہوں کے ہونے کو شرط لازم نہیں قرار دیا کہ اس کے بغیر طلاق صحیح نہ ہو، بلکہ اس کے بغیر بھی طلاق کو صحیح اور معتبر قرار دیا ہے، چنانچہ اسی فرق کے ساتھ قرآن وحدیث میں نکاح وطلاق کے احکام مذکور ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کی صحت کے لئے تو گواہوں کا ہونا شرط لازم ہے، اور طلاق کے وقوع کے لئے گواہوں کا ہونا شرط لازم نہیں ہے، اب قرآن وحدیث کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے:

نکاح وطلاق کی صحت وعدم صحت کے لئے گواہوں کی شرط قرآن کی روشنی میں:

(۱) علامہ کاسانیؒ بدائع الصنائع میں تحریر فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے آیت: "فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ"، اور آیت "الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ"، اور آیت "فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوْجاً غَيْرَهُ۔" ان تینوں آیتوں میں طلاق دینے طلاق واقع ہوجانے اور طلاق کی وجہ سے عورت کے مرد پر حرام ہوجانے کو بغیر کسی شرط کے ذکر فرمایا ہے، حتی کہ نیت کی بھی شرط نہیں ہے، یعنی اگر بغیر نیت کے طلاق دے گا تب بھی طلاق واقع ہوجائے گی، کیونکہ مذکورہ آیتوں میں طلاق کے واقع ہونے کے لئے کوئی شرط نہیں لگائی گئی، نہ نیت کی شرط اور نہ اور کوئی شرط، علامہ کاسانیؒ کی عبارت درج ذیل ہے:

"وقال الله تعالىٰ: فطلقوهن لعدتهن، شرع الطلاق من غير شرط النية،

وقال سبحانه وتعالیٰ: الطلاق مرتان مطلقاً، وقال سبحانه وتعالیٰ: فإن طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیره، حکم سبحانه وتعالیٰ بزوال الحل مطلقاً عن شرط النیة۔" (بدائع الصنائع، کتاب الطلاق، فصل فی شرائط الرکن، جلد٤، صفحه ۲۲۲)

مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ طلاق کے واقع ہونے کے لئے گواہوں کی شرط لازمی نہیں اور طلاق کا واقع ہونا گواہوں کے وجود پر موقوف نہیں۔

(۲) حق تعالیٰ کا فرمان ہے:

"وَأَشْهِدُوا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنكُمْ۔" (سورہ طلاق، پ۲۸، آیت ۲)

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو طلاق رجعی دی ہے تو اب عدت کے اندر اس کو رجوع کرنے کا بھی اختیار ہے، یعنی اگر سابقہ نکاح کو باقی رکھنا چاہے تو اس کو اس کا بھی اختیار ہے، لیکن قرآن نے اس موقع پر یہ ہدایت دی ہے کہ اگر سابقہ نکاح کو باقی رکھنا چاہے یا طلاق کے عمل کو انتہا تک پہنچا کر نکاح کو ختم کرنا چاہے تو دونوں ہی صورتوں میں گواہوں کو مقرر کرلو، یعنی دو گواہوں کے سامنے یہ کاروائی ہونی چاہئے تاکہ بعد میں کسی کو انکار کی گنجائش نہ رہے۔

"قال الشیخ ولی الله الدهلویؒ: وإنما أمر الله تعالیٰ بإشهاد شاهدین علی الطلاق لمعنیین۔" (حجة الله البالغه، باب الطلاق، جلد۲، صفحه ۳٦۲)

امام ابوبکر جصاص رازیؒ نے اس آیت کے ضمن میں اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں جب امساک یا فراق یعنی طلاق رجعی دینے کے بعد عدت کے اندر سابقہ نکاح کو باقی رکھتے ہوئے رجوع کرنا یا عمل طلاق کو انتہا تک پہنچانا یعنی رشتہ کو ختم کرنا اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا، اس کے بعد اشہاد یعنی گواہوں کے مقرر کرنے کا تذکرہ فرمایا، اس سے یقینی طور پر معلوم ہوا کہ یہ امساک یا فراق یعنی بیوی کو ایک یا دو طلاق کے بعد عدت کے اندر رجوع کرنا یا طلاق کو پورے طور پر واقع کردینا گواہوں کے

بغیر بھی معتبر اور درست ہے، کیونکہ اشہاد یعنی گواہوں کے مقرر کرنے کو آیت مذکورہ میں شرط کے طور پر ذکر نہیں کیا گیا کہ طلاق کی صحت گواہوں پر موقوف ہو، گواہوں کا تذکرہ صرف احتیاط کے طور پر ہے تاکہ بعد میں کوئی انکار نہ کرسکے، برخلاف نکاح کے کہ اس کی صحت کو گواہوں پر موقوف اور منحصر کیا گیا ہے، امام ابوبکر جصاصؒ کی عبارت درج ذیل ہے:

"عن العطاء قال: الطلاق والنكاح والرجعة بالبينة وهذا محمول علی أنه مأمور بالإشهاد علی ذلك احتیاطاً من التجاحد لا علی أن الرجعة لا تصح بغیر شهود، ألا تری أنه ذکر الطلاق معها ولا یشك أحد فی وقوع الطلاق بغیر بینة۔"

"وقال أیضاً: لما جعل له الإمساك أو الفراق ثم عقبه بذکر الإشهاد کان معلوما وقوع الرجعة إذا رجع وجواز الإشهاد بعدها إذ لم یجعل الإشهاد شرطا فی الرجعة۔" (احکام القرآن جصاص رازی، جلد٥، صفحه ۳٥۰، ۳٥۱)

نکاح وطلاق کے صحت کے لئے گواہوں کی شرط حدیث کی روشنی میں

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ نکاح کی صحت کے لئے تو گواہوں کی شرط لازم ہے، اور طلاق کی صحت کے لئے گواہوں کی ضرورت نہیں، یعنی بغیر گواہوں کے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے، چند احادیث ملاحظہ ہوں:

(۱) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لا نكاح إلا بشهود، وروی: لا نكاح إلا بشاهدین۔" (بدائع الصنائع، کتاب النکاح، فصل فی الشهادة، جلد۳، صفحه ۳۹٤)

(۲) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"الزانیة التی تنکح نفسها بغیر بینة۔" (بدائع الصنائع، کتاب النکاح،

فصل فی الشهادة، جلد۳، صفحه ۳۹٤)

ان حدیثوں میں رسول اللہ ﷺ نے پوری وضاحت سے فرمادیا کہ گواہوں کے بغیر نکاح کا تحقق نہیں ہوسکتا، اگر کوئی عورت گواہوں کے بغیر نکاح کر لیتی ہے تو وہ نکاح صحیح نہ ہونے کی وجہ سے وہ زانیہ کہلائے گی، علامہ کاسانیؒ ان روایتوں کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ نکاح کی صحت کے لئے اگر گواہوں کی شرط لازم نہ ہوتی تو آپ اس عورت کو زانیہ نہ قرار دیتے۔

آگے تحریر فرماتے ہیں کہ نکاح میں گواہوں کی شرط اس لئے بھی ضروری ہے کہ یہ تہمت اور بدنامی کا موقع ہے، اور گواہوں کے ذریعہ اس تہمت اور بدنامی سے پوری حفاظت ہوجاتی ہے، اس لئے صرف نکاح ہی میں گواہوں کی شرط ہے، یعنی طلاق میں تہمت وبدنامی کا موقع نہیں ہوتا، اس لئے طلاق کی صحت کے لئے گواہوں کی شرط لازم نہیں، علامہ کاسانیؒ کی عبارت درج ذیل ہے:

"لأن الحاجة مست إلى دفع تهمة الزنا عنها، ولا تندفع إلا بالشهود، لأنها لا تندفع إلا بظهور النكاح واشتهاره، ولا يشتهر إلا بقول الشهود، وبه تبين أن الشهادة فی النكاح ما شرطت إلا فی النكاح للحاجة إلى دفع الجحود والإنكار۔"
(بدائع الصنائع، كتاب النكاح، فصل ومنها الشهادة، جلد۳، صفحه ۳۹٤)

ایک حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی، جو کہ شرعاً ممنوع اور ناجائز ہے، رسول اللہ ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے ان کو رجوع کرنے کا حکم دیا، تاکہ حیض ختم ہونے کے بعد حالت طہر میں طلاق دیں، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"عن ابن شهاب قال: أخبرنی سالم، أن عبد الله بن عمرؓ أخبره، أنه طلق امرأته وهی حائض، فذكر عمر لرسول اللهﷺ، فتغيظ فيه رسول اللهﷺ، ثم قال: ليراجعها ثم يمسكها حتى تطهر، ثم تحيض فتطهر، فإن بدا له أن يطلقها فليطلقها طاهرا قبل أن

يمسها۔" (صحيح بخاری، كتاب التفسير، باب سورة الطلاق، حديث ٤٩٠٨)

اس روایت سے کئی باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) حالت حیض میں طلاق دینا شرعاً ممنوع ہے۔

(۲) اگر کسی شخص نے حالت حیض میں طلاق دے دی تو اس کو طلاق سے رجوع کرنا چاہیے۔

(۳) حالت حیض میں دی ہوئی طلاق بھی واقع ہوجاتی ہے، ورنہ آپ رجوع کا حکم نہ دیتے۔

(۵) رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے اس وقت نہ تو یہ سوال کیا کہ طلاق دینے سے پہلے طلاق کی نیت کی تھی یا نہیں اور طلاق دینے پر گواہ طلب کئے یا نہیں؟ اس سے معلوم ہوا کہ بغیر نیت اور بغیر گواہوں کے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے، یعنی طلاق کی صحت اور اس کا وقوع گواہوں پر موقوف ہے، علامہ کاسانی کی عبارت درج ذیل ہے:

"وروينا عن عبدالله بن عمرؓ لما طلق امرأته فی حال الحيض أمره رسول اللهﷺ أن يراجعها، ولم يسأله هل نوى الطلاق أو لم ينو، ولو كانت النية شرطا لسأله، ولا مراجعة إلا بعد وقوع الطلاق، فدل على وقوع الطلاق من غيرنية۔" (بدائع الصنائع، كتاب النكاح، فصل فی شرط النية فی الكناية، جلد٤، صفحه۲۲۲)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی حیاۃ طیبہ میں یہ واقعہ بھی پیش آیا، جس کو حضرت امام محمدؒ نے اپنی سند سے نقل فرمایا ہے اور امام محمدؒ کے حوالہ سے علامہ کاسانیؒ نے نقل فرمایا کہ ایک خاتون نے چھری لے کر اپنے شوہر کے سینہ پر سوار ہوکر کہا مجھے تین طلاق دو ورنہ میں تم کو ذبح کرتی ہوں، اس نے اللہ کا واسطہ دیا لیکن وہ عورت نہ مانی، بالآخر لاچار ومجبور ہوکر شوہر نے تین طلاق دے دیں، رسول اللہ ﷺ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے تینوں طلاق واقع ہونے کا فیصلہ سنایا۔

"وذكر محمد رحمه الله بإسناده أن امرأة اعتقلت زوجها، وجلست

علی صدره، ومعها شفرة فوضعتها علی حلقه، وقالت: لتطلقنی ثلاثا أو لأنفذنها، فناشدها الله أنلا تفعل فأبت، فطلقها ثلاثاً، فذکر لرسول اللهﷺ فقال: لا قیلولة فی الطلاق۔(سنن سعید بن منصور، باب ما جاء فی طلاق المکره، جلد ۱، صفحه ۲۸۵، حدیث ۱۱۳۰، بدائع الصنائع، کتاب الطلاق، باب فی شرائط الرکن، جلد۳، صفحه ۲۱٤)

مذکورہ حدیث سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) مکرہ کی طلاق بھی واقع ہوجاتی ہے، یعنی وقوع طلاق کے لئے طائع اور مرضی ہونے کی شرط نہیں۔

(۲) ایک ساتھ تین طلاق دینے سے تینوں طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں۔

(۳) رسول اللہﷺ کے عہد میں شوہر بیوی کے درمیان یہ واقعہ خلوت میں پیش آیا، یعنی طلاق دینے کے وقت گواہ موجود نہیں تھے، اس کے باوجود رسول اللہﷺ نے گواہوں کو طلب کئے بغیر تینوں طلاقیں واقع ہونے کا فیصلہ فرمادیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ طلاق کی صحت کے لئے گواہوں کی شرط لازم نہیں، ورنہ رسول اللہﷺ اس کے بغیر کیسے وقوع طلاق کا فیصلہ فرمادیتے۔

طلاق سے قبل تحکیم یعنی مصالحت کی کوشش کرنا شرط نہیں، اس کے بغیر بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے

ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ طلاق واقع کرنے سے پہلے حَکَم کے ذریعہ مصالحت کی کوشش کرنا ضروری ہے، اس کے بغیر طلاق دینا صحیح نہیں، جہاں تک طلاق سے پہلے حَکَم کے ذریعہ مصالحت کی کوشش کا مسئلہ ہے تو شریعت نے خود اس کی ہدایت کی ہے کہ پہلے موعظت ونصیحت، پھر ہجر واعراض، پھر ضرب وسختی، پھر دو حَکَم کو بیچ میں ڈال کر مسئلہ حل کرنے اور مصالحت کی کوشش کی جائے، جس کی تفصیل ماقبل میں گزر گئی۔

لیکن جہاں تک سوال اس کا ہے کہ طلاق سے پہلے حکمین کے ذریعہ مصالحت کی

کوشش کرنا کیا ایسی شرط لازم ہے کہ اس کے بغیر طلاق ہی واقع نہ ہوگی، یعنی حکمین کے ذریعہ مصالحت کی کوشش پر ہی طلاق موقوف ہے؟ تو یہ بات ہرگز صحیح نہیں، کیونکہ مرد و عورت، میاں بیوی، اپنے مصالح اور اندرونی مسائل خود ہی اچھی طرح سمجھتے ہیں، اور اپنی صواب دید کے مطابق فیصلہ لیتے ہیں، اور شریعت ان کے فیصلہ کو تسلیم کرتی ہے، اس لئے شریعت نے طلاق کی صحت کو حکمین کی کاروائی پر موقوف نہیں کیا، بلکہ اس کے بغیر بھی طلاق کو تسلیم کیا ہے، قرآن وحدیث سے بھی یہی رہنمائی ملتی ہے، جو درج ذیل ہے:

(۱) قرآن پاک میں طلاق دینے کے سلسلہ میں جو آیتیں وارد ہوئی ہیں:

(۱)"یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاء فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ۔"(سوره طلاق، پ۲۸، آیت ۱)

(۲)"فَإِن طَلَّقَهَا فَلاَ تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّیَ تَنکِحَ زَوْجاً غَیْرَهُ۔"

(سوره بقره، پ۲، آیت ۲۳۰)

(۳)"الطَّلاَقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِیحٌ بِإِحْسَانٍ۔"(سوره بقره، پ۲، آیت ۲۲۹)

(٤)"وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاء فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِکُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ۔" (سوره بقره، پ۲، آیت ۲۳۱)

کسی بھی موقع پر طلاق کو تحکیم یعنی مصالحت کے ذریعہ مصلحت کو شرط نہیں قرار دیا گیا، اور طلاق کو تحکیم کی کاروائی پر موقوف نہیں رکھا گیا، اسی طرح پورے ذخیرہ حدیث میں بھی کہیں بھی طلاق کو حکمین کی کاروائی پر موقوف اور شرط قرار نہیں دیا گیا، بلکہ قرآن وحدیث میں اس کے خلاف واقعات وارد ہوئے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

(۲) سورہ احزاب میں حضرت زینبؓ کا قصہ مفصل مذکور ہے کہ حضرت زینبؓ جو حضرت زید بن حارثہؓ کے نکاح میں تھیں اور دونوں کے درمیان ناخوش گوار حالات تھے، رسول اللہﷺ حضرت زید بن حارثہؓ کو نکاح پر قائم رہنے کی ہدایت فرمارہے تھے،"أمسك

علیك زوجك۔'' لیکن بالآخر تکوینی مصلحت کے پیش نظر نباہ نہ ہوسکا، اور طلاق کی نوبت آ گئی، اور طلاق وعدت کے بعد حضرت زینب رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں آئیں۔

"فلما تشكى زيد للنبی ﷺ خلق زينب وأنها لا تطيعه وأعلمه أنه يريد طلاقها، قال له رسول الله ﷺ على جهة الأدب والوصية: اتق الله، فی قولك: وأمسك عليك زوجك۔" (تفسیر قرطبی، سورہ احزاب، جلد ۱۷، آیت ۱۵۷)

اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے تحکیم کی کاروائی نہیں فرمائی، نہ حضرت زینبؓ کی طرف سے نہ حضرت زیدؓ سے کوئی حکم مقرر ہوا، جو مسائل کو سلجھانے کی کوشش کرتا بلکہ تحکیم کی کاروائی کے بغیر طلاق واقع ہوگئی، اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو جائز قرار دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ طلاق حکمین کی کاروائی پر موقوف نہیں، اور طلاق سے قبل تحکیم کی کاروائی شرط لازم نہیں۔

(۳) ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حفصہؓ کو طلاق دے دی تھی، اور بعد میں رجوع بھی فرمالیا تھا، رجوع فرمانا طلاق واقع ہونے کی دلیل ہے، حالانکہ یہاں بھی طلاق واقع کرنے سے قبل شوہر بیوی کی طرف سے تحکیم کی کوئی کاروائی نہیں ہوئی، نہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اور نہ ہی حضرت حفصہؓ کی طرف سے۔

(۴) ماقبل میں ایک عورت کا اپنے شوہر سے اکراہ کے ذریعہ طلاق دینے کی روایت گذر چکی ہے، نیز حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بھی اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دینے کا تذکرہ ماقبل میں مذکور ہوا، رسول اللہ ﷺ نے سب کی طلاق کو واقع اور تسلیم کیا، حالانکہ اس سے قبل تحکیم کی کوئی کاروائی نہیں ہوئی۔

ان سب روایات وواقعات سے معلوم ہوا کہ طلاق سے قبل تحکیم یعنی دونوں کی جانب سے مصالحت کی کوشش ضروری اور شرط لازم نہیں، بلکہ اس کے بغیر بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

☆☆☆☆☆

تفویض طلاق اور اس کی شکلیں

مولانا رحمت اللہ ندوی
(استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

نکاح ایک عظیم نعمت ہے اور اس کے ذریعہ قائم رشتہ کو پائیدار، خوشگوار اور مستحکم بنانا اسلام میں مطلوب ہے، بلا کسی ناگزیر حالت اور سخت مجبوری کے نکاح کو ختم کر دینا اور طلاق وغیرہ کے ذریعہ سے اس بندھن کو توڑ دینا سخت ناپسندیدہ ہے، پھر جس طرح مرد خود طلاق دے سکتا ہے، وہ اسی طرح یہ اختیار دوسرے کو سونپ بھی سکتا ہے، طلاق دوسرے کو سپرد کرنے کا یہ عمل تفویض کہلاتا ہے، ایسی صورت میں بیوی یا دوسرے شخص کو طلاق واقع کرنے کا اختیار ہے، لیکن تفویض سے شوہر کا حقِ طلاق ساقط نہ ہوگا۔

تفویض طلاق کیا ہے؟

تفویض کے لغوی معنی ہیں: حوالہ کرنا، سونپنا، سپرد کرنا اور لوٹانا، ''فوضّ: (إليه الأمر تفويضاً) رده إليه وجعله الحاكم فيه، ومنه قوله تعالى: ﴿وأفوض أمری إلى الله..... ﴾ فوض المرأةَ تفويضاً: زوّجَها بلا مهر، وهو نكاح التفويض، وفی حديث: فوضت أمری إليك۔ [تاج العروس، باب الضاد، لسان العرب]

لیکن شریعت میں تفویض طلاق (Delegation of the power of divorce) کے معنی ہیں:

''طلاق دینے کا اختیار اپنی بیوی کے سپرد کرنا'' چنانچہ عورت کا مرد سے نکاح کے

وقت یہ شرط کرنا کہ وہ طلاق کی مختار ہے، شرعاً صحیح ہے، اسی طرح شوہر کا اپنی زوجہ کو قیام نکاح کے دوران حقِ طلاق تفویض کرنا بھی جائز ہے۔ (مجموعہ قوانین اسلام ۲/۳۹۲، دفعہ:۱۰۱)

جس مرد کو طلاق کا اختیار ہے وہ اپنا یہ اختیار دوسروں کو سونپ سکتا ہے، اگر اس نے یہ اختیار اپنی بیوی کو دیا کہ وہ اس کی طرف سے اپنے اوپر طلاق واقع کرلے، یا کسی اور شخص کو اس بات کا اختیار دیا کہ وہ اگر چاہے تو اس کی بیوی کو طلاق دے دے، تو یہ تفویض ہے، اور کسی دوسرے عاقل و بالغ کو طلاق دینے کا حکم دے اور اس کے اختیار پر نہ چھوڑے تو یہ توکیل ہے۔

یہ سپردگی اگر طلاق کے لفظ کے ساتھ ہے تو یہ تفویض و توکیل صریح ہوگی، اور اگر ایسے لفظ کے ساتھ ہے جو طلاق کے لئے صریح نہیں ہے تو اس میں شوہر کی نیت کا اعتبار ہوگا۔ (مجموعہ قوانین اسلامی دفعہ:۲۷۹)

تفویض کی دلیل

تفویض طلاق کتاب وسنت اور اجماع وقیاس سے ثابت ہے، جب آیت کریمہ ﴿یاأیها النبی قل لأزواجك إن كنتن تردن الحیوٰة الدنیا وزینتها فتعالین أمتعكنّ وأسرحكنّ سراحاً جمیلاً﴾ [احزاب:۲۸] نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کو اپنے ساتھ رہنے اور نہ رہنے کا اختیار دیا، اسی وجہ سے یہ آیت تخییر کہلاتی ہے، بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اختیار دیا تو ہم نے اللہ اور اس کے رسول کو پسند کیا، تو یہ تخییر طلاق شمار نہ ہوئی، ''عن عائشةؓ قالت: خیرنا رسول الله ﷺ فاخترنا الله ورسوله، فلم یعد ذلك علینا شیئاً'' [بخاری، کتاب الطلاق، باب من خیر أزواجه:۵۲۶۲]

ڈاکٹر وھبہ زحیلیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''والرجل كما یملك الطلاق بنفسه یملك إنابة غیره فیه، ویجوز

تفویض الطلاق للزوجة بالإجماع، لأنه ﷺ خیّر نساءه بین المقام معه وبین مفارقته، لما نزل قوله تعالی: ﴿یاأیها النبی قل لأزواجك..... سراحا جمیلا﴾ [احزاب:۲۸] فلو لم یكن لاختیارهن الفرقة أثر، لم یكن لتخییرهن معنی'' [الفقه الاسلامی وأدلته ۹/۶۹۳۵]

تفویض طلاق کی عقلی دلیل یہ ہے کہ آدمی جس چیز کا خود مالک ہے کسی دوسرے کو بھی اس کا مالک اور مختار بنا سکتا ہے، ''الطلاق تصرف شرعی قولی، وهو حق الرجل كما تقدم، فیملكه ویملك الإنابة فیه كسائر التصرفات القولیة الأخری التی یملكها'' [الموسوعة الفقهیة الكویتیة ۲۹/۴۵]

تفویض طلاق کی شکلیں

احناف کے یہاں شوہر کی اجازت سے کسی اور کو طلاق دینے میں نیابت کی تین شکلیں ہیں: ۱۔ توکیل، ۲۔ تفویض، ۳۔ پیغام۔

''إذن الزوج لغیره فی تطلیق زوجته ثلاثة أنواع: تفویض وتوكیل ورسالة'' [الموسوعة الفقهیة ۲۹/۴۵]

توکیل

توکیل یہ ہے کہ شوہر اپنی طرف سے کسی دوسرے شخص کو اپنی بیوی کو طلاق دینے کا نائب اور قائم مقام بنادے، جیسے وہ کسی شخص کو مخاطب کرکے یہ کہے کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا تم کو وکیل بنایا، تو اگر وہ وکالت قبول کرتے ہوئے اپنے موکل کی بیوی کو طلاق دے تو طلاق پڑ جائے گی۔

تفویض

تفویض یہ ہے کہ شوہر طلاق کا معاملہ اپنی بیوی کے اختیار میں دے یا اپنی طرف

سے اس کو طلاق کا مالک بنائے، یا کسی اجنبی شخص کی مشیئت اور ارادہ پر طلاق کو معلق کردے، مثلاً شوہر اس سے یہ کہے کہ اگر تم چاہو تو میری بیوی کو طلاق دے دو۔

''جعل الأمر باليد أو تمليك الطلاق لزوجة بطلاق نفسها منه، أو تعليق الطلاق على مشيئة شخص أجنبي۔'' [الفقہ الاسلامی وأدلتہ۔۹/۶۹۳۶]

پیغام (Message)

شوہر اپنا پیغام کسی کے ذریعہ بیوی کو بھیجے، مثلاً کسی آدمی سے یہ کہے کہ تم فلانہ کے پاس جاؤ، اور اس سے کہو کہ تمہارے شوہر تم سے ''اختاری'' (اپنے کو اختیار کرلو) کہتے ہیں، تو اس پیغام کے ذریعہ عورت کو طلاق رجعی وغیرہ کا حقِ اختیار عطا کرنا ہے اور یہ تملیکِ طلاق کا فائدہ دیتا ہے، پیغام کی ایک صورت یہ ہے کہ شوہر اپنی غیر حاضر بیوی کو کسی شخص کے ذریعہ طلاق بھیجے، اور قاصد اس کے پاس جاکر اس کے روبرو شوہر کا پیغام پہونچائے تو طلاق پڑ جائے گی، کیونکہ قاصد کی حیثیت صرف سفیر اور ناقلِ کلام کی ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔

الفاظِ تفویض

تفویضِ طلاق کے لئے استعمال ہونے والے الفاظ تین ہیں:

۱۔امر بالید، ۲۔تخییر، ۳۔مشیئت۔

ان میں سے ہر ایک لفظ عورت کو طلاق کا مالک بنانے اور اسے اپنی ذات یا شوہر کے درمیان اختیار دینے کے لئے تملیک کا فائدہ دیتا ہے۔

امر بالید (معاملہ ہاتھ میں دینا):

اس کی صورت یہ ہے کہ شوہر بیوی سے کہے: ''أمرك بيدك'' (تمہارا معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے) یہ کہنے سے طلاق کے سلسلہ میں معاملہ عورت کے ہاتھ میں چلا جائے گا، کیونکہ شوہر نے طلاق کا معاملہ اس کے ہاتھ میں دے دیا ہے، شوہر میں تفویض کی اہلیت ہے اور بیوی محلِ قبول ہے، لہذا دو شرطوں کے ساتھ معاملہ بیوی کے ہاتھ میں چلا

جائے گا:

۱۔شوہر طلاق کی نیت کرے، کیونکہ ''امر بالید'' طلاق کے الفاظ کنایات میں سے ہے، اس لئے بغیر نیت طلاق درست نہ ہوگی۔

۲۔عورت کو اس کا علم ہو، لہذا جب تک عورت یہ جملہ نہ سنے یا اس کو خبر نہ پہونچے، طلاق کا معاملہ اس کے ہاتھ میں نہ جائے گا، اور وہ طلاق دینے کا مختار نہ ہوگی۔

تخییر (اختیار دینا):

تخییر کی صورت یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو اپنے ساتھ رہنے اور نہ رہنے کا اختیار دے، اور کہے کہ ''اختاری'' (تم اپنے آپ کو اختیار کرلو) تو یہ لفظ ''امر بالید'' سے صرف دو چیزوں میں الگ ہے:

۱۔شوہر اگر ''امر بالید'' میں تین طلاق کی نیت کرلے تو درست ہے، لیکن ''اختاری'' میں تین کی نیت درست نہیں۔

۲۔''اختاری'' میں شوہر کے کلام یا بیوی کے جواب میں لفظ ''نفس'' کا ذکر ضروری ہے، جیسے شوہر بیوی سے کہے ''اختاری نفسك'' تو بیوی ''اخترت'' کہے، یا شوہر ''اختاری'' اور بیوی ''اخترت نفسی'' کہے۔

مشیئت (ارادہ، چاہت):

اس کی صورت یہ ہے کہ شوہر کہے: ''أنتِ طالقٌ إن شئتِ'' (اگر تم چاہو تو تم کو طلاق) تو یہ ''اختاری'' کہنے کے درجہ میں ہے، کیونکہ ان دونوں میں سے ہر لفظ تملیکِ طلاق ہے، مگر مشیئت والی صورت میں طلاق رجعی ہوگی اور ''اختیار'' میں بائن پڑے گی، کیونکہ ایک میں تفویض لفظ صریح کے ذریعہ ہے اور دوسرے میں لفظ کنایہ سے ہے۔ (ہندیہ ۱/ ۳۸۷-۴۰۲، الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۹/ ۳۶-۶۹۳۷)

تملیک اور تخییر کا فرق

تملیک کی صورت میں جس میں شوہر بیوی کو اس کی ذات کا مالک بنا دیتا ہے، عورت جو فیصلہ اپنے لئے کرے گی وہی ہوگا یعنی اگر تین طلاق دے تو واقع ہو جائے گی، اِلا یہ کہ شوہر انکار کرے اور یہ کہے کہ میں نے تو صرف ایک طلاق کی نیت کی تھی، تو ایسی حالت میں شوہر سے اس پر حلف لیا جائے گا، لیکن تخییر میں اگر مدخول بہا (وہ عورت جس سے جنسی تعلق قائم ہو چکا ہو) تین طلاق اختیار کرے تو تین طلاق ہی ہوگی، کیونکہ شوہر نے اسے اپنے ساتھ رشتۂ ازدواج میں باقی رہنے یا اس سے نکلنے کا اختیار دیا ہے، لہذا اگر وہ اس سے کم اختیار کرتی ہے تو کچھ واقع نہ ہوگی، لیکن غیر مدخول بہا (وہ عورت جس سے جسمانی تعلق قائم نہ ہوا ہو) مملّکہ (وہ عورت جو کو طلاق کا مالک بنا دیا گیا ہو) کی طرح ہے، اسے اپنے آپ کو تین سے کم طلاق دینے کا اختیار ہے، کیونکہ وہ اس کے ذریعہ شوہر سے جدا ہو جائے گی۔

تفویض اور توکیل میں فرق

حنفیہ کے یہاں اگرچہ توکیل اور تفویض دونوں میں شوہر کا حقِ طلاق سلب نہیں ہوتا لیکن پھر بھی وہ ان دونوں میں حسب ذیل فرق کرتے ہیں:

۱۔ تفویض صادر ہونے کے بعد شوہر اس سے رجوع نہیں کر سکتا، جب کہ توکیل میں موکل رجوع کر سکتا ہے، جب تک کہ وکیل نے اس کا نفاذ نہ کیا ہو، جس کا اسے وکیل بنایا گیا ہے۔

۲۔ تفویض میں مفوّض اِلیہ (جس کے سپرد معاملہ کیا گیا ہے) اپنے اختیار اور مشیتِ نفس سے عمل کرے گا، اس لئے کہ شوہر نے اسے اس حق کا مالک بنایا ہے، لیکن توکیل میں وکیل دوسرے کی مشیت سے کام کرے گا، اور اس مشیت کے موافق کام کرے گا، کیونکہ وکیل کو موکل کا قائم مقام اور نمائندہ سمجھا جاتا ہے نہ کہ موکل کے حق کا مالک۔

۳۔ مطلق تفویض، مجلس کے ساتھ مقید ہے، جب کہ توکیل میں وکیل کو مجلسِ توکیل

کے اندر اور اس کے بعد طلاق دینے کا اختیار ہوتا ہے، بشرطیکہ وکالت مطلق ہو۔

۴۔ شوہر کے جنون سے تفویض باطل نہیں ہوتی، کیونکہ وہ تعلیق کے مفہوم میں ہے، لیکن توکیل شوہر کے جنون سے باطل ہو جاتی ہے، کیونکہ جنون اس کی اہلیت کو ختم کر دیتا ہے اور موکل یا وکیل کا اہلیت سے خروج، وکالت کو باطل کر دیتا ہے۔ (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۹/ ۶۹۴۷)

تفویضِ طلاق بذریعہ دار القضاء

موجودہ حالات میں سماجی مشکلات کو حل کرنے کے لئے ''تفویضِ طلاق'' ایک بہتر شکل ہے، البتہ عورتوں کو حقِ طلاق تفویض کرنا نقصان سے خالی نہیں، اگر خواتین اس حق کا صحیح استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتیں تو شریعت نے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی حقِ طلاق دیا ہوتا، اس لئے خیال ہوتا ہے کہ تفویض طلاق کی ایسی صورت اختیار کرنی بہتر ہے، جس میں طلاق ''دار القضاء'' یا محکمۂ شرعیہ کو دیا گیا ہو، بیوی کے علاوہ دوسروں کو طلاق کا اختیار دینا بنیادی طور پر ''توکیل'' ہے اور وکالت کبھی بھی واپس لی جا سکتی ہے، لیکن اگر کسی تیسرے شخص کی چاہت ومشیت پر طلاق کے استعمال کو موقوف کر دیا جائے تو ''توکیل'' کے بجائے ''تفویض'' ہے، اب شوہر اس اختیار کو واپس نہیں لے سکتا۔ (قاموس الفقہ ۴/ ۳۳۹-۳۴۰)

''پس اگر کچھ شرطوں کے ساتھ دار القضاء کو حق طلاق تفویض کیا جائے اور یہ وسعت برتی جائے کہ عورت قاضی شریعت کے پاس ثبوت شرعی کے ذریعہ ان شرائط میں کوتاہی ثابت کر دے، یا دوسرے قرائن کی بنا پر قاضی کو عورت کے بیان کی صداقت پر اطمینان ہو جائے تو وہ عورت کو طلاق بائن دے سکتا ہے، تو شاید یہ زیادہ بہتر صورت ہو۔'' [ایضاً ص ۳۴۰]

تفویضِ طلاق بوقتِ نکاح

نکاح کے بعد عورت کو مرد کے ظلم وستم، بے رخی، عدم ادائے نفقہ وغیرہ جیسی مشکلات

اور پریشانیوں سے چھٹکارہ دلانے کا ایک حل اور آسان طریقہ تفویضِ طلاق بوقت نکاح ہے، کہ نکاح کے وقت کابین نامہ میں مرد سے ایسی شرطیں لکھوالی جائیں جن کی وجہ سے عورت کو بوقت ضرورت اپنے اوپر خود طلاق واقع کرنے کا اختیار حاصل ہوجائے، تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہے، اس قسم کی تفویضِ طلاق کی تین صورتیں ہیں:

پہلی صورت:

پہلی صورت یہ ہے کہ کابین نامہ نکاح سے پہلے لکھا جائے، اس کے معتبر اور مفید ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ اس میں نکاح کی طرف اضافت ونسبت موجود ہو، مثلاً یہ لکھا جائے کہ اگر میں فلاں بنت فلاں کے ساتھ نکاح کروں اور پھر شرائط مندرجہ اقرار نامہ ہذا میں سے کسی شرط کے خلاف کروں تو فلاں بنت فلاں کو اختیار ہوگا کہ اسی وقت یا پھر کسی وقت چاہے تو اپنے اوپر ایک طلاق بائن واقع کرکے اس نکاح سے الگ ہوجائے، اگر اس میں نکاح کی طرف نسبت واضافت نہ لکھی گئی تو یہ اقرار نامہ محض بے کار ہوگا، اس کی رُو سے عورت کو کسی قسم کا اختیار نہ ہوگا۔

دوسری صورت:

تفویض کی دوسری صورت یہ ہے کہ عین ایجاب وقبول ہی میں زبانی شرائط مذکور ہوں، اس کے صحیح ومعتبر ہونے کی شرط یہ ہے کہ ایجاب عورت کی جانب سے ہو، یعنی اولاً خود عورت (یا اس کا ولی یا وکیل یعنی قاضی نکاح خواں) عقد نکاح کے وقت یوں کہے کہ میں نے اپنے آپ کو (فلاں بنت فلاں کو) تیرے نکاح میں اس شرط پر دے دیا کہ اگر تم نے یہ کام کیا یا وہ کام کیا (جتنی شرطیں لگانا مقصود ہو، سب ذکر کردیا جائے) تو اپنے معاملہ کا اختیار میرے (یا موصوفہ کے) ہاتھ میں ہوگا، یعنی شرائط مذکورہ میں سے کسی ایک شرط کی خلاف ورزی پر بھی اختیار ہوگا، اسی وقت یا پھر کسی وقت چاہوں (یا چاہے) تو اپنے آپ کو ایک طلاق بائن دے کر اس نکاح سے الگ کرسکوں گا (یا کرسکے گی) اس کے جواب میں نکاح کرنے والا مرد یوں کہے کہ میں نے قبول کرلیا (یا شرائط سمیت قبول کرلیا) اس پر

عورت کو اختیار ہوگا کہ وہ جب اپنے اوپر شرائط کے خلاف ظلم ومصیبت دیکھے، اپنے آپ کو ایک طلاق بائن دے کر اس شوہر کے نکاح سے نکل جائے، یعنی اس طرح کہہ دے کہ میں اپنے اوپر ایک طلاق بائن واقع کرتی ہوں، اور اگر ایسا نہ کیا گیا بلکہ ابتدائے کلام (ایجاب) مرد کی جانب سے ہو اور لڑکی والے قبول کے ساتھ تفویض طلاق کی شرط لگادیں تو نکاح بلا کسی شرط کے صحیح ہوجائے گا، اور شرط باطل وبے کار ہوجائے گی۔

تنبیہ: اگر ایجاب عورت ہی کی طرف سے ہو مگر تفویض کی شرط ذکر نہ کی گئی اور مرد نے قبول میں تفویض کی شرط کا اضافہ کردیا تب بھی تفویض صحیح ہوگئی، لیکن چونکہ اس صورت میں صرف مرد کو اختیار ہے خواہ وہ شرط بڑھائے یا نہ بڑھائے، عورت کی جانب سے جب ایجاب بلا شرط کے ہوچکا تو اس کے ہاتھ سے بات نکل چکی، اس لئے جس عورت کا مقصد یہ ہو کہ اس کو طلاق لینے کا اختیار مل جائے اس کے واسطے یہ صورت کافی نہیں، بلکہ ایجاب میں شرط لگانا ضروری ہے، تاکہ مرد کو بلا شرط قبول کرنے کا حق ہی نہ رہے۔

تیسری صورت:

تیسری صورت یہ ہے کہ نکاح کے بعد کوئی اقرار نامہ اس قسم کا شوہر سے لکھوایا جائے، یہ صورت بھی صحیح اور بالکل درست ہے۔

یہ صورت بھی اس عورت کے لئے کارآمد ہے جس کے نکاح میں کابین نامہ نہیں لکھوایا گیا تھا، لیکن جو عورت نکاح کے وقت احتیاط کی طالب ہے اس کے واسطے اس میں وہی کمی ہے جو تنبیہ بالا میں مذکور ہوئی۔

اس لئے مصائب کے وقت خلاصی کی اصل تدبیر پہلی یا دوسری صورت اختیار کرنا ہے۔ (الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ از ص ۴۸ تا ص ۵۲)

اگر بیوی نے بوقت نکاح شوہر سے حقِ طلاق حاصل کرلیا ہو یا وہ نکاح کے بعد اس حق کی مالک بن گئی ہو تو وہ اس حق کو استعمال کرکے خود کو طلاق دے کر رشتۂ زوجیت قطع (ختم) کرسکتی ہے، اور اس طلاق کا اسی طرح اعتبار کیا جائے گا جیسے شوہر نے زوجہ کو وہ طلاق

خوددی ہو۔(مجموعہ قوانین اسلام ۲/۳۹۲)

تفویض یا تملیک کا فسخ

تفویض یا تملیک طلاق کے بعد شوہر زوجہ کے اس حق کو فسخ نہیں کرسکتا، کیونکہ تفویض کے بعد زوجہ اس اختیار کی خود مالک ہوجاتی ہے، خواہ اس حق کو استعمال کرے یا نہ کرے اور جب چاہے کرے، البتہ اگر تفویض طلاق معین مدت کے لئے ہو اور وہ مدت گذر جائے تو عورت کا حق باطل اور بے اثر ہوجائے گا۔(حوالہ بالا)

تفویضِ طلاق سے شوہر کا حق ساقط نہیں ہوتا

واضح رہے کہ تفویضِ طلاق سے خود شوہر کا حق طلاق ساقط نہیں ہوتا، اس لئے اگر تفویضِ طلاق کے بعد شوہر خود سے طلاق بائن دے دے تو عورت کا اختیار باطل اور غیر نافذ ہوجائے گا۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تفویض سے ملکیت کیونکر پیدا ہوئی اور اگر ملکیت عورت کو حاصل ہوگئی تو پھر مرد کا حقِ طلاق کیونکر باقی رہا؟

اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ تفویضِ طلاق دراصل ''خیار طلاق'' ہے اور خیار دینا ایک فعل کے کرنے یا نہ کرنے کا مالک بنانا ہوتا ہے، کیونکہ مخیّر (جس کو اختیار دیا گیا) اس فعل میں اپنی رائے سے تصرف کرتا ہے، لہذا اگر شوہر اپنی زوجہ کو خیار طلاق تفویض کرتا ہے تو گویا وہ اپنی زوجہ کو یہ اختیار دیتا ہے کہ خود کو طلاق دے کر اس مرد کے رشتۂ زوجیت سے علاحدہ کرسکتی ہے اور ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ عورت مالکہ ہوکر تصرف کرتی ہے، جس کا منشا یہ ہے کہ مرد کی اس ملکیت میں عورت بھی تصرف کرسکتی ہے جو اس مرد کے علاوہ ہے، نہ کہ بجائے ہے۔(مجموعہ قوانین اسلام ۲/۳۹۳)

تفویضِ طلاق سے متعلق چند اہم مسائل

☆ اگر شوہر نے اپنی بیوی کو ہمیشہ کے لئے اختیار نہیں دیا اور کوئی مدت متعین نہیں کی تو ایسی صورت میں اسی مجلس تک عورت کو رد وقبول کا اختیار رہے گا، لیکن اگر کسی کو وکیل بنایا ہو، خواہ ہمیشہ کے لئے، تو جب تک اسے وکالت سے معزول نہیں کرے گا، اس وقت تک طلاق دینے کا اختیار وکیل کو ہوگا، اور اگر شوہر نے بیوی کو ہمیشہ کے لئے اختیار دیا، مثلاً یہ کہا کہ جب چاہو اپنے اوپر طلاق واقع کرلو، تو بیوی کے رد کرنے کے باوجود اسے ہمیشہ کے لئے اپنے اوپر واقع کرلینے کا اختیار حاصل رہے گا، اور اگر شوہر نے کوئی مدت مقرر کردی ہے تو بیوی کو اسی مدت تک طلاق واقع کرلینے کا اختیار حاصل ہوگا۔

☆ شوہر نے بیوی یا وکیل کو جتنی طلاق دینے کا حق دیا ہے اس نے اتنی یا اس سے کم طلاق واقع کی تو وہ معتبر ہوگی، اس سے زیادہ طلاق واقع کرنے کا حق نہیں ہوگا۔

☆ شوہر نے بیوی یا وکیل کو جتنی طلاق واقع کرنے کا حق دیا ہے اگر اس نے بیک کلمہ اس سے زیادہ طلاق واقع کردی تو ایک بھی واقع نہ ہوگی، اور اس کا اختیار ساقط ہوجائے گا۔

☆ شوہر نے بیوی یا وکیل کو جس قسم کی طلاق واقع کرنے کا حق دیا ہے ویسی ہی طلاق واقع ہوگی، مثلاً: شوہر نے طلاق بائنہ کا حق دیا اور بیوی یا وکیل نے طلاق رجعی واقع کی تو یہ بائنہ ہی قرار دی جائے گی اور اگر شوہر نے طلاق رجعی کا حق دیا اور اس نے طلاق بائن دی تو طلاق رجعی واقع ہوگی، طلاق بائن نہیں۔

☆ شوہر نے اگر عدد طلاق یا وصف طلاق ذکر کرتے ہوئے تفویض یا توکیل کو عورت یا وکیل کی مشیئت کی شرط کے ساتھ مقید کردیا ہو تو شوہر کے ذکر کردہ عدد یا وصف کی رعایت ضروری ہوگی، مخالفت کی صورت میں طلاق نہ پڑے گی، مثلا: شوہر نے بیوی یا وکیل سے کہا کہ اگر تم چاہو تو اپنے اوپر یا میری بیوی پر تین طلاق یا طلاق بائن واقع کردو، اور اس نے ایک

یا دوطلاق یا رجعی طلاق واقع کی، تو یہ عمل لغو قرار پائے گا، کسی قسم کی کوئی طلاق واقع نہ ہوگی۔

☆ اگر شوہر کسی شخص کو طلاق واقع کرنے کا اختیار دے اور اس میں مشیئت کی قید نہ لگائے تو یہ اختیار ہمیشہ کے لئے حاصل ہوگا، مگر شوہر کو کسی بھی وقت یہ اختیار واپس لینے کا حق ہوگا اور اگر شوہر نے توکیل کو مشئیت پر معلق کیا ہے تو وکیل کو صرف اسی مجلس میں طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا، اس کے بعد نہیں، اور شوہر اس مجلس کے اندر وکیل کو معزول نہیں کرسکتا ہے۔

☆ تفویض طلاق کے بعد شوہر اس سے رجوع نہیں کرسکتا ہے، (لا یملك) الزوج (الرجوع عنه) أی عن التفویض......لما فیه من معنی التعلیق۔ (شامی ۲/۶۶۹)

☆ اگر شوہر نے تفویض متعین مدت تک کے لئے کی ہے اور وہ مدت گزر گئی اور بیوی نے اس مدت کے اندر طلاق واقع نہیں کی تو تفویض ختم ہوگئی۔

☆ اگر تفویض میں مدت کی کوئی تعیین نہیں کی، اور بیوی نے اس تفویض کی اسی مجلس میں رد کردیا، یا بیوی کی مجلس تبدیل ہوگئی اور اس نے طلاق واقع نہیں کی تو ان صورتوں میں بھی تفویض ختم ہوجائے گی۔ (شامی ۲/۶۷۳-۶۷۴، بدائع الصنائع ۳/۱۱۲-۱۱۵، مجموعہ قوانین اسلامی دفعہ: ۲۹۰-۲۹۸)

وآخر دعوانا أن الحمدلله رب العالمین۔

خلع کی حقیقت اور اس کے شرعی وقانونی پہلو

مولانا مفتی محمد ظفر عالم ندوی
(استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

خلع کی ضرورت ومصلحت

باب نکاح میں شریعت اسلامی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ رشتۂ نکاح ایک دفعہ قائم ہونے کے بعد پھر اسے توڑا نہ جائے، اس لئے طلاق کی عام صورتوں کی طرح، طلاق کی خاص صورت ''خلع'' کو بھی پسند نہیں کیا گیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس خاتون نے بلا وجہ اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کیا، اس پر جنت کی بو بھی حرام ہوگی'' (ترمذی ۱/۱۴۲)، لیکن چونکہ بعض دفعہ ازدواجی زندگی کی الجھنوں اور بے سکونیوں کا حل اسی میں مضمر ہوتا ہے کہ زوجین کو ایک دوسرے کی وابستگی سے آزاد کردیا جائے اس لئے شریعت نے ان مخصوص حالات اور مواقع کی رعایت کرتے ہوئے اس کی اجازت دی ہے، لہذا اگر رشتہ کا نباہ ممکن ہو تو عورت کا بلاضرورت خلع کا مطالبہ کرنا مکروہ ہے، حافظ ابن حجر کا بیان ہے:

[وهو مكروه إلا فی حال مخافة أن لا يقيما حدود الله أو واحد منهما ما أمر به وقد ينشأ ذلك عن كراهة العشرة] (فتح الباری ۹/۳۴۶)

''خلع مکروہ ہے، سوائے اس زوجین کے یا ان میں سے ایک سے اللہ کی قائم کی ہوئی حدوں پر قائم رہنے کے سلسلہ میں اندیشہ رکھتے ہوں اور کبھی کبھی اس سے ازدواجی زندگی میں ناخوشگواری پیدا ہوتی ہے) بلکہ ابن قدامہ کا خیال ہے کہ حدیثیں بلا حاجت خلع کو حرام قرار دیتی ہیں: (المغنی ۷/ ۲۴۸)۔ البتہ حاجت وضرورت کے وقت عورت کا مطالبہ

خلع جائز ودرست ہے:[ولا بأس به عند الحاجة] (الدرالمختارعلی الرد۲/ ۵۵۸)اسی طرح اگرعورت کے مطالبہ تفریق کے لئے کوئی معقول وجہ موجود نہ ہواور مرد کی طرف سے ظلم وزیادتی بھی نہ پائی جاتی ہو،مگرعورت کوشوہر کی طرف سے اس درجہ نفرت ہو کہ طبیعت کو کسی طرح اس کے ساتھ رہنے پرآمادہ نہ کرپاتی ہواوراس کی وجہ سے شوہر کے ساتھ حق تلفی کا اندیشہ ہوتو یہ بھی ایک حاجت ہی ہے،جس کی شریعت میں رعایت کی گئی ہےاوراسے دفع کرنے کی ہدایت بھی موجود ہے جیسا آیت قرآنی:﴿فلاجناح علیهما فیما افتدت به﴾ (البقرہ۲/ ۲۲۹) میں صراحت ہےاوراحادیث نبوی میں اس کی طرف رہنمائی موجود ہے۔امام بخاری نے جامع صحیح میں حضرت ثابت بن قیسؓ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے اخلاق وسلوک اوردین کے معاملہ میں شاکی نہیں تھیں اوراس کی برملا معترف تھیں مگراس کے باوجود دل ان کی طرف مائل نہیں تھا اور کہتی تھیں کہ میں نہیں چاہتی ہوں ان کے ساتھ ناشکری اورکفران نعمت کا معاملہ ہو،حضرت ثابت بن قیسؓ نے اپنی بیوی کومہر میں ایک باغ دیا تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ باغ واپس لے لیں اورطلاق دے دیں۔(بخاری،نسائی،ابن ماجہ،بحوالہ نیل الاوطار۶/ ۲۴۶)۔

خلع کی ضرورت ومصلحت پراس مختصر گفتگو کے بعداب ہم اس کی حقیقت اورتفصیل کی طرف آتے ہیں:

خلع کامفہوم

لغت میں خلع کہتے ہیں اتارنے کو،عرب اس لفظ کا استعمال کپڑے اتارنے کے لئے کرتے ہیں،قرآن مجید نے میاں بیوی کوایک دوسرے کے لئے لباس قرار دیا ہے،اس تعبیر پر یہ حسین کنایہ ہے کہ میاں بیوی نکاح کے ذریعہ ایک دوسرے کے لئے لباس بنے ہوئے تھےاس لفظ سے اس کواتارااورختم کیا جارہا ہے۔

احکام شریعت کے ماہرین فقہاء کرام نے خلع کا ایک خاص مفہوم بتایا ہے،مختلف

فقہاء نے مختلف تعبیرات اختیار کی ہیں،ان سب کا حاصل یہ ہے کہ:بیوی کی خواہش پرشوہر کا لفظ خلع یااس کے ہم معنی الفاظ کے ذریعہ کچھ بدل لے کرعقدنکاح کوزائل اورختم کردینا خلع کہلاتا ہے۔

"ازالة ملك النكاح المتوقفه على قبولها بلفظ الخلع (او معناه)"(الدر المختارعلی ردالمحتار۲/ ۵۵۶-۵۵۷، فتح القدیرلابن ھمام۳/ ۱۹۹،مجمع الأنھر آفندی۱/ ۴۴۷، بدائع الصنائع للکاسانی۳/ ۱۵۱وغیرہ۔

الفاظ خلع

لفظ خلع کے علاوہ ہم معنی الفاظ میں فقہاء احناف کے نزدیک''مباراۃ''،مفارقت، طلاق اوربیع وشراء بھی ہیں اورفقہاء مالکیہ کے نزدیک خلع اورمبارات کے علاوہ صلح،فدیہ، اورمفادات کے الفاظ بھی ہیں جن سے خلع ہوجاتا ہے۔مبارات کا لفظ خلع کی طرح عام استعمال میں ہے بالخصوص عدالتوں میں رائج ہے،جس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔

خلع کا ثبوت

خلع کا ثبوت قرآن مجید سے بھی ہےاوراحادیث نبوی سے بھی،آیت قرآنی ہے:

﴿فان خفتم أن لا یقیما حدود الله فلاجناح علیهما فیما افتدت به﴾(البقرہ:۲۲۹)۔

سواگرتم کواندیشہ ہو کہ تم اللہ کے ضابطوں کوقائم نہ رکھ سکوگےتو دونوں پراس مال کے لینے دینے پرکوئی گناہ نہیں جس کودے کرعورت چھوٹ جائے۔

﴿فإن طبن لكم عن شئی منه نفساً فكلوه هنيئا مريئاً﴾ (نساء: ٤)

پھراگروہ اس میں سے کچھ چھوڑ دیں تم ان کواپنی خوشی سے کھاؤمزیدارخوشگوارسمجھ کر۔

﴿وإن إمرأة خافت من بعلها نشوزاً أو إعراضاً فلاجناح علیهما أن یصلحا بینهما صلحاً والصلح خیر﴾ (نساء: ۱۲۸)

اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے زیادتی یا بے التفاتی کا اندیشہ ہو تو اس میں ان کے لئے کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ دونوں آپس میں ایک خاص طریق پر صلح کر لیں اور صلح بہتر ہے۔

احادیث میں حضرت ثابت بن قیسؓ کی بیوی کا واقعہ تفصیل سے مذکور ہے کہ ان کی بیوی نے مہر میں وصول کیا ہوا باغ شوہر کو واپس کر کے خلع حاصل کیا۔

خلع کا معاوضہ

آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی بنا پر جمہور امت اس کے قائل ہیں کہ مال کے بدلہ خلع جائز ہے، ابن رشد مالکیؒ نے اس کے جواز پر امت کا اجماع نقل کیا ہے، سوائے ابوبکر بن عبداللہ مزنی کے کہ ان کے نزدیک شوہر کے لئے بیوی سے طلاق کے بدلہ کچھ لینا جائز نہیں، (بدایۃ المجتہد/۸۲-۸۳) شیخ وھبہ الزحیلیؒ نے ابوبکر بن عبداللہ مزنی کے قول کو شاذ قرار دیتے ہوئے جمہور کے قول کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے: شوہر کا بیوی سے خلع کے بدلہ مال لینا اس صورت میں جائز نہیں ہے جبکہ بیوی راضی نہ ہو، لیکن اگر بیوی مال دینے پر راضی ہو تو اس صورت میں یہ جائز ہے، "وھذا المعنی عند الجمھور الأخذ بغیر رضاھا وأماً برضاھا فجائز" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۶/۷۰۷)۔

اس بارے میں عام طور پر فقہاء نے یہ صراحت کی ہے کہ اگر زیادتی شوہر کی طرف سے ہو اور عورت تنگ آ کر خلع کی طالب ہو تو اس صورت میں عورت سے طلاق کا عوض لینا حرام ہے اور اگر عورت کی طرف سے زیادتی ہو تو اس صورت میں معاوضہ لیا جا سکتا ہے، اس لین دین میں دونوں کے لئے کوئی حرج نہیں جیسا کہ قرآن کی صراحت ہے:

﴿فلاجناح علیھما فیما افتدت بہ﴾ (بقرہ: ۲۲۹)

معاوضہ خلع کی مقدار

مقدار معاوضہ کے سلسلہ میں شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زوجہ کے مہر یا اس کی

رقم سے کم یا زائد عوض کے بدلہ خلع دے، مشہور فقیہ علامہ برہان الدین المرغینانی صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ "اگر نشوز (نافرمانی) شوہر کی طرف سے ہو تو اس کا اپنی بیوی سے خلع کا معاوضہ لینا مکروہ ہے، اور اگر نشوز بیوی کی طرف سے ہو تو اس صورت میں شوہر بیوی سے صرف اپنا دیا ہوا مال واپس لے سکتا ہے اس سے زیادہ لینا مکروہ ہے۔ (ھدایہ ۲/۳۸۴)۔

شوہر کے لئے دیئے ہوئے مال سے زائد نہ لینے کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا وہ قول ہے جو آپ ﷺ نے ثابت بن قیسؓ کی بیوی کے متعلق اس صورت میں فرمایا تھا جبکہ ناانصافی عورت کی جانب سے تھی، چنانچہ جب ثابت بن قیس کی بیوی نے رسول اللہ ﷺ کو جواب دیا کہ جی ہاں! باغ بھی واپس کر دوں گی اور اس کے علاوہ کچھ مال بھی دوں گی تو اس پر آپ ﷺ نے: أمّا الزیادۃ فلا" کہہ کر زیادہ دینے سے منع فرمایا۔ (السنن الکبری للبیہقی)

ایک دوسری روایت جو حضرت عطاء بن عازب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خلع لینے والی بیوی سے صرف وہی مال واپس لو جو تم نے بیوی کو دیا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہ لو۔ (فتح القدیر ۳/۲۰۴)

اس مسئلہ میں صحابۂ کرام، تابعین اور ائمہ مجتہدین سے مختلف اقوال منقول ہیں، بعض کے نزدیک عورت کو جتنا دیا اس سے زائد لینا حرام ہے، بعض کے نزدیک زائد لینا مباح ہے اور بعض کے نزدیک مکروہ ہے۔

اس بارے میں امام کاسانیؒ صاحب بدائع الصنائع کی بات زیادہ واضح اور مزاج شریعت سے میل کھاتی ہوئی ملتی ہے، آپ نے فرمایا: اگر ظلم و زیادتی شوہر کی طرف سے ہو تو اس کے لئے خلع کے معاوضے میں عورت سے کچھ لینا حلال نہیں، یہ حکم دیانۃً ہے لیکن اگر مرد نے معاوضہ لے لیا تو قضاءً درست ہوگا۔ (بدائع الصنائع ۳/۱۵۰)

معاوضہ خلع کی نوعیت

خلع کے عوض کی نوعیت کیا ہو؟ اس بارے میں فقہاء احناف کے یہاں اصول یہ

ہے کہ ہر وہ شئی جو شرعاً مہر ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے اور مہر میں دی جاسکتی ہے، وہ خلع کا معاوضہ ہونے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے، علامہ علاء الدین کاسانیؒ لکھتے ہیں:

"مایصلح عوضا (مهراً) فی النکاح یصلح عوضاً فی الخلع"۔ (بدائع الصنائع ۳/۱٤۷)

اس قاعدہ شرعی کے پیش نظر امام کاسانیؒ نے ذکر کیا ہے کہ خلع میں جو عوض مقرر ہو، شوہر اسی وقت اس کا مستحق ہوگا جبکہ وہ مال متقوم ہو یعنی شریعت کی نگاہ میں مال ہو اور عقد خلع کے وقت موجود ہو، خواہ معلوم ہو یا مجہول، کم ہو یا زیادہ، (حوالہ سابق)۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایسی چیز کو خلع کا عوض بنائے جو شریعت کی نگاہ میں مال نہیں ہے جیسے شراب، خنزیر وغیرہ تو اگرچہ عورت پر طلاق ہوجائے گی مگر مقررہ عوض یا اس کے بدلے کچھ ادا کرنا بیوی کے ذمہ واجب نہیں ہوگا، (فتاوی ہندیہ ۱/۴۹۵) وجہ یہ ہے کہ فقہاء کے یہاں یہ اصول ہے کہ اگر خلع بالعوض ہو اور کسی بنا پر عوضِ خلع باطل ہوجائے تو خلع باطل نہ ہوگا بلکہ طلاق بائن واقع ہوجائے گی۔ شرع اسلامی کا یہ اصول فی زماننا کافی اہمیت کا حامل ہے، بالخصوص اس صورت میں جبکہ شوہر خلع دینے کے لئے بیوی پر طرح طرح کی شرائط عائد کرتے اور مختلف قسم کا دباؤ بنا کر بیوی کو مشکل میں ڈالتے ہوں، فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگر خلع میں فاسد شرطیں لگائی جائیں تب بھی خلع درست ہوجائے گا۔ مشہور فقیہ برہان الدین المرغینانی صاف لکھتے ہیں:

"ان الخلع لا یبطل بالشروط الفاسدة"(فتح القدیر لابن همام جلد۳/۲۰٦)

خلع شروط فاسدہ سے باطل نہیں ہوتا

اسی طرح بدل خلع اگرچہ مبہم ہو معلوم اور متعین نہ ہو تب بھی خلع ہوجائے گا، حالانکہ معاملات میں عام طور پر عوض کی پوری تعین وتحدید ضروری ہوتی ہے ورنہ معاملہ فاسد ہوجاتا

ہے، مگر خلع کا معاملہ عام معاملات سے مختلف ہے، اس میں خلع کا عوض اگرچہ مبہم ہو جب بھی بدل خلع کی تعیین درست ہوجاتی ہے، مثلاً: کوئی شخص یہ کہے کہ اس بکری کے حمل میں جو کچھ ہے اس پر خلع کرتا ہوں تو خلع درست ہوگا اور بکری حمل والی ہے تو اس کے حمل کا وہ حقدار ہوگا۔ (الدر المختار علی رد المحتار ۲/۵۶۰-۵۶۱)، بدل خلع میں اس کی بھی گنجائش ہے کہ خلع کے عوض کو شوہر اپنے یا اپنی بیوی یا کسی تیسرے شخص کے فیصلہ پر موقوف کردے۔

حق مہر ونفقہ سے دستبرداری

خلع کے عوض عورت اپنے کسی بھی حق سے دستبردار ہوسکتی ہے خواہ نکاح سے متعلق ہو یا دیگر دیون وحقوق سے، جیسے نفقہ عدت، زمانہ نکاح کا نفقہ، یا خود مہر، لیکن عورت کا ایسا حق جس سے دوسروں کا حق بھی متعلق ہو اس سے دستبردار نہیں ہوسکتی، جیسے حق حضانت۔ مشہور فقیہ وماہر قانون شرعی شیخ وھبۃ الزحیلی لکھتے ہیں::

" یسقط بالخلع فی رأی أبی حنیفة کل الحقوق والدیون التی تکون لکل واحد من الزوجین فی ذمه الآخر والتی تتعلق بالزواج الذی وقع الخلع منه کالمهر والنفقة المتجمدة لأن المقصود منه قطع الخصومة والمنازعة بین الزوجین" (الفقه الاسلامی ۹/۷۰۳۷)

حق پرورش سے دستبرداری

خلع کے عوض بچوں کے حق پرورش کے متعلق فقہاء احناف کا یہ مسلک ہے کہ بچہ کی پرورش کا حق تنہا عورت کا حق نہیں، اس سے خود اس بچہ کا حق بھی متعلق ہے، اس لئے عورت کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ خلع کے عوض اس حق سے دستبردار ہوجائے، اگر دستبرداری کی شرط لگا بھی دے تو شرط باطل ہوجائے گی، لیکن خلع ہوجائے گا اور عورت پر طلاق ہوجائے گی۔ (المبسوط ٦/۱۶۹)۔

حق سکنیٰ (رہائش) سے دستبرداری

بدل خلع میں نفقہ کے ساتھ اگر حق رہائش سے دستبرداری اختیار کرے تو کیا عورت کا یہ حق ساقط ہوجائے گا؟ اس مسئلہ میں فقہاء احناف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس سے حق شرع بھی متعلق ہے، اس لئے اگرچہ خلع ہوجائے گا لیکن حق سکنیٰ ساقط نہیں ہوگا، صاحب الدر المختار لکھتے ہیں:

"فتسقط النفقة لا السكنىٰ لأنها حق الشرع إلا إذا أبرأته عن مؤونة السكنىٰ، فيصح الخلع' بأن كانت ساكنة في بيت نفسها أو تعطى الأجرة من مالها فيصح التزامها ذلك۔(الدر المختار مع رد المحتار ۳/۴۵۵)۔

علامہ حصکفیؒ اور ابن عابدین شامیؒ کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عورت شوہر کو بدل خلع میں سکنیٰ سے بری کردے تو یہ شرط معتبر نہیں، ہاں! اگر یوں کہے کہ وہ شوہر کی طرف سے "سکنیٰ" کے کرایہ کی ذمہ دار ہوگی تو اب یہ شرط معتبر ہوگی۔

بلا ذکر عوض خلع

اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو خلع دیدے لیکن عوض کا ذکر نہ ہوا تو کیا اس سے زوجہ کا مہر ساقط ہوگا یا نہیں؟ اس بارے میں فقہ حنفی میں مختلف اقوال ملتے ہیں، ان سب کا حاصل یہ ہے کہ عورت کا حق مہر ساقط نہیں ہوگا، ظاہر الروایہ میں یہی صراحت ہے، لیکن محیط میں ہے کہ اس وقت جو کچھ مہر عورت نے وصول کرلیا ہے وہ اس کا رہے گا، لیکن جو شوہر کے ذمہ باقی تھا وہ ساقط ہوجائے گا۔(ہدایہ ۲/۲۷۸، فتح القدیر ۳/۲۱۹) البتہ فتاوی عالمگیری میں ہے کہ اگر مرد نے عورت سے عوض کا ذکر کئے بغیر خلع کیا تو زوجین میں سے ہر ایک دوسرے کے حقوق سے بری الذمہ ہوجائے گا، اگر عورت مہر لے چکی ہے تو وہ مہر شوہر کو واپس کرنا ہوگا کیونکہ خلع کا ذکر ہی عرفاً مال کے ذکر کے ساتھ تصور کیا جاتا ہے۔(فتاوی عالمگیری ۲/۲۱۹)۔

مبارات

خلع ہی طرح مبارات کا بھی رواج ہے، بالخصوص عدالتوں میں خلع ہی کی طرح اس کو استعمال کیا جاتا ہے، اس تناظر میں اس کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے، مبارات کے لغوی معنی ایک دوسرے سے بری ہونے کے ہیں۔

مبارات میں ایجاب (پیش کش) زوج یا زوجہ دونوں میں سے کسی ایک کی طرف سے ہوسکتا ہے اور اس کے قبول ہوجانے کے ساتھ ہی نکاح کی کامل تنسیخ عمل میں آجاتی ہے، اس کے لئے کسی قاضی کے حکم کی ضرورت نہیں۔

مبارات اپنے اثر کے لحاظ سے خلع کی طرح طلاق بائن کا حکم رکھتی ہے۔(البحر الرائق ۴/۱۷) مبارات دراصل ایک باہمی معاہدہ ہے، جو فریقین کی رضامندی سے عمل میں آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ زوجین کسی سبب سے عقد نکاح کو ختم کرنے کے لئے باہمی طور پر متفق ہوجائیں تو وہ بلا اجازت عدالت ایسا کرنے کے مجاز ہیں، شرع اسلامی میں اس طرح اپنے طور پر فریقین علحدہ ہونے کا عمل خود انجام دے سکتے ہیں، اور فریقین جو معاہدہ کریں گے اگر وہ شرع کی نظر میں فاسد نہ ہو تو وہ بھی نافذ ہوگا، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ مبارات سے زوجین کے ایک دوسرے پر جملہ حقوق جو اس وقت بسبب نکاح قائم ہوں ساقط ہوجائیں گے إلا یہ کہ اس کے خلاف کوئی معاہدہ ہوگیا ہو۔

ہمارے ملک میں زوجین کے درمیان جو تنازعات پیش آتے ہیں اور شوہر بذات خود رشتہ ازدواج سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہوں، دوسری طرف ملکی قانون کے پیش نظر دشواریوں کا سامنا ہو تو قانون مبارات سے فریقین فائدہ اٹھاتے ہوئے باہمی رضامندی سے معاہدہ کرکے چھٹکارا حاصل کرسکتے ہیں، اس میں دونوں کے لئے شرعاً گنجائشیں موجود ہیں۔

کچھ بنیادی اور ضروری احکام

حکم خلع کی حیثیت:

خلع سے متعلق کچھ احکام ایسے ہیں جن کی حیثیت بنیادی ہے، جن کو سامنے رکھنا ضروری ہے، ان احکام میں ایک بنیادی حکم یہ ہے کہ حکم خلع کی حیثیت کیا ہے؟ طلاق کی یا فسخ وتفریق کی؟

اکثر فقہاء جن میں حنفیہ، مالکیہ اور شوافع بھی ہیں کے نزدیک یہ ہے کہ خلع سے طلاق بائن واقع ہوتی ہے۔ (المغنی ۷/ ۲۴۹)، حنابلہ کے یہاں ایک قول اسی کے مطابق ہے اور ایک قول کے مطابق ''فسخ'' ہے یعنی اس کا شمارہ طلاق میں نہیں ہے، اسی طرح کی ایک رائے شوافع کی بھی ہے۔ (المغنی ۷/ ۲۴۹)

اس اختلاف کا اثر اس صورت میں ظاہر ہوگا جبکہ کسی نے اپنی بیوی کو پہلے دو طلاقیں دی تھیں، پھر خلع کی نوبت آئی تو عام فقہاء کے نزدیک اب اس عورت پر تین طلاق واقع ہوچکیں۔ اور جو لوگ خلع کو فسخ کہتے ہیں ان کے نزدیک دو ہی طلاق واقع ہوئیں۔

خلع کے لئے قضاء قاضی کی حیثیت

عام طور پر یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا خلع کے لئے قاضی کا فیصلہ ضروری ہے؟ یا زوجین بذات خود اپنی رضامندی سے اس عمل کو انجام دے سکتے ہیں؟

اس مسئلہ میں جمہور فقہاء کی رائے یہی ہے کہ خلع کے لئے قاضی سے رجوع کرنا اور قاضی کا فیصلہ کرنا ضروری نہیں:

"ولا يفتقر الخلع إلى حاكم نص عليه احمد فقال: يجوز الخلع دون السلطان وروى البخارى عن عمرؓ وعثمانؓ وبه قال شريح والزهرى، ومالك والشافعى واسحاق وأهل الرأى" (المغنى ٧/ ٢٤٦)۔

فقہ حنفی کی کتاب المبسوط از سرخسی میں صراحت ہے کہ خلع سلطان کے سامنے بھی جائز ہے اسی طرح غیر سلطان کے سامنے بھی:

"والخلع جائز عند السلطان وغيره" (المبسوط للسرخسى ٦/ ١٧٣)۔

خلع کے لئے حکم (ثالث) کی حیثیت اور اختیارات

خلع سے متعلق ایک اہم بحث یہ بھی آتی ہے کہ اگر زوجین کے درمیان اختلاف بڑھ جائے اور اس کے حل کے لئے قاضی حکم (ثالث) مقرر کرے تو حکم کے کیا اختیارات ہوں گے؟ اس سلسلہ میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کا اختیار مکمل طور پر مرد ہی کے ہاتھ میں ہے، قاضی خود یا قاضی کی طرف سے مقرر کئے ہوئے حکم بطور خود عورت کو طلاق نہیں دے سکتا، اس نقطۂ نظر کی تائید میں احناف اس عام اصول کو سامنے رکھتے ہیں کہ طلاق کا اختیار مرد کے ہاتھ میں ہے اور خلع بھی مال کے عوض میں طلاق ہی ہے، اسی لئے مرد کی آمادگی بہرطور ضروری ہوگی، اسی بنا پر ان کے یہاں حکمین کی حیثیت زوجین کے وکیل کی ہوتی ہے اور وہ انہی حدود ہی میں رہ کر اقدام کرسکتا ہے جو زوجین نے متعین کردی ہیں۔

اس کے برخلاف امام مالک یہ رائے رکھتے ہیں کہ قاضی زوجین کے حد سے گذرے ہوئے باہمی اختلاف کی صورت میں ایک دورکنی کمیٹی تشکیل دے گا، جس میں بہتر ہے کہ ایک مرد کا رشتہ دار ہو اور دوسرا عورت کا اور اتفاق کی کوئی صورت نکل آئے تو دونوں میں یہ کمیٹی مصالحت کرادے اور اگر یہ ممکن نہ ہوسکے اور ارکان کمیٹی کی رائے ہو کہ باہم تفریق اور علاحدگی کردی جائے تو وہ بھی کرسکتے ہیں، اس کی عملی شکل یہ ہوگی کہ مرد کے رشتہ دار حکم طلاق دے اور عورت کا رشتہ دار حکم مہر معاف کردے یا جو معاوضہ مناسب سمجھے عورت کو اس کی ادائیگی کا پابند کرے اور دونوں میں تفریق کردے۔

مالکیہ نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں اس آیت کریمہ کو سامنے رکھا ہے:

﴿وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من اهلها إن يريدا اصلاحا يوفق الله بينهما﴾ (النساء: ٣٥)

اگر تم کو ان دونوں کے درمیان شدید اختلاف کا اندیشہ ہو تو ایک ایک حکم مرد وعورت

کے خاندان سے بھیجو، اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا کردے گا۔

اوراس آیت سے استدلال کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ آیت کے مخاطب قضاۃ اور حکام ہیں اور اکثر مفسرین کی بھی یہی رائے ہے، دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے ''حکم'' کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی خود فیصلہ کرنے والے کے ہیں۔ تیسری بات اس میں یہ بھی ہے کہ قرآن نے ''إن یریدا اصلاحاً'' کہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکمین کی طرف ارادہ اور چاہنے کی نسبت ہے اور یہ بات اسی کے بارے میں کہی جاسکتی ہے جو کسی کام کے کرنے اور اس کے خلاف اقدام کرنے کا اختیار رکھتا ہو۔

استدلال کے ان پہلوؤں پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام مالکؒ کی رائے زیادہ قوی اور لائق توجہ ہے، اور اکثر فقہاء کی رائے بھی یہی ہے، صحابہ میں حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا یہی نقل کیا گیا ہے، اس موضوع پر تفصیلی گفتگو فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی کی کتاب ''طلاق وتفریق'' میں موجود ہے، مولانا موصوف نے علماء کرام اور ارباب افتاء کو موجودہ حالات کے تناظر میں اس جانب غور کرنے پر توجہ دلائی ہے۔

راقم کا خیال ہے کہ ہمارے ملک میں ''طلاق ثلاثہ'' قانون آنے کے بعد اس مسئلہ میں جو پیچیدگیاں آئی ہیں، ان کا حل مالکیہ کی رائے پر عمل کرنے سے کافی حد تک آسان اور کئی مسئلوں میں فقہ مالکی سے استفادہ کرتے ہوئے حل نکالا بھی ہے۔ اس سلسلہ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا اقدام اور ان کی جدوجہد نیز ''الحلیۃ الناجزۃ'' جیسی کتاب بطور نمونہ موجود ہے۔

یہ مسئلہ اس تناظر میں بھی کافی اہمیت کا حامل ہوجاتا ہے کہ جب کہ عام طور پر عائلی مسائل سے دلچسپی رکھنے اور مختلف اقوام کے پرسنل لا پر نظر رکھنے والوں کی طرف سے یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ طلاق دینے کا کلی اختیار جب مرد کو حاصل ہے اور عورت کو خلع کرانے

کی اجازت حاصل ہے، وہ بھی مرد ہی کی صوابدید واختیار پر موقوف ہے تو عورتوں کو مردوں سے علحدگی کا اختیار کہاں رہ جاتا ہے؟ اور عدالت کو بھی اس معاملہ میں کوئی قانونی اختیار حاصل نہیں ہے، بالخصوص جب مرد ظلم وسرکشی پر اتر آئے اور عورت کو چھٹکارا نہ دینے پر تلا رہے تو ایسی صورت میں عورت کے لئے چھٹکارا کی کیا شکل رہ جاتی ہے؟

بلاشبہ یہ سوال مرد وعورت کے یکساں حقوق کے رجحان کے دور میں ٹالا نہیں جاسکتا اور مرد کو دیئے ہوئے اختیار طلاق کے اسباب ومصالح کو بتا کر موجودہ ذہن کو مطمئن نہیں کیا جاسکتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شریعت اسلامی نے مرد کو جن اسباب ومصالح کے پیش نظر طلاق کا اختیار دیا ہے، وہ اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور مرد وعورت دونوں کے مفادات کے مطابق ہیں، ان سب کے باوجود اس باب میں عورت کے لئے شوہر سے علحدگی اختیار کرنے کا جو راستہ خلع کی صورت میں شریعت نے بتایا ہے، وہ بھی مرد کی صوابدید پر موقوف ہونے کی صورت میں عام ذہنوں میں نقص کا پہلو رکھتا ہے۔

ناچیز کے خیال میں سیدنا امام مالکؒ جیسے عظیم المرتبت اور ملت اسلامیہ کے ممتاز فقیہ کی رائے پر عمل کرتے ہوئے وقت کے قضاۃ وحکام دور کنی کمیٹی تشکیل دے کر زوجین کے درمیان مصالحت نہ ہونے کی صورت میں اپنا اختیار استعمال کرکے عورت کو ہٹ دھرم شوہر سے چھٹکارا دلا کر یہ نقص دور کیا جاسکتا ہے۔

شوہر کی طرف سے خلع کی پیش کش

جمہور فقہاء کے نزدیک خلع کی پیش کش شوہر کی طرف سے بھی ہوسکتی ہے اور اس کا حکم وہی ہوگا جو عورت کی طرف سے پیش کش کرنے میں ہے، فقہاء احناف نے بھی اسے تسلیم کیا ہے لیکن اسے یمین کے درجہ میں مانا ہے، یعنی یہ پیش کش ناقابل واپسی اقرار ہے، جس کا اثر یہ ہوگا کہ شوہر اپنی بات سے رجوع نہیں کرسکتا، اسی طرح شوہر نے جس مجلس

میں خلع کی پیش کش کی ہے اس کے بعد بھی بیوی کو خلع کا حق باقی رہتا ہے، مجلس تک محدود نہیں رہتا، البتہ شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خلع کو کسی شرط کے ساتھ مشروط کرے یا مستقبل کے کسی وقت کے ساتھ متعلق کردے، ایسی صورت میں اس مقررہ وقت کے آنے ہی پر عورت کا قبول معتبر ہوگا، مثلاً شوہر اگر یہ کہے کہ فلاں جب آجائیں تو اس وقت تجھے فلاں عوض پر خلع دوں گا تو اس شخص کے آنے پر عورت شرط پوری کرکے خلع حاصل کرسکے گی۔
(الفقہ الاسلامی وادلتہ للدکتور وھبہ الزحیلی ۹/۷۰۱۶)

خلع کا قانونی پہلو

ماہرین سے رجوع کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ خلع سے متعلق مسلمانوں کے لئے کوئی مستقل قانون وضع نہیں کیا گیا ہے، البتہ جج حضرات مسلم پرسنل لا کے تحت قانون شریعت کی شقوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ سناتے یا بسا اوقات دارالقضاء کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، اس بارے میں ناچیز کے پاس باقاعدہ معلومات نہیں ہیں اور نہ ہی کوئی ڈائریکٹری ہے جس سے معلومات حاصل کی جاسکے۔

جہاں تک ممالک اسلامیہ اور عرب ملکوں کے قوانین میں قانون خلع کا مسئلہ ہے تو اس بارے میں عام طور پر وہی قوانین نافذ ہیں جو شریعت کے احکام ہیں، جمہوریہ اسلامی مصر میں حسب احکام دفعہ ۲۸۰ قانون نمبر: ۳۱ بابت ۱۹۱۰ء اس کے لئے عام حنفی قانون کے مطابق عمل کی اجازت ہے، چنانچہ مجموعۃ الاحکام الشرعیہ کی کچھ دفعات ۲۷۳ تا ۲۷۸ اس موضوع پر ملتی ہیں، شام اور عراق میں بھی تقریباً یہی دفعات ہیں اسی طرح دیگر مسلم ممالک میں اسی قسم کی دفعات پائی جاتی ہیں۔

اس موضوع پر ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب نے اپنی کتاب ''مجموعہ قوانین اسلام جلد دوم'' میں کچھ معلومات فراہم کی ہیں۔

خلع اور مبارات سے متعلق کچھ سوالات وجوابات

خلع اور مبارات سے متعلق ہمارے وکلاء کی طرف سے کچھ سوالات موصول ہوئے ہیں، یہاں ہم ان سوالات کے ساتھ ان کا مختصر جواب بھی درج کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

سوال: ایک سوال یہ ہے کہ مسلمان بیوی کو خلع کا جو حق دیا گیا ہے اس کا موازنہ مسلم شوہر کو دیئے گئے حق طلاق کی طاقت سے نہیں کیا جاسکتا، ایسا کیوں؟

جواب: بلاشبہ یہ ایک اہم سوال ہے، اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں اسلام کے نظام نکاح وطلاق کو سمجھنا ہوگا، قانون نکاح وطلاق پر غور کریں گے تو یہ معلوم ہوگا کہ اسلام نے زوجین کے مابین تمام سسٹم میں اہم ذمہ داریاں شوہر کے ذمہ رکھی ہیں، تمام مالی ومعاشی ذمہ داریاں شوہر پر ہیں، مہر ہو یا نان ونفقہ یا رہائش، نیز بچوں کے تمام تر اخراجات باپ کے سر ہیں اور عورتوں پر کسی طرح کی مالی ومعاشی ذمہ داریاں نہیں رکھیں، جس کا فطری اور قانونی تقاضا یہی ہونا چاہئے کہ جنہوں نے عقد نکاح کے ذریعہ یہ ذمہ داریاں قبول کی ہیں، انہی کی صوابدید اور اختیار سے یہ ختم ہوں، اس سسٹم میں اگر عورت کو یکساں اختیار اور قوت حاصل ہو تو فریق ثانی پر ایسی زیادتیاں ہوتیں، جن کا تدارک ممکن نہ ہوتا اور یہ نظام عدل وانصاف کے تقاضے کے خلاف ہوتا، اگر عورت کو طلاق وخلع کا کلی اختیار ہوتا تو اس صنف نازک کی فطری جذباتیت، تلون مزاجی اور بسا اوقات نتائج سے بے خبری جو اگرچہ اپنے اندر ایک حسن رکھتی ہیں لیکن ان کا خمیازہ مسلسل فریق ثانی کو بھگتنا پڑتا، پھر غور کیا جائے کہ علحدگی کی صورت میں عورت کے لئے اسلامی نظام معاشرت کے اعتبار سے دوسری نئی ازدواجی زندگی کا آغاز مشکل نہیں بلکہ آسان ہوتا، لیکن مرد کے لئے تمام تر ذمہ داریوں کے ساتھ پھر گھر بسانا آسان نہیں بلکہ دشوار کن مرحلہ ہوتا، یہ باتیں ہمارے ہندوستانی ماحول کے تناظر میں اگرچہ بے جوڑ اور غیر منطقی معلوم ہوتی ہیں، لیکن اسلامی معاشرہ میں ان کا سمجھنا دشوار نہیں، علاوہ ازیں شرع اسلامی نے طلاق جیسے قوی اختیار دے کر شوہر کو بے لگام نہیں چھوڑا ہے بلکہ بہت سی پابندیاں لگا کر مردوں کو حقوق زوجیت کی ادائیگی اور حسن معاشرت کے اصولوں میں جکڑ دیا ہے۔

سوال: ایک دوسرا سوال یہ ہے کہ شوہر خلع کے لئے سخت شرائط عائد کرتا ہے تو اس

صورت میں بیوی اپنی شرائط کیسے مؤثر بنا سکتی ہے؟

جواب: اصولی جواب یہ ہے کہ شرع اسلامی نامناسب شرائط کو قبول نہیں کرتا ہے، اگر شوہر غیر شرعی شرائط لگا بھی دے تب بھی خلع ہو جائے گا اور شرائط غیر معتبر ہوں گی، مقالہ میں پیچھے فقہاء کی عبارتیں درج ہیں۔

سوال: ازدواجی بندھن سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بیوی کے پاس خلع یا اس کے علاوہ کیا کوئی اور طریقہ ہے جسے وہ زبردستی چھٹکارا پا سکے؟

جواب: اسلامی قانون میں اس کی بہت سی گنجائشیں ہیں، قانون فسخ وتفریق موجود ہے، دارالقضاء سے رجوع کر کے عورت اپنی باتیں رکھ کر بذریعہ قاضی چھٹکارا حاصل کر سکتی ہیں، یا بذریعہ حکم بغیر قضاء قاضی کے علحدگی حاصل کی جا سکتی ہے۔

سوال: کیا خلع کے لئے حلالہ ضروری ہے؟ اگر بیوی دوبارہ پہلے شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہو؟

جواب: خلع سے صرف ایک طلاق بائن واقع ہوتی ہے، اس لئے اس میں حلالہ کی ضرورت ہی نہیں ہے، دوبارہ نکاح کر کے دونوں ایک ساتھ ازدواجی زندگی گذار سکتے ہیں۔

سوال: اگر شوہر نے خلع کے لئے نابالغ بچوں کو اپنے ساتھ رکھنے کی شرط عائد کی، تو کیا یہ شرط دودھ پلانے والی ماں کے لئے سخت نہیں ہوگی؟

جواب: یہ شرط غیر شرعی اور فاسد ہے، یہ غیر معتبر ہوگی اور خلع درست ہو جائے گا، اور عورت چھٹکارا پالے گی۔

سوال: کیا خلع میں عدت ضروری ہے؟

جواب: طلاق کی طرح خلع میں بھی عدت ضروری ہے، عدت کے بعد ہی عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کر سکے گی۔

اس مجلس میں اسی حد تک گفتگو پر اپنی بات ختم کرتا ہوں اور اللہ رب العالمین سے حق وصواب اور مزید ہدایت وتوفیق کی دعا مانگتا ہوں۔ ☆☆☆☆

فسخ نکاح

(مفقود الخبر، غائب غیر مفقود، عدم ادائے نفقہ)

مولانا محمد مستقیم ندوی

(استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

ہندوستان کے آئین میں ہر مسلمان کو اپنے پرسنل لا پر عمل کرنے کی آزادی دی گئی ہے، دستور ہند کی مختلف دفعات میں اس کا باقاعدہ ذکر موجود ہے، نکاح وطلاق کے بہت سے ایسے مسائل ہیں، جن میں سرکاری عدالت کا فیصلہ شرعاً معتبر نہیں ہے، ایسے مسائل کے حل کے لئے امیر یا قاضی کا ہونا ضروری ہے، اس پس منظر میں پریشان حال مسلم خواتین کے مسائل کے حل کے لئے دارالقضاء کا قیام ناگزیر ہے، عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ فیملی کورٹ میں مسلم خاندانوں کے عائلی مسائل زیر التواء ہیں، سالہا سال تک کوئی حل نہیں نکلتا ہے، اس تناظر میں عورت کے سامنے بڑی آزمائش ہوتی ہے کہ شوہر اُسے چھوڑتا بھی نہیں ہے کہ دوسرا نکاح کرے اور نہ ہی اس کے حقوق ادا کرتا ہے بلکہ معلقہ بنا کر رکھتا ہے، ایسے حالات میں دارالقضاء کی ذمہ داری ہے کہ وہ خواتین کو انصاف دلانے کی کوشش کرے اور ان کو باعزت زندگی گذارنے کا موقع فراہم کرے، عورتوں کو شوہروں کی طرف سے جو دشواریاں پیش آتی ہیں ان میں سب سے اہم مفقود الخبر کا مسئلہ ہے، شوہر غائب ہو جاتا ہے اور بیوی کی خبر گیری نہیں کرتا ہے، آج کے مقالہ میں مفقود الخبر کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے گا، اور ان کا شرعی حکم بیان کیا جائے گا۔

مفقود الخبر: ایسے لاپتہ شخص کو کہتے ہیں جس کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے، لاپتہ شخص سے متعلق دو باتیں اہم ہیں:

اول: یہ کہ اس کے چھوڑے ہوئے مال کا کیا حکم ہوگا؟

دوسرا: یہ کہ لاپتہ شخص کا نکاح اس کی بیوی سے باقی رہے گا یا قاضی اس کی بیوی کا نکاح فسخ کرسکتا ہے؟

مفقود الخبر شخص کے چھوڑے ہوئے مال کا حکم یہ ہے کہ جب تک لاپتہ شخص کی موت کا یقینی علم نہ ہوجائے، اس وقت تک اس کا مال موقوف ومحفوظ رکھا جائے گا، دارالقضاء میں وارثین درخواست دیں تو اس کے بارے میں اچھی طرح تحقیق وتفتیش کے بعد شرعی ضابطہ کے مطابق قاضی مفقود شخص کی موت کا حکم صادر کرے، اس کے بعد اس کا مال موجود ورثہ میں شرعی حصوں کے مطابق تقسیم کردیا جائے گا۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مفقود شخص کی بیوی کا کیا حکم ہوگا؟

لاپتہ شخص کی بیوی کو چاہئے کہ دارالقضاء میں فسخ نکاح کا دعوی دائر کرے اور بذریعہ شہادت شرعیہ ثابت کرے کہ میرا نکاح فلاں شخص سے ہوا تھا اس کے بعد گواہوں سے اس کا لاپتہ ہونا ثابت کرے، اس کے بعد قاضی کی ذمہ داری ہوگی کہ خود بھی لاپتہ شخص کی تفتیش وتلاش کرے اور جب پتہ ملنے سے مایوسی ہوجائے تو عورت کو چار سال تک مزید انتظار کا حکم کرے، پھر اگر ان چار سال کے اندر بھی لاپتہ شخص کا پتہ نہ چلے تو لاپتہ شخص کو اس کی مدت کے ختم ہونے پر مردہ تصور کیا جائے گا اور ان چار سال کے ختم ہونے کے بعد چار ماہ دس دن عدت وفات گذار کر عورت کو دوسری جگہ نکاح کرنے کا اختیار ہوگا، لاپتہ شخص کی بیوی کے لیے یہ چار سال کے مزید انتظار کا حکم اس صورت میں ہے جبکہ عورت اتنی مدت صبر وتحمل اور عفت کے ساتھ گذار سکے، لیکن یہ صورت ممکن نہ ہو یعنی عورت کے گناہ میں ملوث ہونے کا امکان ہو اور اس نے ایک عرصہ دراز تک لاپتہ شخص کا انتظار کرنے کے بعد مجبور ہوکر اس حالت میں درخواست دی ہو تو اس صورت میں اس کی بھی گنجائش ہے کہ چار سال

کی میعاد میں تخفیف کردی جائے، کیونکہ جب عورت کے ابتلاء کا شدید اندیشہ ہو تو فقہاء کے نزدیک کم از کم ایک سال صبر کرنے کے بعد تفریق جائز ہے، یہ تفریق طلاق رجعی ہوگی اس صورت میں لاپتہ شخص کی بیوی کو بجائے عدتِ وفات کے عدتِ طلاق گذارنی ہوگی، چار سال تک انتظار کا حکم اس وقت ہے جب لاپتہ شخص ایسا مال چھوڑ کر غائب ہوگیا ہو، جس سے بیوی کا نفقہ ادا کیا جاسکے اور عورت اس کے حاصل کرنے پر قادر بھی ہو اور اگر لاپتہ شخص کوئی ایسی جائیداد چھوڑ کر نہ جائے جس سے عورت کے نفقہ کی تکمیل ہوسکے تو اب معاملہ کی نوعیت ہی بدل جائے گی اور معاملہ کی اساس شوہر کی مفقود الخبری ہی نہیں رہے گی، بلکہ اس کا نفقہ ادا نہ کرنا اصل بنیاد قرار پائے گا، اور عدم ادائے نفقہ کی وجہ سے جن شرطوں کے ساتھ نکاح فسخ کیا جاتا ہے انہیں کے مطابق یہاں بھی نکاح فوراً فسخ کردیا جائے گا، اگر دارالقضاء نے چار سال انتظار کے بعد مفقود شخص کی موت کا فیصلہ کردیا تھا، پھر عدت کے دوران یا عدت کے بعد اس عورت نے دوسرے شخص سے نکاح کرلیا، مگر خلوت صحیحہ ویکجائی نہیں ہوئی اور اس سے پہلے مفقود شوہر لوٹ آئے تو بالاتفاق اس کی موت کا حکم اور نکاح ثانی باطل ہوجائے گا اور وہ عورت شوہر اول ہی کے نکاح میں بدستور باقی رہے گی۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر دارالقضاء کے فیصلہ کے بعد مفقود شخص کی بیوی نے دوسرا نکاح کرلیا تھا اور خلوت صحیحہ ویکجائی بھی ہوچکی تھی تو اس صورت میں امام مالک کے نزدیک دوسرے شوہر کی بیوی ہوگی پہلے شوہر کا کوئی حق اس پر نہیں ہوگا۔

غائب غیر مفقود شخص کا حکم

ایسا شوہر جو بالکل لاپتہ نہ ہو لیکن اس کا کوئی متعین پتہ بھی نہیں ہے، کبھی سنا جاتا ہے کہ وہاں ہے کبھی یہاں ہے، لیکن اپنی بیوی کے پاس نہ آتا ہے اور نہ اپنے پاس بلاتا ہے، نہ اس کے خرچ وغیرہ کا خیال رکھتا ہے، نہ بیوی کو طلاق دے کر آزاد کرتا ہے بلکہ معلقہ بنا کر ایسی تنگی اور پریشانی میں مبتلا کردیا ہے کہ اندیشہ ہے کہ وہ گناہ میں مبتلا ہوجائے تو ایسے سنگ

دل وظالم شوہروں کو اصطلاح میں غائب غیر مفقود کہا جاتا ہے، ایسے غائب شخص کی بیوی کو حق ہے کہ اپنے شوہر سے رہائی حاصل کرنے کے لیے دارالقضاء میں درخواست دے، درخواست دیتے وقت ان امور کو پیش نظر رکھنا ہوگا:

۱۔ بیوی گواہوں کے ذریعہ غائب غیر مفقود شوہر کے ساتھ اپنا نکاح ثابت کرے۔

۲۔ یہ بھی ثابت کرے کہ وہ نفقہ دے کر نہیں گیا ہے۔

۳۔ اور یہ بھی کہ اس نے نفقہ معاف نہیں کیا ہے۔

نکاح اور وجوب نفقہ کے ثابت ہونے کے بعد قاضی اس غائب غیر مفقود شخص کے پاس حکم بھیجے گا کہ یا تو خود حاضر ہو کر اپنی بیوی کے حقوق ادا کرو یا اس کو بلا لو یا وہیں سے نفقہ کا انتظام کرو ورنہ اس کو طلاق دے کر نکاح سے آزاد کردو، اگر تم نے ان باتوں میں سے کسی بات کا خیال نہ رکھا تو ہم خود تم دونوں میں تفریق کردیں گے، اگر شوہر نے قاضی کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بیوی کو نفقہ کی ادائیگی شروع کردی تو ٹھیک ورنہ قاضی عورت کے مطالبہ تفریق پر نکاح فسخ کردے گا۔

غائب شوہر عدت کے اندر واپس آجائے:

اگر غائب غیر مفقود کی بیوی پر طلاق کا فیصلہ کردیا گیا، پھر شوہر عدت کے اندر واپس آجائے اور سب شکایات دور کرے، اور حقوق بجالانے پر آمادہ ہوجائے تو اس صورت میں اس کو دوران عدت رجعت کا حق ہوگا، اگر رجعت کرلیا تو وہ بدستور اس کی بیوی رہے گی۔

غائب شوہر عدت کے بعد واپس آیا

لیکن اگر غائب شوہر غیر مفقود عدت کے بعد واپس آیا تو اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ اول یہ کہ اس نے واپس آکر عورت کے دعویٰ کو غلط ثابت کردیا تو ایسی صورت میں عورت کا دعویٰ اور دارالقضاء کی کارروائی باطل قرار پائے گی، عورت بدستور شوہر اول کے نکاح میں سمجھی جائے گی۔

۲۔ دوسری صورت یہ کہ غائب شوہر عورت کے دعوی کے خلاف کوئی بات ثابت نہ کرسکا تو اب عدت ختم ہونے کے بعد رجعت کا حق باقی نہ رہے گا۔

نفقہ

رشتہ ازدواج سے منسلک ہونے کے بعد مرد وعورت دونوں کی کچھ ذمہ داریاں ہیں اور ایک دوسرے پر کچھ حقوق ہیں، ان میں اہم ترین حق بیوی کا نفقہ ہے، جو تین چیزوں کو شامل ہے: خوراک، پوشاک، اور مکان، قرآن مجید نے مختلف مواقع پر اس کی صراحت کی ہے ﴿وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ [سورۃ البقرۃ:۲۳۳] (شوہر کے ذمہ بیویوں کا کھانا، کپڑا معروف طریقہ سے ہے)، ﴿لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ﴾ [سورۃ الطلاق:۷] (اہل وسعت کو چاہئے کہ اپنی وسعت کے مطابق خرچ کریں اور جن پر روزی تنگ ہو ان کو بھی چاہئے کہ اللہ کی عطا کے مطابق نفقہ دیں) ﴿أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم﴾ [سورۃ الطلاق:۶] (جہاں تم خود رہو وہیں ان کو بھی رکھو)، حدیث سے بھی ثابت ہے کہ بیوی کا نفقہ شوہر کے ذمہ واجب ہے، آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: ''ولهن عليكم رزقهن و كسوتهن بالمعروف'' (ابوداؤد، کتاب الحج، باب صفۃ حجۃ النبی، ص:۱۹۰۵) [تمہارے ذمہ بھلے طریقہ پر بیویوں کا کھانا اور کپڑا ہے]

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو اخراجات ومصارف کا ذمہ دار بنایا ہے بلکہ اس کی پوری ذمہ داری مردوں پر ڈالی ہے، شادی سے پہلے باپ اس کا کفیل ہے شادی کے بعد شوہر، اس کے لئے کہ عورت اپنی خلقت وفطرت کے اعتبار سے اس کی متحمل نہیں ہے کہ وہ اپنے اخراجات خود انتظام کرے اور حالات بھی اس کے لیے سازگار نہیں۔

نفقہ میں شامل چیزیں

بیوی کے نفقہ میں صرف خوراک، پوشاک، اور رہائش کا انتظام نہیں بلکہ اس کی تمام

بنیادی ضروریات شامل ہیں، اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اچھی طرح رکھنے کا حکم دیا ہے:

﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْف﴾ [سورۃ نساء، آیت:۱۹]

[تم ان عورتوں کے ساتھ معروف طریقے سے زندگی گزارو]

معاشرت بالمعروف کا تقاضا یہ ہے کہ مرد اپنی بیوی کی تمام بنیادی ضروریات کا کفیل ہو، جو ہر زمانہ کے عرف اور حالات کے اعتبار سے مختلف ہوسکتی ہیں اور اس سلسلہ میں کوئی قطعی تحدید وتعیین نہیں کی جاسکتی، اس لئے قرآن وحدیث میں نفقہ کو کسی تحدید وتعیین کے بغیر مطلق ذکر کیا گیا ہے، لہذا اس میں عرف کا اعتبار ضروری ہے۔

پوشاک

نفقہ میں شامل چیزوں میں سے دوسری چیز بیوی کے کپڑے کا انتظام ہے، کھانے کی طرح کپڑے کی بھی کوئی مقدار متعین نہیں ہے بلکہ اس کا مدار بھی عرف پر ہے، فقہاء کرام اس بات پر متفق ہیں کہ علاقہ ومقام کا لحاظ کرتے ہوئے عرف وعادت کے موافق ایسا لباس فراہم کرنا واجب ہے جو عورت کے لیے کافی ہوجائے، یعنی اس کے ستر کے تقاضہ کو پورا کرسکے۔

فقہ حنفی کی مستند ومعتبر کتاب فتاوی عالمگیری کے الفاظ ہیں:

" والكسوة واجبة عليه بالمعروف بقدر ما يصلح لها عادةً" [فتاوىٰ هنديه، ج ۱، ص:۵۵۵، الفصل الاول فی نفقة الزوجة]

[شوہر پر کپڑا واجب ہے بھلے طریقہ پر اتنی مقدار میں جو عادۃ اس کے موافق ہو]

اس بات پر ائمہ بھی متفق ہیں کہ جاڑے وگرمی کے موسم کے لحاظ سے کپڑا فراہم کرنا ضروری ہے یہ شوہر کی مالی حیثیت کے اعتبار سے مختلف ہوسکتا ہے۔

رہائش

بیوی کی رہائش کا انتظام بھی شوہر پر واجب ہے، اس لئے قرآن نے مطلقہ کے ''سکنیٰ'' کو واجب قرار دیا ہے، ﴿اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُم مِنْ

وُجْدِكُمْ﴾ [سورۃ الطلاق:۶] [تم ان عورتوں کو اپنی وسعت کے موافق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو] جب مطلقہ کے ''سکنیٰ'' کو واجب قرار دیا گیا تو جو نکاح میں ہو، اس کا ''سکنیٰ'' بدرجہ اولیٰ واجب ہوگا، نیز عورتوں کے ساتھ معروف طریقہ سے زندگی بسر کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور معروف میں سے یہ بھی ہے کہ بیوی کی رہائش کے لئے مناسب مکان فراہم کرے، کھانے اور کپڑے کی طرح رہائش میں بھی عرف وعادت کی رعایت ہونی چاہئے، اور ایسا مکان دیا جائے جو عادتاً عورت کے لئے مناسب ہو کہ جس میں اس کی خواہش کے بغیر دوسروں کے ساتھ رہنے پر اس کو مجبور نہ ہونا پڑے، چنانچہ معتبر ومستند کتاب فتاوی عالمگیری میں ہے:

''تجب السكنىٰ لها عليه في بيت خال عن أهله و أهلها إلّا أن تختار ذلك'' (جلد ا، ص ۶۵۵، الفصل الثانی فی السکنی)

[شوہر کے ذمہ عورت کے لئے ایسے گھر میں رہنے کا انتظام واجب ہے، جو دونوں کے افراد خاندان سے خالی ہو، الا یہ کہ عورت اس کو پسند کرے]

الغرض رہائش میں عورت کی رعایت ضروری ہے، البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ خود اس کا ذاتی مکان ہو بلکہ کرایہ یا عاریت کے مکان میں رکھنا بھی جائز ہے۔

سامان زینت

بیوی کی زینت وآرائش کا سامان بھی نفقہ میں شامل ہے، اس میں بھی عرف وعادت کی رعایت ضروری ہے۔

علاج ومعالجہ

نفقہ میں بیوی کے علاج ومعالجہ کی ذمہ داری بھی شوہر پر لازم ہے، لہذا اگر بیوی بیمار ہو تو شوہر اپنی استطاعت کے مطابق ضروری علاج ومعالجہ کرائے، پس جیسے نفقہ کی دوسری مدات میں شوہر کی استطاعت اور اوسط معیار کی رعایت کی جاتی ہے، اسی طرح علاج

ومعالجہ بھی شوہر اپنی مالی صلاحیت کے مطابق اوسط معیار پر کرانے کا پابند ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر شوہر بالغ ہو اور بیوی ناشزہ اور نافرمان نہ ہو تو تمام اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بیوی کا نفقہ شوہر کے ذمہ واجب ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر نفقہ ادا نہ کرے تو کیا حکم ہوگا؟ آیا بیوی کو طلاق طلب کرنے اور فسخ نکاح کرانے کا حق ہوگا یا اس کو اس پریشانی سے بچانے کے لئے کوئی اور تدبیر کی جائے گی؟ نفقہ نہ ادا کرنے کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱۔شوہر نفقہ ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہو مگر پھر بھی نفقہ نہ ادا کرے، فقہ کی اصطلاح میں اس عمل کو تعنت اور ایسے فرد کو متعنت کہا جاتا ہے۔

۲۔شوہر نفقہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو۔

۳۔شوہر موجود ہی نہ ہو بلکہ غائب ہوگیا ہو۔

شوہر کا استطاعت کے باوجود نفقہ نہ دینا:

اگر شوہر نفقہ پر قدرت کے باوجود بیوی کا نفقہ ادا نہ کرتا ہو اور نہ عورت عزت وآبرو کی حفاظت کے ساتھ خود نفقہ کا انتظام کرسکتی ہو اور نہ دوسرا شخص اس کے نفقہ کا کفیل ہو یا دقت وپریشانی سے نفقہ کا انتظام تو ہوسکتا ہو، لیکن شوہر سے علحدہ رہنے میں ابتلاء ومعصیت کا قوی اندیشہ ہو اور شوہر خلع یا طلاق پر بھی راضی نہ ہو تو ایسی سخت مجبوری کی حالت میں بیوی دارالقضاء میں درخواست دے کر فسخ نکاح کرا سکتی ہے، دارالقضاء کے قاضی کی ذمہ داری ہوگی کہ معاملہ کی پوری تحقیق کرے، اگر عورت کا دعوی صحیح ثابت ہو تو قاضی شوہر کو حکم کرے کہ بیوی کے حقوق کو ادا کرو یا طلاق دیدو ورنہ دونوں کے درمیان تفریق کردی جائے گی، اگر شوہر کسی صورت پر عمل نہ کرے تو ان دونوں کے درمیان تفریق کردی جائے گی، اس لئے کہ مقصود رفع ضرر اور ظلم کو ختم کرنا ہے اور ضرر جس طرح تنگ دستی میں ہے اسی طرح قدرت کے باوجود نفقہ نہ دینے میں زیادہ ضرر ہے، معذوری کی وجہ سے نفقہ نہ ملنے کے مقابلہ میں قدرت کے باوجود نفقہ نہ ملنا زیادہ تکلیف کا باعث ہے۔

شرائط تفریق

استطاعت کے بعد نفقہ نہ ادا ادا کرنے کو تعنت کہا جاتا ہے

۱۔تعنت کی وجہ سے تفریق کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ عورت خود تفریق کا مطالبہ کرے اس لئے کہ تفریق خود عورت کے لئے اپنے ذاتی حق کی وجہ سے ہے، لہٰذا اس کو تفریق کے مطالبہ کا حق ہوگا، اگر عورت خود مطالبہ نہ کرے تو ولی کو فسخ نکاح کے مطالبہ کے اختیار نہ ہوگا۔

۲۔تعنت کی وجہ سے تفریق کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ حاکم کے حکم سے ہو۔

۳۔شوہر کا تعنت ثابت ہونے کی مختلف صورتیں ہیں۔

(۱) مرد خود اپنے مالدار ہونے کا دعویٰ کرے اور نفقہ نہ دے۔

(۲) شوہر نفقہ نہ دے اور مطالبہ کرنے پر کوئی جواب بھی نہ دے کہ تنگدستی کی وجہ سے نفقہ نہیں دے رہا ہے، یا قدرت کے باوجود دینا نہیں چاہتا ہے۔

(۳) نفقہ نہ دے اور مطالبہ کرنے پر نفقہ سے عجز کا دعویٰ کرے، اب اگر عجز کا دعویٰ کرے تو اس سے کہا جائے گا کہ وہ اپنے عجز کو ثابت کرے، اگر عجز وتنگدستی ثابت نہ کرسکے تو اس کو نفقہ دینے یا طلاق دینے کا حکم دیا جائے گا۔

۴۔شرعی شہادت کے ذریعہ شوہر کا تعنت ثابت ہوجائے۔

طلاق کے فیصلہ کے بعد عدت کے اندر متعنت شوہر اپنی حرکت سے باز آجائے تو کیا ہوگا؟ اگر تعنت کی بنیاد پر دارالقضاء نے طلاق کا فیصلہ کردیا، پھر عدت کے اندر ہی وہ شوہر اپنی حرکت پر نادم ہوکر سرکشی سے باز آگیا اور حقوق ادا کرنے پر آمادہ ہوگیا تو راجح قول کے مطابق اُسے رجعت کا اختیار ہوگا، وہ تجدید نکاح کے بغیر اس بیوی کو اپنے ساتھ رکھنے کا مجاز ہوگا تاہم تجدید نکاح کرلے تو بہتر ہے تاکہ دوسرے قول طلاق بائن واقع ہونے کی بھی رعایت ہوجائے۔

متعنت شوہر عدت کے بعد باز آیا

اگر تعنت کی بنا پر دارالقضاء نے طلاق واقع کی پھر عدت گذرنے کے بعد متعنت شخص نے اپنی حرکت سے باز آنے کا عندیہ ظاہر کیا تو اب اس کا بیوی پر کوئی اختیار نہیں رہا، کیونکہ عدت گذرنے کے بعد بیوی بائنہ ہوگئی۔

شوہر کا ادائیگی نفقہ سے عاجز ہونا

اگر شوہر تنگدستی کی وجہ سے بیوی کے نفقہ کا انتظام کرنے سے عاجز ہو تو بیوی کو تفریق کا حق حاصل ہوگا یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے بنیادی طور پر دو نقطۂ نظر ہیں:

پہلا نقطۂ نظر احناف کا ہے کہ عورت کو تفریق کا حق حاصل نہ ہوگا بلکہ عورت شوہر کے نام پر قرض لے کر اپنی ضروریات پوری کرے گی، علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

"ولا یفرق بینهما بعجزه عنها بانواعها الثلاثة"۔ (درمختار، جلد۵/۳۰)

ترجمہ شوہر کے نفقہ کی تینوں قسم، یعنی، کھانا، سکنیٰ اور لباس سے عاجز آجانے کی وجہ سے دونوں کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی، ان کی دلیل یہ ہے، ﴿وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ﴾ (سورہ بقرہ:۳)

ترجمہ: اگر تنگ دست ہو تو کشائش ہونے تک مہلت دینی چاہئے۔

علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں: کہ نفقہ دینے کی آخری انتہائی صورت یہ ہے کہ وہ شوہر کے ذمہ دین ہو، لہٰذا اگر مفلس ہوجائے تو نفقہ اس کے ذمہ دَین ہوگا اور نص قرآن کی روشنی میں عورت کو حکم دیا جائے گا کہ وہ خوشحالی تک مرد کو مہلت دے اور انتظار کرے۔ (فتح القدیر، جلد۴/۳۵۱، کتاب الطلاق)

جمہور کا نقطۂ نظر

دوسرا نقطہ نظر جمہور ائمہ کا ہے کہ جب شوہر نفقہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو عورت کو

تفریق کا اختیار حاصل ہوگا۔ جمہور کے دلائل یہ ہیں:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ [سورۃ النساء:۱۹]

معاشرت بالمعروف کا کم تر اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ شوہر اپنے ذمہ واجبی نفقہ ادا کرے اگر واجبی نفقہ سے عاجز ہوجائے اور اس کی ادائیگی پر قادر نہ ہو تو تفریق متعین ہوجائے گی تاکہ عورت کسی ایسے شخص سے نکاح کرلے جو اس کے نفقہ کا انتظام کرسکے، اور اس کے ساتھ بھلے طریقہ سے پیش آئے، دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ﴾ [سورۃ البقرۃ:۲۲۹] کا حکم دیا ہے اور ادائیگی نفقہ کی استطاعت نہ ہونے کی صورت میں امساک بالمعروف باقی نہیں رہا، لہٰذا تسریح بالاحسان یعنی بھلے طریقہ سے جدائیگی متعین ہوگئی، ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ﴾ [الاحزاب:۵۰] [ہمیں معلوم ہے ہم نے ان پر ان کی عورتوں کے حق میں مقرر کیا ہے اور شوہروں پر ان کی بیویوں کے حق میں] منجانب اللہ مقرر کردہ چیزوں میں کھانا، لباس اور رہائش بھی ہے، اگر وہ اپنے اوپر مقرر کردہ ذمہ داری سے عاجز آجائے تو ان چیزوں سے عاجز آنے کے باوجود جو عورتوں کی بنیادی ضروریات میں داخل ہیں اور جن سے کبھی وہ مستغنی نہیں ہوسکتیں، ان کو مردوں کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

حدیث ہے: "عن ابن عباس قال، قال: رسول الله ﷺ لاضرر ولا ضرار فی الاسلام" [ابن ماجہ، حدیث:۲۳۴۱] [حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہ نقصان پہنچاؤ اور نہ نقصان اٹھاؤ] اگر شوہر بیوی کو نفقہ ہی نہ دے تو اس کے حق میں اس سے بڑھ کر اور کیا ضرر ہوسکتا ہے؟ لہٰذا اس ضرر کو ختم کرنے کے لئے میاں بیوی کے درمیان تفریق کردی جائے گی۔

لہٰذا موجودہ حالات میں احناف کے نقطۂ نظر پر عمل کرنا دشوار ہے، کیونکہ نہ یہاں اسلامی حکومت ہے اور نہ اسلامی بیت المال ہے، ہندوستان جیسے ملک میں اس مسئلہ میں فقہ حنفی کے بجائے جمہور فقہاء کے مسلک پر عمل کرنا آسان اور قابل عمل ہے، اسی پر دارالقضاء کا عمل جاری وساری ہے۔

فسخ نکاح

(بسبب ظلم وزیادتی وشقاق بین الزوجین)

مولانا مفتی راشد حسین ندوی
(مہتمم مدرسہ ضیاء العلوم-رائے بریلی)

طلاق ایک فطری ضرورت ہے:

اسلام دین فطرت ہے، اس کے احکام میں انسانی نفسیات (Human Psychology) کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے، انسانی فطرت سے واقف کوئی بھی شخص نکاح ہی کی طرح طلاق کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کرسکتا، اسی لیے اسلام میں اگرچہ طلاق کو نہایت ناپسندیدہ اور مبغوض ترین عمل قرار دیا گیا، لیکن اس پر پابندی نہیں لگائی گئی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"أبغض الحلال إلى الله الطلاق"(أبو داؤد: ۲۱۷۸،ابن ماجة: ۲۰۱۸)

یعنی اللہ تعالیٰ کو حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ طلاق ہے اور طلاق پر پابندی نہ لگانے کی وجہ یہ ہے کہ کبھی طلاق ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے اور اس سے کوئی چارہ کار نہیں رہتا، یہی وجہ ہے کہ جن مذاہب میں طلاق ممنوع تھی، اس کے ماننے والے اس کی حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے اور انہیں اس کی اجازت دینی پڑی۔

طلاق وتفریق

پھر اسلام میں نکاح کو ختم کرنے کی بنیادی طور پر چار صورتیں ہیں:

(۱) طلاق؛ جس کا حق مرد کو دیا گیا ہے۔

(۲) خلع؛ اس کا مطالبہ عورت کی طرف سے ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ بھی طلاق کی ایک شکل ہے۔

(۳) فسخ وتفریق؛ یہ عورت کے مطالبہ پر عدالت اور دار القضاء کی طرف سے عمل میں آتا ہے۔

(۴) متارکہ؛ جو مرد وعورت کے درمیان کسی وجہ سے حرمت قائم ہوجانے کی صورت میں زوجین پر لازم ہوجاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے علاحدگی اختیار کریں۔

فسخ وتفریق

جیسا کہ عرض کیا گیا، فسخ وتفریق کا اختیار صرف قاضی کو ہوتا ہے، اس کے کچھ اسباب ہیں جن کے پائے جانے پر قاضی فسخ نکاح (Divorcement) کا فیصلہ کرسکتا ہے، پھر ان میں سے کچھ اسباب ایسے ہیں، جو دوسرے ائمہ کے ساتھ احناف کے نزدیک بھی قاضی کو فسخ نکاح کا اختیار دیتے ہیں، جیسے شوہر کا پاگل یا نامرد ہونا اور کچھ اسباب ایسے ہیں جو احناف کے اصل مسلک میں اگرچہ فسخ نکاح کا سبب نہیں بن سکتے، لیکن دوسرے ائمہ کے نزدیک بن سکتے ہیں اور ضرورت وحاجت کے پیش نظر احناف نے بھی دوسرے ائمہ کی رائے اختیار کرلی ہے اور ہندوستان کے دار القضاؤں میں اسی پر عمل ہے، انہی اسباب میں سے شوہر کی طرف سے بیوی پر ظلم وزیادتی نیز شقاق یعنی ایک دوسرے سے نفرت، عداوت اور دشمنی ہوجانے کی بنیاد پر فسخ نکاح کا مسئلہ بھی ہے، چونکہ راقم کو اسی سبب پر مقالہ لکھنے کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا ہم اس کی وضاحت قدرے تفصیل سے کرتے ہیں۔

شقاق کا مفہوم

جب میاں بیوی کے درمیان تعلقات آخری درجہ میں خراب ہوجائیں، ان کے

درمیان نفرت پیدا ہوجائے اور وہ سمجھیں کہ اب ان کا ایک ساتھ رہنا اور ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھتے ہوئے زندگی گزار پانا مشکل ہے، خواہ یہ نفرت بیوی کو تکلیف دہ مار پیٹ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو یا بیوی کے نشوز کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو، یا دونوں خاندانوں کے درمیان دشمنی اور مقدمہ بازی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو، یا اسی طرح کی دوسری وجوہات سے پیدا ہوئی ہو، اس طرح کی صورت حال میں قرآن مجید میں یہ حکم دیا گیا ہے:

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَماً مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَماً مِّنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيْدَا إِصْلَاحاً يُوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا﴾(النساء: ۳۵)

اور اگر تمہیں ان دونوں کے آپس کے توڑ کا ڈر ہو تو ایک فیصلہ کرنے والا مرد کے خاندان سے اور ایک فیصلہ کرنے والا عورت کے خاندان سے کھڑا کرو، اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ دونوں میں جوڑ پیدا فرمادے گا۔

شقاق کا مطلب

اس آیت کریمہ میں لفظ شقاق یعنی توڑ آیا ہے، لغت میں شقاق کا لفظ ''شق'' سے باب مفاعلت کا صیغہ ہے، جس کے معنی جانب کے ہوتے ہیں، جب دو فریقوں کے درمیان عداوت اور دشمنی نیز ایک دوسرے سے نفرت آخری درجہ کو پہنچ جائے تو اس کو شقاق کہتے ہیں، یعنی دونوں کے درمیان عداوت اتنی بڑھ گئی کہ دونوں الگ الگ رخ کیے ہوئے ہیں اور الگ الگ گوشہ اختیار کیے ہوئے ہیں، علامہ ابن منظور فرماتے ہیں:

"المشاقة والشقاق غلبة العداوة والخلاف، شاقه مشاقه: خالفه (إلى) لأن كل فريق من فرقي العداوة قصد شقا أي ناحية غير ناحية صاحبه"(لسان العرب مادة شقق)

فقہاء نے شقاق کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اسی لغوی معنی کو ملحوظ رکھا ہے، چنانچہ علامہ نوویؒ نے فرمایا: شقاق یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے مخالف گوشہ

اختیار کرے:

"إن أصل الشقاق أن كل واحد منهما يأخذ غير شق صاحبه"(المجموع شرح المهذب: ۹۹/۱۸، كتاب النكاح، باب النشوز، نيز ديكهئے: أحكام القرآن للجصاص: ۱۹۰/۲)

کیا زوجین کا تنافر شرط ہے؟

لفظ شقاق باب مفاعلت کا صیغہ ہے، جس کی خاصیت مشارکت کا تقاضا بہ ظاہر یہ ہونا چاہیے کہ جب میاں بیوی دونوں ایک دوسرے سے متنفر ہوجائیں تبھی شقاق مانا جائے، لیکن علماء نے صراحت کی ہے کہ ایک فریق کی طرف سے بھی تنفر ہو تو شقاق متحقق ہوجائے گا، اس لیے کہ ایک فریق نفرت کرے، دوسرا نہ کرے تب بھی وہ الگ گوشہ اختیار کرنے والا قرار دیا جائے گا اور مشارکت متحقق ہوجائے گی، علامہ فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

"فذاك الشقاق إما أن يكون منهما أو منه أو منها أو يشكل"(التفسير الكبير، تفسير مفاتيح الغيب: ۹۲/۱۰)

(یہ شقاق یا دونوں کی طرف سے ہوگا یا مرد کی طرف سے یا عورت کی طرف سے یا معاملہ مبہم ہوگا)

حکمین کب مقرر کیے جائیں گے؟

زوجین کے درمیان شقاق اور مخالفت پیدا ہونے کے اسباب مختلف ہوتے ہیں، کبھی اس کا سبب بیوی کا نشوز (نافرمانی) ہوتا ہے، کبھی شوہر کا ظلم وزیادتی، کبھی دونوں میں سے کسی کی بدصورتی، اسی لیے شریعت نے اس کے حل کے لیے بھی مختلف مراحل رکھے ہیں، چنانچہ آیت شقاق میں آخری مرحلہ کا ذکر ہے، اس سے پہلے کی آیت میں ابتدائی مراحل کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاللَّاتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ

وَاضۡرِبُوهُنَّ فَإِنۡ أَطَعۡنَكُمۡ فَلَا تَبۡغُوا۟ عَلَيۡهِنَّ سَبِيلًا﴾(النساء: ٣٤)

اور جن عورتوں کی بدخوئی کا تمہیں ڈر ہو، تو ان کو سمجھاؤ اور ان کے بستر الگ کر دو اور ان کو تنبیہ کرو، پھر اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو ان کے خلاف کسی راستہ کی تلاش میں مت پڑو۔

یہ آیت اور اس کے بعد والی آیت شقاق سے مندرجہ ذیل ترتیب واضح ہوتی ہے:

(ترتیب احکام القرآن للجصاص: ۲/۱۹۰ سے ماخوذ ہے۔)

۱- اگر مرد عورت کی طرف سے نافرمانی محسوس کرے تو مرد کو حکم دیا گیا کہ اسے سمجھائے، میاں بیوی کے حقوق و فرائض یاد دلائے اور اللہ کا خوف اس کے دل میں پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

۲- اگر اس سے بات نہ بنے تو خواب گاہ الگ کر دے اور اس کے ذریعہ اصلاح کی کوشش کرے۔

۳- اس سے بھی بات نہ بنے تو ہلکی سی ضرب لگانے کی اجازت دی گئی، اگرچہ اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا، لیکن اجازت صرف ضرب غیر مبرح کی دی گئی، یعنی جس سے نہ جلد پر نشان پیدا ہو، نہ ہڈی متاثر ہو، نہ کھال پھٹے:

"وهو الذی يكسر العظم أو يخرق الجلد أو يسوده"(رد المحتار: ٣/٢٠٨، باب التعزير)

ساتھ ہی چہرے پر مارنے کی ممانعت کی گئی۔ (ملاحظہ ہو: مسلم، كتاب الحج، باب حجة النبي صلى الله عليه وسلم: ١٢١٨، أبو داؤد: ٩٠٥، ابن ماجة: ٣٠٧٤، نیز دیکھئے: مسلم، كتاب اللباس، باب النهي عن ضرب الحيوان في وجهه: ٢١١٦)

۴- اس سے بھی بات نہ بنے تو واضح ہو گیا کہ یہ اب ان کا نجی معاملہ نہیں رہا ہے، پورے معاشرہ کا معاملہ بن چکا ہے، لہٰذا اب معاملہ قاضی کے پاس ہی حل ہو سکتا ہے۔

۵- پھر جب قاضی کے پاس معاملہ آئے گا تو قاضی پوری کوشش کرے گا کہ فریقین

کی شکایات کا ازالہ کر کے ان کے درمیان صلح کرا دے۔

۶- اگر اس میں کامیابی نہ ملے تو قاضی معاملہ کی تحقیق کرے گا، اگر شقاق کی وجہ قاضی کے نزدیک واضح طور پر ثابت ہو جائے تو وہ اس کے مطابق معاملہ حل کرے گا، مثلاً: اگر شوہر کا ظلم واضح ہو جائے تو امام مالک کے نزدیک قاضی بلا توقف تفریق کر دے گا، احناف نے بھی حالات کے پیش نظر اسی قول کو اختیار کر لیا ہے اور ہندوستان کے دار القضاؤں میں اسی پر عمل ہے، جب کہ احناف کا اصل مسلک یہ تھا کہ قاضی تفریق نہیں کرے گا، بلکہ شوہر کو سزا دے گا:

'ادعت على زوجها ضربا فاحشا وثبت ذلك عليه عزر"(شامی: ٣/٢٠٨، باب التعزير،(تفصیل کے لیے دیکھئے: کتاب الفسخ والتفریق: ١٤٥ وما بعد)

۷- اور اگر شقاق کا سبب واضح نہ ہو اور قاضی کی نصیحت نیز تعزیر وغیرہ سے مسئلہ حل نہ ہو سکے تو اس صورت میں قاضی حکمین مقرر کرے گا، علامہ قرطبی مالکی فرماتے ہیں:

"وذلك إذا أشكل أمرهما ولم يدر ممن الاساءة منهما، فأما إن عرف الظالم فانه يؤخذ له الحق من صاحبه، ويجبر على ازالة الضرر"(الجامع لأحكام القرآن: ١٧٥٥)

حکمین کو قاضی مقرر کرے گا

جمہور کے نزدیک آیت کریمہ "فابعثوا" کے مخاطب حکام ہیں اور اس موقع پر حکم بنانے کا اختیار ان کو دیا جا رہا ہے، (اگرچہ زوجین اگر کسی کو حکم مقرر کر کے اس کو وکیل بنا دیں تو جتنا اختیار وہ حکم کو دیں وکیل ہونے کی حیثیت سے وہ اس اختیار کو استعمال کر سکتا ہے) جب کہ بعض حضرات کے نزدیک اس کے مخاطب زوجین ہیں:

"والجمهور من العلماء على أن المخاطب بقوله: "وإن خفتم" الحكام

والأمراء.....وقيل المراد الزوجان.....وقيل الخطاب للأولياء"(تفسير قرطبی: ۱۷۵/۵، أحكام القرآن للجصاص: ۱۹۰/۲)

حکمین کے اختیارات

اس پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ حکمین کی اصل ذمہ داری اور فریضہ یہ ہے کہ وہ میاں بیوی کے درمیان اصلاح کی کوشش کریں اور اتفاق پیدا کرنے میں دریغ نہ کریں اور ان کے درمیان جو خلیج اور دوری پیدا ہوگئی ہے اس کو مٹانے کی سعی کریں، اس لیے کہ ان کے تقرر کا مقصد ہی قرآن نے اسی کو بتایا ہے:

﴿إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحاً يُوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا﴾ (وہ دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ دونوں میں جوڑ پیدا فرمادے گا)

چنانچہ امام جصاص رازی حنفی، ابن عرفہ دسوقی مالکی، خطیب شربینی شافعی وغیرہ نے اسی طرح کی صراحتیں کی ہیں:

"يجب عليهما في مبدأ الأمر أن يصلحا بين الزوجين بكل أوجه أمكنهما لأجل الألفة وحسن العشرة" (حاشية الدسوقي: ۲۱۳/۳، باب في النكاح، فصل إنما يجب القسم للزوجات، أحكام القرآن للجصاص، مغني المحتاج: ۲۶۱/۳، كتاب القسم والنشوز)

لیکن ان کے درمیان اختلاف ہے کہ وہ زوجین کے درمیان تفریق کا اختیار رکھتے ہیں یا نہیں؟ اس کے بارے میں دو آراء ہیں:

پہلی رائے یہ ہے کہ حکمین کی حیثیت میاں بیوی کے وکیل کی ہے، اگر شوہر نے حکم کو خلع وطلاق کا وکیل بنایا ہے تو وہ تفریق کرا سکتا ہے ورنہ نہیں، یہ قول احناف، حضرت عطاء بن زید، حسن بصری اور ابوثور کا ہے، امام شافعی کا بھی ایک قول یہی ہے، امام جصاص رازی فرماتے ہیں:

"فقال أصحابنا: ليس للحكمين أن يفرقا إلا برضا الزوجين..الخ"(أحكام القرآن: ۱۹۲/۲)

حکمین کو زوجین کی رضامندی کے بغیر تفریق کرانے کا حق نہیں ہے، اس لیے کہ یہ حق حاکم کو حاصل نہیں ہے، تو حکمین کو کیسے حاصل ہوسکتا ہے، حکمین صرف زوجین کے وکیل ہیں، ایک بیوی کا وکیل ہے، دوسرا خلع یا بغیر معاوضہ کے تفریق کرانے میں شوہر کا وکیل ہے، بشرطیکہ شوہر نے اس کو اس کا اختیار دیا ہو) (نیز دیکھئے: الجامع لأحكام القرآن للقرطبي المالكي: ۱۷۶/۵، البيان: ۵۳۲/۹، كتاب الصداق، باب النشوز، بداية المجتهد: ۹۹/۲، باب في بعث الحكمين)

دوسری رائے یہ ہے کہ حکمین کو محسوس ہو کہ اصلاح مشکل ہے، تو وہ زوجین کے درمیان تفریق کرا سکتے ہیں، خواہ شوہر نے انہیں اس کا اختیار دیا ہو یا نہ دیا ہو، یہ امام مالک، امام اوزاعی، شعبی اور نخعی کا قول ہے، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا بھی ایک قول یہی ہے، علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

"وتفريقهما جائز على الزوجين سواء وافق حكم قاضي البلد أو خالفه وكلهما الزوجان بذلك أو لم يوكلاهما.....وهو قول مالك والأوزاعي واسحاق" (الجامع لأحكام القرآن: ۱۷۶/۵، بداية المجتهد: ۵۳۳/۹، كتاب الصداق، باب النشوز)

دونوں فریق بنیادی طور پر اسی آیت شقاق نیز حضرت علیؓ کے ایک اثر سے اپنے اپنے انداز میں استدلال کرتے ہیں، لیکن اختصار کے سبب اس مختصر تحریر میں دلائل سے صرف نظر کرنا ہی مناسب ہے، ان دلائل کے لیے اردو میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی کتاب ''طلاق وتفریق'' کا مطالعہ مفید ہوگا۔

دارالقضاؤں میں امام مالک کے مسلک پر عمل ہے

ضرورت وحاجت کے پیش نظر شقاق کے مسئلہ میں احناف نے امام مالک کا قول اختیار کرلیا ہے، تاکہ عورت سے ظلم وتعدی کو دور کیا جاسکے، مولانا قاضی عبدالصمد رحمانی سابق نائب امیر شریعت بہار واڑیسہ لکھتے ہیں:

''بہرحال زن وشوہر کے شقاق کی صورت میں جب عورت قاضی کے یہاں مقدمہ دائر کرے اور جائز شکایت کی بنا پر شوہر سے تنگ آکر تفریق کا مطالبہ کرے، تو حنفی قاضی معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر امام مالک کے مسلک پر ان ابتدائی کاروائی کے بعد جن کا ذکر امام مالک کے مسلک کے تحت تیرہویں بنیاد میں ہوچکا ہے، بااختیار حکمین کے ذریعہ شقاق کے معاملہ کو ان کی تفصیل کے مطابق ختم کرادے۔'' (کتاب الفسخ والتفریق: ۱۵۶، تفریق کی چودھویں بنیاد، نیز دیکھئے: طلاق وتفریق، از: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، صفحہ: ۶۹-۷۰، نیز صفحہ: ۱۰۳، جدید فقہی مسائل: ۱۶۳/۳، ومباحث فقہیہ، از: مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ، صفحہ: ۴۸۹)

حکمین کی شرائط

جب کسی مسئلہ میں ضرورت وحاجت کے پیش نظر دوسرے مسلک کو اختیار کیا جائے تو اس مسلک کی تمام شرائط کا اختیار کرنا بھی ضروری ہوتا ہے، جیسا کہ قاضی عبدالصمد رحمانی کی تحریر میں گزر چکا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ہم حکمین کی مالکیہ کے نزدیک شرائط سے واقف ہوں اور ان کا تقرر اسی اعتبار سے کریں، مالکیہ نے تصریح کی ہے کہ حکمین میں سات شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:

(۱) مسلمان ہوں (۲) بالغ ہوں
(۳) عاقل اور سمجھدار ہوں (۴) مرد ہوں
(۵) عادل ہوں (۶) متعلقہ احکام سے واقف ہوں، خواہ قاضی یا کسی اور کے سمجھانے ہی سے واقف ہوئے ہوں۔

(۷) آزاد ہوں۔

ابوعبداللہ خرشی لکھتے ہیں:

"یشترط فیه الذکورة والعدالة والرشد والفقه بما حکم فیه" (الخرشی: ۸/۴-۹، فصل إنما یجب قسم الزوجات والتاج والاکلیل: ۲۶۴/۵، کتاب النکاح، فصل فی القسم بین الزوجات)

پھر مالکیہ کے یہاں یہ بھی واجب ہے کہ حکمین زوجین کے خاندان سے ہوں، لیکن اگر مذکورہ صفات کا کوئی شخص خاندان میں نہ ہو تو اجنبی کو حکم بنا سکتے ہیں، اس صورت میں مستحب یہ ہوگا کہ وہ ان کے پڑوسی ہوں:

"وإن لم یمکن فأجنبیین (إلی) لأن ظاهر الآیة أن کونهما من أهلهما واجب شرط" (بلغة السالك بهامش الشرح الصغیر: ۵۱۳/۲، باب النکاح، القسم بین الزوجات، المدونة الکبری: ۲۳۴/۲-۲۵۵، ما جاء فی الحکمین)

ساتھ ہی تفریق کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ حکمین تفریق پر متفق ہوں، ورنہ اگر ایک تفریق کرنا چاہے، دوسرا اس سے اختلاف کرے تو ان میں سے کسی کا بھی قول نافذ نہیں کیا جاسکتا:

"فان اختلف الحکمان لم ینفذ قولهما..الخ" (جامع أحکام القرآن: ۱۷۷/۵، المدونة الکبری: ۲۵۷/۲)

مالکیہ کے یہاں اس میں اختلاف ہے کہ کیا دو کے بجائے ایک حکم مقرر کرنا صحیح ہوگا؟ تو اگر زوجین کسی کو حکم بنائیں تو بالاتفاق ایک حکم کافی ہے، قاضی بنائے تو اختلاف ہے، لیکن راجح اس کا جواز ہے:

"والأظهر من القولین القول بالجواز" (حاشیة الدسوقی: ۲۱۵/۳)

واللہ أعلم بالصواب.

طلاق کے بارے میں سپریم کورٹ کے فیصلے: ایک جائزہ

مولانا عتیق احمد بستوی
(سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء لکھنو)

۱۹۷۳ء میں شریعہ اپلیکیشن ایکٹ منظور ہوا، اس ایکٹ میں دس امور کا ذکر ہے، ان دس امور سے متعلق مسلمانوں کے مقدمات میں ہندوستانی عدالتوں کا فیصلہ اسلامی قانون کے مطابق ہوا کرتا تھا، اور ہندوستانی عدالتیں اس کی بھی پابند تھیں کہ مسلمانوں کے یہاں اس معاملہ کی بابت جو قانون ہے اسی کے مطابق فیصلہ کیا کریں، ہندوستان میں چونکہ حنفی فقہ ماننے والوں کی غالب اکثریت ہے اس لئے ان معاملات میں فقہ حنفی کے مطابق فیصلے ہوا کرتے تھے، ہاں اثنا عشری شیعہ حضرات کے مقدمات میں فقہ اثنا عشری کے مطابق فیصلہ ہوتا تھا، اس مقصد کے لئے ہدایہ اور فتاوی عالمگیری کے وہ حصے جن کا تعلق مسلم پرسنل لا سے تھا ان کا انگریزی ترجمہ بھی کیا گیا تا کہ ججوں کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو، ججز اس کے پابند تھے کہ از خود کتاب وسنت میں غور وفکر کر کے اسلامی قانون کی تشریح نہ کریں بلکہ مسلمانوں کے یہاں معتبر فقہاء نے جو قانون بتایا ہے اور جو تصریحات کی ہیں ان ہی کی پابندی کرتے ہوئے اپنے فیصلے تحریر کریں، پریوی کونسل اور سپریم کورٹ کے بعض فیصلوں میں اس کی ہدایت بھی ہے کہ کسی مذہبی قانون کی تشریح ججز از خود نہ کریں بلکہ اس قانون کے معتبر شارحین نے جو تشریح کی ہے اس کو قبول کریں اور اس کے مطابق فیصلہ کریں۔

ملک کی آزادی کے کافی دنوں بعد ہندوستان کی عدالتوں میں یہ رجحان پیدا ہو کہ وہ معتبر مسلم فقہاء کی تشریحات سے ہٹ کر اپنے طور پر اسلامی قانون کی تشریح کریں اور قرآن

سے اسلامی قانون اخذ کریں۔

اس رجحان کا نمایاں مظاہرہ گوہاٹی ہائی کورٹ کے جج جسٹس بحر الاسلام نے اپنے فیصلہ میں کیا جس میں انہوں نے طلاق واقع ہونے کے لئے کچھ خود ساختہ شرطیں عائد کیں، اور اس کے لئے انہوں نے سورہ نساء: آیت نمبر ۳۴، ۳۵ سے استدلال کرتے ہوئے وقوع طلاق کے لئے ایسی متعدد شرطوں کا ذکر کیا جو ان کے ذہن کی پیداشدہ تھیں، اور پوری اسلامی تاریخ میں کسی مفسر، فقیہ، محدث اور عالم دین نے ان کا ذکر نہیں کیا بلکہ ان کے خلاف تصریحات سب کے یہاں موجود ہیں، اسی طرح کا ایک دوسرا فیصلہ ۲۰۰۲ میں بمبئی ہائی کورٹ کی اورنگ آباد بنچ کی طرف سے آیا اس میں بھی وہی باتیں دہرائی گیں جو گوہاٹی ہائی کورٹ کے فیصلے میں تھیں، اس کے بعد ہندوستان کی عدالت عالیہ سپریم کورٹ نے ۲۰۰۲ میں شمیم آرا کیس کے فیصلہ میں انہی باتوں کا اعادہ کیا اور جسٹس بحر الاسلام کے فیصلے کی ستائش کرتے ہوئے اسے اپنے فیصلہ کا حصہ بنایا، اس طرح سپریم کورٹ کے ذریعہ سے پورے ملک میں اس کا نفاذ ہو گیا۔

اسی سلسلہ کا ایک قدم ۲۰۰۱ء میں نفقہ مطلقہ کے بارے میں سپریم کورٹ کا فیصلہ تھا کہ مطلقہ عورت عدت گزرنے کے بعد بھی طلاق دینے والے شوہر سے نفقہ پانے کی مستحق رہے گی جب تک کہ اس کا انتقال نہ ہو جائے یا اس کا کہیں اور نکاح نہ ہو جائے۔

اس فیصلہ کے مضر اثرات کو دور کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے ملک گیر سطح پر اس کے خلاف تحریک چلائی اور بالآخر حکومت اس کے لئے تیار ہوئی کہ اس فیصلہ کے برے اثرات کو دور کرنے کے لئے پارلیمنٹ میں قانون پاس کرایا جائے، چنانچہ ۱۹۸۶ء میں ''تحفظ حقوق مسلم مطلقہ بل'' پارلیمنٹ سے پاس ہو گیا، اس بل میں کچھ خامیاں رہ گئی تھی جس کا ازالہ نہیں کیا جا سکا اور دوسری طرف اس بل کے خلاف سپریم کورٹ میں کئی مقدمات دائر کئے گئے اور ان مقدمات کا فیصلہ دانیال لطیفی کیس میں ۱۹۸۶ء میں جاری ہوا جس میں تحفظ حقوق مسلم مطلقہ بل کو نہ صرف بے اثر کر دیا گیا بلکہ اسلام کے عائلی قوانین میں مداخلت

کی مزید راہیں کھول دی گئیں، سپریم کورٹ آف انڈیا نے ایک غیر مسلم خاتون کے مقدمہ کی سماعت کرتے ہوئے مسلم خواتین کے حوالہ سے تین طلاق کے مسئلہ کو چھیڑتے ہوئے سپریم کورٹ ہی کی طرف سے ایک کیس دائر کیا اور تین طلاق کا مسئلہ عدالت کے علاوہ قومی میڈیا میں گرم کر دیا گیا، چند ایسی مسلم خواتین عدالت میں کھڑی کر دی گئیں جو اپنے کو تین طلاق کا شکار بتا رہی تھیں، تین طلاق کا مقدمہ سپریم کورٹ میں چلا، اس کی بھرپور پیروی کی گئی لیکن ۲۰۱۷ء میں چیف جسٹس کی سربراہی میں پانچ رکنی ٹیم نے جو فیصلہ دیا وہ اپنی جگہ حیرت انگیز فیصلہ تھا، یہ فیصلہ تین فیصلوں کا مجموعہ تھا لیکن چونکہ تین ججز اس بات پر متفق تھے کہ تین طلاق کو سرے سے واقع نہ مانا جائے، ایک طلاق بھی شمار نہ کی جائے، اس لئے یہی فیصلہ ٹھہرا، ظاہر ہے کہ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ اسلامی قانون میں صریح مداخلت ہے، لیکن بھاجپا گورنمنٹ اس پر مطمئن نہیں ہوئی اور اس نے ضروری سمجھا کہ ایک قانون بنا کر اسلام کے قانون طلاق کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے، اس لئے ۲۰۱۷ء میں اس طرح کا بل پارلیمنٹ میں پیش ہوا اور پھر پاس ہو گیا، ایوان بالا نے بھی اسے منظور کر لیا اور صدر جمہوریہ کے دستخط سے امتناع طلاق کا یہ قانون ملک میں نافذ ہو گیا، حالانکہ مسلمانان ہند خصوصاً مسلم خواتین نہ اس فیصلہ پر راضی تھیں اور نہ ہی اس بل سے متفق ہیں بلکہ طلاق کے موجودہ بل میں عورتوں کے لئے بہت سے مسائل پیدا کر دئے ہیں، ہندوستان کی تاریخ کا یہ عجیب وغریب بل ہے جس کو پارلیمنٹ نے اس طبقہ کی بھرپور مخالفت کے باوجود پاس ونافذ کیا تھا جس کی ہمدردی اور خیر خواہی کے نام پر یہ بل منظور کیا تھا۔

سپریم کورٹ کے فیصلہ کا جائزہ

تین طلاق کے بارے میں سپریم کورٹ کے فیصلہ (جس میں تین طلاق کو کالعدم قرار دیا گیا ہے) کے تفصیلی جائزہ کی ضرورت ہے، ابھی شرعی نقطۂ نظر سے اور قانونی اعتبار سے اس فیصلہ کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا جا سکا، بہت سے حضرات نے تو فیصلہ کو پڑھے بغیر سنی

سنائی باتوں کی بنیاد پر اپنے ردعمل کا اظہار کیا، مسلم سماج پر خصوصاً عورتوں پر (جن کی ہمدردی کے نام پر یہ پورا ہنگامہ برپا کیا گیا) اس فیصلہ کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ ان کی مشکلات حل ہونگی یا ان کے لئے نئی نئی مشکلات اور پیچیدگیاں جنم لیں گی اس کا تفصیل سے اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنا ضروری ہے، اس فیصلہ کے جائزہ میں اسلامی قانون کے ماہرین، قوانین ہند کے ماہرین نیز ماہرین سماجیات کی بھرپور شرکت ضروری ہے۔

ہندوستان کی سپریم کورٹ کی تاریخ میں یہ فیصلہ اپنی عجیب وغریب خصوصیات کے اعتبار سے یاد رکھا جائے گا، پانچ رکنی بینچ کا یہ فیصلہ دراصل تین فیصلوں پر مشتمل ہے، ایک فیصلہ چیف جسٹس انڈیا جگدیش سنگھ کیہر اور جسٹس ایس عبدالنظیر کا ہے، دوسرا فیصلہ جسٹس روہنٹن فالی نریمن اور جسٹس ادے امیش للت کا ہے، اور تیسرا فیصلہ جسٹس کورین جوزف کا ہے۔

فیصلہ تقریباً چار ہزار صفحات پر مشتمل ہے، فیصلہ میں تمام فریقوں کے دلائل کا احاطہ کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، چیف جسٹس جگدیش سنگھ کیہر اور جسٹس عبدالنظیر کے علاوہ باقی تین ججوں نے ایک ساتھ دی گئی تین طلاقوں کو کالعدم قرار دیا ہے، یعنی اس صورت میں ایک طلاق بھی نہیں پڑے گی، یہی اکثریتی فیصلہ کا لب لباب ہے، چیف جسٹس کیہر اور جسٹس عبدالنظیر نے ایک طرف تو ایک ساتھ دی گئی طلاق کو اسلامی قانون کا حصہ تسلیم کیا، اور پوری صفائی سے اس بات کا اقرار کیا کہ تین طلاق کا زیر بحث مسئلہ دستور کی دفعہ ۲۵ کے تحت آتا ہے، اور اس کے بارے میں عدالت کو کسی مداخلت کا اختیار نہیں ہے، لیکن پھر مداخلت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چھ مہینے کے لئے مسلمان مردوں پر پابندی عائد کی جاتی ہے کہ وہ ایک ساتھ تین طلاق نہ دیں، اس دوران حکومت تین طلاق کے مسئلہ میں قانون سازی کرے، درحقیقت فیصلہ وہی ہے جو تین ججوں نے کیا ہے کہ ایک ساتھ دی گئی تین طلاق قانوناً کالعدم ہے، اس سے ایک طلاق بھی نہیں پڑے گی، اس فیصلہ کے بعد چیف جسٹس کیہر اور جسٹس عبدالنظیر کا یہ مشورہ یا ہدایت کالعدم قرار پاتی ہے کہ حکومت اس مسئلہ پر قانون سازی کرے۔

جن تین ججوں نے ایک ساتھ دی گئی طلاق کو کالعدم قرار دیا ہے، انہوں نے سپریم کورٹ کے شمیم آرا کیس کے فیصلے کا حوالہ دیا ہے، اور اس فیصلہ کی مکمل طور پر تائید وحمایت کی ہے، جسٹس روہنٹن فالی نارئین اور جسٹس ادے امیش للت نے اپنے مشترکہ فیصلے کے پیراگراف نمبر ۵۶ اور ۵۷ میں لکھا ہے:

''۵۶۔ زیر سماعت معاملہ میں صریحاً یک طرفہ کارروائی کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بالکل واضح ہے کہ طلاق ثلاثہ طلاق کی ایک ایسی شکل ہے جو کہ بدعت ہے، بالفاظ دیگر یہ سنت سے ثابت نہیں ہے، بلکہ یہ بے قاعدہ اور دین سے انحراف پر مبنی طلاق ہے، فیضی کی کتاب میں یہ مذکور ہے کہ طلاق کی یہ شکل جو کہ حنفی مسلک میں معروف ہے جائز ہونے کے باوجود گناہ ہے، اور غضب الٰہی کی مورد ہے، درحقیقت شمیم آرا مقدمہ میں بنام ریاست یوپی (۲۰۰۷)، 7SSC518 میں اس عدالت نے متعدد سندوں بشمول حالیہ ہائی کورٹ فیصلوں کا حوالہ دیتے ہوئے یہ رائے دی:

۱۳۔ قرآن میں مذکورہ صحیح طلاق کا قانون یہ ہے کہ طلاق کی کوئی معقول وجہ ہونا چاہئے، اور طلاق سے قبل شوہر اور بیوی میں دو ثالثوں کے ذریعہ مصالحت کی کوشش ہونی چاہئے، ایک ثالث شوہر کے خاندان سے اور دوسرا بیوی کے خاندان سے ہونا چاہئے، اگر مصالحت کی کوشش ناکام ہو جاتی ہے پھر طلاق پر عمل پیرا ہونا چاہئے، (جزء ۱۳ رقیہ خاتون مقدمہ (۱۸۹۱) 1GAU LR375 ڈویزن بینچ نے اس رائے کا اظہار کیا کہ قرآن کی رو سے طلاق کا صحیح طریقہ یہ ہے:

(۱) طلاق کی معقول وجہ ہونا چاہئے، (۲) اس سے قبل مصالحت کی کوشش لازم ہے، شوہر اور بیوی کے درمیان دو ثالثوں کی مصالحت کی کوشش کرنی چاہئے، ان میں سے ایک شوہر کے خاندان سے دوسرا بیوی کے خاندان سے ہونا چاہئے، ان کی کوشش کی ناکامی کی صورت میں طلاق دینا چاہئے، ڈویزن بینچ نے واضح طور پر بمبئی اور کلکتہ کی رائے سے اختلاف کیا کہ انہوں نے صحیح قانون پیش نہیں کیا۔

۱۴۔ ہائی کورٹ کے فاضل ججوں کی مذکورہ بالا رائے سے ہم ادب واحترام کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں (ص:526)۔

57۔ چونکہ طلاق ثلاثہ فوری اور ناقابل فسخ ہوتی ہے، یہ ظاہر ہے کہ اس صورت میں شوہر اور بیوی کے مابین ان کے خاندانوں کے دو ثالثوں کی مصالحت کی کوشش جس سے نکاح کا رشتہ برقرار رہے، اس کا کوئی امکان نہیں رہتا، رشید احمد مقدمہ میں پریوی کونسل نے یہ رائے دی تھی کہ معقول وجہ کے بغیر بھی طلاق جائز ہے، البتہ شمیم آرا مقدمہ کے بعد یہ رائے بے وقعت ہے، موجودہ صورتحال یہ ہے کہ طلاق ثلاثہ صریحاً یک طرفہ ہے، کیونکہ مسلمان مرد مصالحت کی کسی کوشش کے بغیر محض اپنی مرضی سے جب چاہے رشتۂ ازدواج توڑ دے، لہذا طلاق کی اس شکل کو دستور ہند کی دفعہ ۱۴ میں مذکور بنیادی حقوق کے منافی سمجھنا چاہئے، اسی لئے ہماری رائے میں ۱۹۳۷ء ایکٹ اس معنی میں فسخ ہونا چاہئے، جس کے مطابق طلاق ثلاثہ کو تسلیم اور قابل عمل سمجھا گیا ہے، چونکہ صریحاً یک طرفہ ہونے کے باعث ہم نے ۱۹۳۷ء ایکٹ کے سیکشن ۲ کو کالعدم قرار دیا ہے، مذکورہ معاملات میں نااتفاقی کی ان تفصیلات کی چنداں ضرورت نہیں، جس کے لئے فاضل اٹارنی جنرل نے دلیل دی، اور جس کی حمایت دیگر افراد نے کی۔

جسٹس کورین جوزف جو تین طلاق کے بارے میں فیصلہ دینے والی سپریم کورٹ کی بینچ کے رکن تھے، وہ مذہباً عیسائی ہیں انہوں نے اپنے فیصلہ کے پیراگراف ۲۴، ۲۵، ۲۶ میں درج ذیل باتیں لکھی ہیں، جنہیں ہم ان کے فیصلے کا خلاصہ اور لبِ لباب کہہ سکتے ہیں:

۱۔ دستور ہند کی رو سے اپنی مرضی کے مطابق کسی مذہب پر عمل اور اس کی ترویج ایک بنیادی حق ہے، جس کی دستور ہند نے ضمانت دی ہے، یہ حق البتہ ان امور کے تابع ہے۔ (۱) امن عامہ (۲) صحت عامہ (۳) اخلاقیات (۴) بنیادی حقوق سے متعلق جزء سوم کی دیگر شقیں۔

(۱) دفعہ ۲۵ کے تحت جس آزادی کی ضمانت دی گئی ہے اس سے قطع نظر (۲) دفعہ ۵

۲ کے تحت ریاست کو یہ اختیار ہے کہ وہ دوصورتوں میں قانون سازی کرے، (۳) دفعہ ۲۵ میں درج ہے کہ اس دفعہ کی رُو سے کسی موجودہ قانون کے جاری رہنے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور ریاست کو قانون سازی سے باز نہیں رکھا جائے گا، اگر (۱) ایسے قانون کی ضرورت پڑے جو کسی مذہبی فعل سے متعلق کسی معاشی، سیاسی، یا سیکولر سرگرمی پر نظر رکھے یا اسے محدود کرے اور (۲) عوامی سطح کے ہندو مذہبی اداروں کے دروازے معاشرتی اصلاح اور بہبود کے لئے ہندوؤں کے تمام طبقوں کے لئے کھول دیئے جائیں۔

مذکورہ بالا حدود کے اندر دستور ہند کے تحت مذہبی آزادی مطلق ہے اور اس باب میں فاضل چیف جسٹس سے متفق ہوں۔

البتہ میں احترام کے ساتھ اس بیان سے اختلاف کرتا ہوں کہ طلاق ثلاثہ مذہبی فعل کا لازمی جز ہے، محض اس بنیاد پر کہ کوئی فعل عرصہ سے جاری ہے اسے جواز عطا نہیں کرتا بالخصوص جب کہ وہ فعل جائز نہ ہو۔

۱۹۳۷ء ایکٹ کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ شریعت کو فیصلہ کی بنیاد بنایا جائے اور جز دو ۲ میں مذکور موضوعات جن میں طلاق شامل ہے ان کے حوالے سے غیر شرعی افعال کو ختم کیا جائے۔

غرضیکہ ۱۹۳۷ء ایکٹ کے نفاذ کے بعد کسی ایسے فعل کی مطلق اجازت نہیں جو احکام قرآنی کے خلاف ہو، لہٰذا اس فعل کے لئے دستوری تحفظ نہیں اور میں فاضل چیف جسٹس سے اس بات میں اختلاف کرتا ہوں کہ طلاق ثلاثہ کو دستوری تحفظ حاصل ہے، مجھے اس بارے میں بھی شدید شک وشبہ ہے کہ دفعہ ۱۴۲ کی رُو سے کسی بنیادی حق پر عمل درآمد کے بارے میں حکم امتناعی دیا جاسکتا ہے۔

۲۵۔ جب ایسی صورت حال رونما ہوتی ہے تو مباحثے میں مذہب اور دیگر دستوری حقوق کے مابین تصادم کا رنگ غالب آجاتا ہے۔

میری دانست میں دونوں کے مابین ہم آہنگی ممکن ہے، لیکن ان مختلف مفادات کے

درمیان مصالحت کرانا مقنّنہ کے دائرہ اختیار میں ہے۔

لیکن اس اختیار کو دستوری حدود میں ہی استعمال کرنا چاہئے اور اس کے نتیجہ میں دستور ہند کی دی ہوئی مذہبی آزادی کی ضمانت کو کوئی گزند نہیں پہونچا چاہئے، البتہ یہ عدالت کا فرض منصبی ہے کہ وہ کسی قانون سازی کی ہدایت دے۔

۲۶۔ خوش قسمتی سے اس عدالت نے اپنا فرض شمیم آرا مقدمہ میں انجام دے دیا ہے، میں غیر مبہم الفاظ میں اس قانون کی تائید وتوثیق کرتا ہوں جو کہ شمیم آرا مقدمہ میں موجود ہے۔

جو فعل قرآن کی نظر میں غلط ہے وہ شریعت کی نگاہ میں صحیح نہیں ہوسکتا ہے، اور جو فعل دینی لحاظ سے غلط ہے وہ قانون کی رُو سے بھی غلط ہی ہے۔

جسٹس کورین جوزف، نئی دہلی

۲۲/اگست ۲۰۱۷ء

طلاق سے متعلق مختلف فیصلوں کا تجزیہ

شمیم آرا کیس کا فیصلہ کوئی تفصیلی فیصلہ نہیں ہے، اس فیصلہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سپریم کورٹ کے فاضل جج نے بعض ہائی کورٹوں کے فیصلوں پر اعتماد کر کے اور انہیں بنیاد بنا کر اپنا یہ فیصلہ صادر کیا، ذیل میں ہم شمیم آرا کیس کے فیصلہ کے مندرجات اور یہ فیصلہ ہائی کورٹوں کے جن فیصلوں پر مبنی ہے ان کے مشتملات کا تفصیلی جائزہ پیش کریں گے تاکہ علم وتحقیق کی کسوٹی پر اس فیصلہ کو جانچا جاسکے۔

جسٹس بحرالاسلام (گوہاٹی ہائی کورٹ) اور ان کے ہم خیال ججوں نے وقوع طلاق کے لئے جو نئی شرطیں عائد کیں ان کا کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کے وسیع ذخیرہ میں دور دور تک پتہ نہیں ہے، طلاق واقع ہونے کے لئے یہ شرط عائد کرنا کہ طلاق کی کوئی معقول وجہ موجود ہو اور طلاق سے پہلے افہام وتفہیم کی کوشش کر لی گئی ہو، دونوں کے خاندان سے ایک

ایک حکم مقرر کر کے معاملہ کو حل کرنے کی کوشش بھی ناکام ہو چکی ہو، گواہوں کے سامنے طلاق دی گئی ہو اور بیوی اور ان کے گھر والوں کو طلاق دینے کی اطلاع دے دی گئی ہو۔

یہ سب شرطیں خود ساختہ اور ایجاد بندہ ہیں، کتاب وسنت اور اسلامی قانون سے ان کا دور کا کوئی تعلق نہیں ہے، ہمارے فاضل ججوں کو سورہ نساء کی آیت نمبر ۳۴۔۳۵ سے مغالطہ میں ڈالا گیا، اور جن آیات کے آگے پیچھے کہیں طلاق کا ذکر نہیں اُنہیں طلاق کا پرو سیجر (طریقۂ کار) بنا کر پیش کیا گیا ہے، وہ دونوں آیات اور ان کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرًا (٣٤) وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا (٣٥)

ترجمہ: مرد عورتوں پر نگراں ہیں، اس لئے کہ اللہ ہی نے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی ہے، اور اس لئے کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں، پس نیک عورتیں وہ ہیں جو فرمانبردار ہیں اور اللہ کی حفاظت سے مرد کی عدم موجودگی میں (اپنی عزت وآبرو اور مال واولاد کی) حفاظت کرتی ہیں، اور تم کو جن عورتوں سے نافرمانی کا اندیشہ ہو، ان کو سمجھاؤ، خوابگاہ میں ان سے بے تعلقی برتو، اور ان کو (ہلکے طریقہ پر) مارو، اگر وہ تمہاری فرماں برداری کرنے لگیں تو پھر ان پر زیادتی کے لئے بہانے تلاش مت کرو، بے شک اللہ بڑی بلندی اور عظمت والے ہیں، اور اگر تم کو آپس میں نزاع کا اندیشہ ہو، تو مرد کے لوگوں میں سے ایک پنچ اور عورت کے لوگوں میں سے ایک پنچ مقرر کر دو، اگر دونوں صلح کرانا چاہیں گے تو اللہ ان دونوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر دیں گے، بیشک اللہ خوب جاننے والے اور باخبر ہیں۔''

مندرجہ بالا آیات میاں بیوی کے تعلقات اور ازدواجی جھگڑوں کو ختم کرنے کے

بارے میں بہت ہی بنیادی رہنمائی دیتی ہیں، بلاشبہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ ازدواجی رشتہ قائم کرنے کا فیصلہ وقتی تأثر اور جلد بازی میں نہ کیا جائے، بلکہ پورے غور وخوض کے بعد فریقین کے ایک دوسرے کے بارے میں صحیح معلومات کر لینے اور مطمئن ہو جانے کے بعد ہی نکاح کا رشتہ قائم کیا جائے، اس سلسلہ میں اسلام نے بہت سی ہدایات دی ہیں، یہاں تک کہ مرد جس عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے اسے دیکھنے تک کی اجازت وہدایت دی ہے، حالانکہ عام حالات میں اجنبیہ عورت کو دیکھنا ممنوع ہے، لیکن جب رشتۂ ازدواج قائم ہو گیا تو اس کے بعد ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے اور رشتۂ ازدواج کو باقی وقائم رکھنے کی پوری کوشش ہونی چاہئے، اس سلسلہ میں اسلامی شریعت نے میاں بیوی دونوں کو بڑی حکیمانہ ہدایات دی ہیں، اگر ان پر عمل کیا جائے تو رشتۂ نکاح کو ختم کرنے کی نوبت شاذ ونادر ہی آئے، ان ہدایات اور تعلیمات کو پیش کرنے کے لئے کافی وقت اور فرصت درکار ہے، اور احقر نے اپنی کتاب ''طلاق کب، کیوں اور کیسے'' میں ان ہدایات کو اختصار کے ساتھ لکھ دیا ہے، طلاق کے موضوع پر اس کتابچہ کا ترجمہ انگریزی اور گجراتی میں ہو چکا ہے۔

سورہ نساء کی جن دو آیات سے ہمارے ججوں نے طلاق کے لئے خود ساختہ شرطیں عائد کرنے کی کوشش کی ہیں، انہیں غور سے پڑھے جانے اور آیات کے سیاق وسباق سے ملا کر دیکھنے کی ضرورت ہے، ان آیات کے سیاق وسباق میں کہیں طلاق کا ذکر نہیں ہے، بعض فیصلوں میں آیت نمبر ۳۴ کے اس ٹکڑے کو ''فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا'' کو طلاق سے جوڑنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ آیت کا یہ ٹکڑا بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر نافرمان بیوی آیت میں ذکر کردہ طریقوں کے استعمال سے راہ راست پر آ جائے، اور نافرمانی کی روش ترک کر دے، اب اس کے ساتھ شوہر کا رویہ منصفانہ اور شریفانہ ہونا چاہئے، ماضی کی غلطیوں کی وجہ سے نہ اسے طعن وتشنیع کرے، نہ ایذا رسانی کرے۔

قرآن کریم کا ایک معجزہ یہ ہے کہ اس کی بعض آیات سے اگر کہیں غلط مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور تلبیس یا تشکیک کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے تو خود قرآن

کریم کی دوسری آیات ان کوششوں کو ناکام بنادیتی ہیں، اور حقائق سے پردہ اٹھادیتی ہیں، طلاق کے زیر بحث مسئلہ میں بھی قرآن کا یہ اعجاز واضح طور پر سامنے آتا ہے، قرآن کریم میں مختلف سورتوں اور آیتوں میں طلاق کے احکام ومسائل ذکر کئے گئے ہیں، طلاق اور اس سے متعلق دوسری چیزیں مثلاً عدت، نفقہ، مطلقہ اور نفقۂ اولاد وغیرہ کا ذکر بڑی وضاحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

سورہ بقرہ، سورہ احزاب نیز سورۂ طلاق میں مختلف آیات طلاق سے متعلق ہیں، لیکن کہیں بھی ان شرائط کا صراحتاً یا اشارتاً تذکرہ نہیں ہے، جن پر ہمارے جج صاحبان کا اصرار ہے، اور جنہیں یہ حضرات سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳۴ اور ۳۵ کے حوالے سے ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں، بلکہ قرآن کریم میں ایسی متعدد آیات ہیں جو ان خودساختہ شرائط کی نفی کرتی ہیں، اور اس بات پر وضاحت کے ساتھ دلالت کرتی ہیں کہ طلاق واقع ہونے کے لئے وہ اقدامات ناگزیر نہیں ہیں جن کا سورۂ نساء کی آیات ۳۴، اور ۳۵ میں ذکر ہے۔

قرآن کریم میں طلاق کی جن صورتوں کا ذکر ہے ان میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ نکاح ہونے کے بعد ابھی رخصتی بھی نہیں ہوئی ہو، اور ازدواجی تعلقات قائم نہ ہوئے ہوں اور شوہر بیوی کو طلاق دیدے، یہ طلاق قرآن کی صراحت کے مطابق واقع ہوجاتی ہے، ایسی عورت پر عدت لازم نہیں، اور وہ طلاق ہونے کے فوراً بعد دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے، پھر اس عورت کے بارے میں دو شکلوں کا ذکر کیا گیا ہے، ایک یہ کہ نکاح کرتے وقت مہر مقرر کیا گیا تھا، اس صورت میں مقررہ مہر کا نصف عورت کو ملے گا، اور دوسری شکل یہ ہے نکاح کے وقت مہر کا ذکر نہ کیا گیا ہو، ایسی صورت میں اس عورت کو کچھ ہدیہ تحفہ دے کر رخصت کردیا جائے گا، مہر کے نام سے وہ کسی چیز کی حقدار نہ ہوگی، اس مسئلہ سے متعلق جو قرآنی آیات ہیں انہیں چند سطروں کے بعد درج کیا جاتا ہے، غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب صرف نکاح ہوا ہے رخصتی نہیں ہوئی ہے، ایسی صورت میں ان چیزوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا جن کا ذکر سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳۴ اور ۳۵ میں ہے، عورت کی طرف سے

نافرمانی، سرکشی کا تصور اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ رخصتی ہوگئی ہو اور ازدواجی زندگی شروع ہوچکی ہو، اسی طرح شوہر کے لئے عورت کو سمجھانا، فہمائش کرنا، خواب گاہ میں بے رخی اختیار کرنا، ہلکی زدوکوب کرنا اسی وقت ممکن ہے جب کہ دونوں ساتھ رہتے ہوں، اور عملاً ازدواجی زندگی کا آغاز ہوچکا ہو، میاں بیوی کی ایک دوسرے سے آخری درجہ کی ناچاقی اور منافرت جس کو دور کرنے کے لئے دونوں طرف سے ثالثوں کی تقرری ہو اسی وقت متصور ہے جب کہ دونوں کچھ مدت ایک ساتھ رہ چکے ہوں، اور باہمی تعلقات میں زیادہ تلخیاں پیدا ہوچکی ہوں، اب آپ ان آیات کو مطالعہ کیجئے جن میں نکاح کے بعد ازدواجی تعلق قائم ہونے سے پہلے طلاق دئے جانے اور ان کے واقع ہونے کا ذکر ہے:

لَّا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ (سورۂ بقرہ، آیت:۲۳۶)

ترجمہ: تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم ان بیویوں کو جنہیں تم نے ہاتھ نہیں لگایا، اور نہ ان کے لئے مہر مقرر کیا طلاق دیدو، اور انہیں خرچ دیدو، وسعت والے کے ذمہ اس کی حیثیت کے لائق ہے، اور تنگی والے کے ذمہ اس کی حیثیت کے لائق، (یہ) خرچ شرافت کے موافق ہو، (اور یہ) واجب ہے خوش معاملہ لوگوں پر۔''

وَإِن طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَن يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَأَن تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَلَا تَنسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (سورۂ بقرہ، آیت:۲۳۷)

ترجمہ: اور اگر تم نے انہیں طلاق دے دی ہے، قبل اس کے کہ انہیں ہاتھ لگایا ہو، لیکن ان کے لئے کچھ مہر مقرر کرچکے ہو، تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہے اس کا آدھا واجب ہے، بجز اس صورت کے کہ (یا تو) وہ عورتیں خود معاف کردیں، یا وہ (اپنا حق) معاف کردے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے، اور اگر تم (اپنا حق) معاف کردو تو یہ بہت ہی قریب ہے

تقوی سے، اور آپس میں لطف واحسان کو نظر انداز نہ کرو، تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ یقیناً اس کو خوب دیکھنے والا ہے۔''

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا فَمَتِّعُوهُنَّ وَسَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا (سورۂ احزاب، آیت:۱٤۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم جب مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر تم انہیں طلاق دیدو قبل اس کے کہ تم نے انہیں ہاتھ لگایا ہو تو تمہارے لئے ان کے بارے میں کوئی عدت نہیں جسے تم شمار کرنے لگو، تو انہیں کچھ مال دے دو، اور انہیں خوبی کے ساتھ رخصت کردو۔''

ہمارے ججز اور قانون داں اس بات سے تو واقف ہی ہیں کہ کسی مجموعۂ قانون میں کسی معاملہ میں اگر کوئی صریح دفعہ موجود ہے تو اسے چھوڑ کر کسی ایسی دفعہ سے جو اس معاملہ سے براہ راست متعلق نہیں ہے استنباط واستدلال کرنا اور اس صریح دفعہ کے خلاف کوئی بات نکالنا فنی لحاظ سے غلط اور غیر قانونی عمل ہے، قرآن میں طلاق کی جو شکلیں مذکور ہیں ان میں متعدد شکلیں وہ ہیں جن میں ان شرطوں کے پائے جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے جن شرطوں کو ہمارے فاضل ججز نے طلاق واقع کرنے کے لئے عائد کرنا چاہا ہے، اور جن کے لئے انہوں نے سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳۴، ۳۵ کو بہانہ بنایا ہے۔

اسلام کوئی تخیلاتی مذہب نہیں ہے، اللہ جل شانہ کائنات کے خالق اور ذرہ ذرہ سے واقف ہیں، انسان کو اور اس کائنات کو انہوں نے پیدا کیا، اور افزائش وترقی کے منازل سے گذارا، انسانوں کی نفسیات، ضروریات، خوبیوں اور کمزوریوں سے وہ بخوبی آگاہ ہیں، انسان کے لئے کون سا نظام زندگی اور کون سا قانون مناسب اور قابل عمل ہے ان سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا، اسلامی شریعت اللہ جل شانہ کی اتاری ہوئی شریعت ہے، وہ انسانوں کے لئے سب سے موزوں شریعت اور قانون ہے، اس میں انسانوں کے مختلف حالات اور طبقات کا احاطہ کیا گیا ہے، اور تمام حالات کے لئے احکام مقرر کئے گئے ہیں، نکاح کے بعد

رخصتی ہونے سے پہلے اور ازدواجی زندگی گذارنے سے پہلے طلاق عام حالات میں ایک عجیب سی بات لگتی ہے، اور جو لوگ واقعات کی دنیا سے الگ ہوکر محض نظریات کی دنیا میں رہتے ہیں ان کیلئے یہ ایک ناقابل فہم چیز ہے، لیکن واقعات کی دنیا میں ایسا متعدد بار پیش آتا ہے کہ نکاح ہوجانے کے بعد اور رخصتی ہونے سے پہلے ایسے حالات پیدا ہوجاتے ہیں جن میں یہ بات یقینی بن جاتی ہے کہ دونوں کا ازدواجی رشتہ چل نہیں سکتا، اور نباہ نہیں ہوسکتا، مثلاً شادی کی تقریب کے دوران لڑکی والوں کو یہ تجربہ اور اندازہ ہوگیا کہ لڑکا اور اس کے گھر والے بہت لالچی اور گھٹیا مزاج والے ہیں، لڑکی اگر رخصت ہوکر چلی گئی تو مستقل گھٹن اور پریشانی میں رہے گی، اسے سسرال میں سکون واطمینان نہیں مل سکتا، اسی طرح لڑکا اور اس کے گھر والوں کو شادی ہوجانے کے بعد لڑکی کے بارے میں رخصتی سے پہلے ایسی سنگین معلومات حاصل ہوتی ہیں جو اگر پہلے معلوم ہوتیں تو لڑکا اور اس کے گھر والے رشتۂ نکاح سے معذرت کردیتے، اس طرح کے حالات میں اگر طلاق کی گنجائش نہ رکھی جاتی، بلکہ موجودہ ہندوستانی قانون کے مطابق ایک مدت گذرنے کے بعد ہی طلاق کا راستہ کھلتا تو شوہر اور بیوی دونوں کے لئے بدترین سزا ہوتی، اور دونوں جوانی کے بہترین چند سال گھٹ گھٹ کر گذارتے، اس لئے اسلامی شریعت میں اس کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ نکاح کے بعد رخصتی سے قبل طلاق دی جاسکے، اور قانوناً اس کی گنجائش ہو۔

اسلام کے قانون طلاق کو ابھی چند سال پہلے مسلمان علماء اور ماہرین قانون نے مرتب نہیں کیا ہے، بلکہ یہ قانون طلاق چودہ سو سال سے پہلے اللہ جل شانہ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل فرمایا، آپ ﷺ نے اس کی تعبیر وتشریح فرمائی، اور مسلم سماج پر اسے نافذ فرمایا، آپ ﷺ کی حیات مبارکہ میں طلاق کے جو واقعات پیش آئے ان پر یہ قانون نافذ کیا گیا، صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین نے کتاب وسنت کی روشنی میں اس قانون کی جزئیات اور تفصیلات کی وضاحت فرمائی، طلاق کے ارکان، شرائط، اقسام اور الفاظ پر فقہ اسلامی میں بہت تفصیلی بحثیں ملتی ہیں، طلاق کے موضوع پر دنیا کے کسی قانون

میں اس قدر تفصیلات وجزئیات نہیں مل سکتیں جتنی اسلامی قانون میں موجود ہیں۔

قرآن کریم خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوا، قرآن کے الفاظ اور معانی آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو سکھلائے، آپ ﷺ نے قرآن کے احکام وتعلیمات پر عمل کیا، امت کو ان کی تعلیم دی، اور مسلمانوں کے سربراہ کی حیثیت سے ان احکام کو مسلم سماج پر نافذ کیا، اگر سورہ نساء کی آیت نمبر ۳۴، ۳۵ میں مذکور اقدامات طلاق کا پروسیجر ہوتے، اور انہیں طلاق واقع ہونے کے لئے شرط کی حیثیت حاصل ہوتی تو آپ ﷺ صحابہ کے سامنے اس کی وضاحت فرمادیتے، اور طلاق کے ان واقعات میں طلاق کو واقع ہی نہ مانتے، جن میں شوہر کی طرف سے وہ اقدامات نہ کرلئے گئے ہوں جن کا سورۂ نساء کی آیت ۳۴ اور ۳۵ میں ذکر ہے۔

کتب حدیث کے مطابق یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی میں طلاق کے جو واقعات پیش آئے، اور جن کا آپ ﷺ کو علم ہوا، ان میں کہیں بھی آپ نے یہ سوال نہیں کیا کہ طلاق دینے سے پہلے شوہر نے وہ اقدامات کئے یا نہیں، جن کا سورۂ نساء کی مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں تذکرہ ہے، بلکہ جن واقعات میں یہ بات واضح تھی کہ وہ اقدامات نہیں کئے گئے ہیں ان میں بھی آپ نے طلاق کو واقع مانا، اگر عہد نبوی کے طلاق کے ان واقعات کا تذکرہ کیا جائے تو ایک مفصل کتاب تیار ہوسکتی ہے، کوئی ذی عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرسکتا کہ ہماری عدالتوں کے فاضل ججز کا قرآن کا فہم نعوذ باللہ خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ سے بڑھا ہوا ہے، آیات قرآنی کی کوئی بھی ایسی تعبیر وتشریح جو رسول اکرم ﷺ، صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین کی تعبیر وتشریح سے مختلف بلکہ اس کے مخالف ہو، کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتی، خواہ وہ کتنی اونچی عدالت کی طرف سے کی جارہی ہو۔

عہد نبوی سے اگر اس طرح کی مثالیں اور واقعات پیش کئے جائیں تو کافی طوالت ہوگی، اس لئے میں ایک دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں:

دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروقؓ کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ بن عمر نے اپنی

بیوی کو زمانۂ حیض میں طلاق دیدی، یہ بات حضرت عمر کے علم میں آئی تو انہوں نے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا، آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ وہ طلاق سے رجوع کرلیں، اور طہر کا زمانہ ہونے پر طلاق دیں، واقعہ کی تفصیل تو چند سطروں کے بعد درج احادیث میں آئے گی، غور کرنے کی بات یہ ہے کہ بیٹا جو خود صحابیٔ رسول ہیں، اور احادیث نبویہ کی روایت کرنے والے چند بڑے صحابہ میں سے ہیں، وہ اپنی بیوی کو باپ کی لاعلمی میں طلاق دیتا ہے اگر تحکیم کے بعد طلاق دی گئی ہوتی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ باپ کے علم میں نہ ہوتا، پھر باپ کو صرف اس بات کی فکر ہوئی کہ بیٹے نے زمانۂ حیض میں طلاق دی ہے، جبکہ زمانۂ حیض میں طلاق دینا ممنوع ہے، پتہ نہیں کہ طلاق ہوئی کہ نہیں اور اب اس صورت میں کیا ہونا چاہئے، ان کے ذہن میں یہ سوالات نہیں آئے کہ بیٹے نے طلاق دینے سے پہلے وہ اقدامات کئے ہیں یا نہیں، جن کا سورۂ نساء کی آیات ۳۴ اور ۳۵ میں ذکر ہے، ابن عمر رضی اللہ عنہ کے طلاق دینے کا واقعہ جس کا ذکر حدیث کی تمام مستند کتابوں میں موجود ہے، اور جس کے بارے میں بہت سی روایات ہیں، ان پر غور کرنے سے طلاق کے لئے ہندوستانی عدالتہائے عالیہ کی طرف سے عائد کردہ خود ساختہ شرطوں کی قلعی کھل جاتی ہے، اور ان کا شرعاً غیر لازم ہونا ثابت ہوجاتا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ حیض میں طلاق دینے کے واقعہ سے ایک اور گتھی بھی سلجھتی ہے کہ زمانۂ حیض میں طلاق دینا اگرچہ شرعاً ممنوع ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس طلاق کو واقع مانا، اسی لئے ابن عمر رضی اللہ عنہ کو رجوع کا حکم فرمایا، اگر طلاق واقع نہ ہوتی تو رجوع کا حکم کیوں فرمائے، اسی طرح ایک وقت میں تین طلاق دینا اگرچہ ممنوع ہے، اس طرح طلاق دینے سے آدمی گناہگار ہوتا ہے، لیکن طلاق واقع ہوجاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اس طرح طلاق دینے کے واقعات پیش آئے آپ ﷺ اس پر سخت ناراض ہوئے، لیکن ایک ساتھ دی گئی تین طلاقوں کو آپ نے واقع مانا، اور بیوی کو شوہر کے لئے حرام ہوجانے کا فتوی دیا۔

اس مختصر تمہید کے بعد کتب حدیث سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے طلاق دینے کے واقعہ کو درج کیا جاتا ہے۔

"حدثنا حجاج: حدثنا یزید بن ابراهیم: حدثنا محمد بن سیرین: حدثنی یونس بن جبیر: سألت ابن عمر فقال: طلق ابن عمر امرأته وهی حائض، فسأل عمر النبی صلی الله علیه وسلم، فأمره أن یراجعها ثم یطلق من قبل عدتها، قلت: أفتعتد بتلك التطلیقة؟ قال: أرأیت إن عجز واستحمق؟" (صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب مراجعة الحائض، حدیث ۳۳۳۵، ص ٦٤٠، صحاح سته)

ترجمہ: یونس ابن جبیر نے بیان کیا کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا (کہ اگر کوئی اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے تو کیسا؟) تو فرمایا کہ ابن عمر نے (یعنی میں نے) اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دی تھی، تو حضرت عمرؓ نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا تو آنحضور ﷺ نے حکم دیا کہ ابن عمر اپنی بیوی سے رجعت کرلے، پھر طلاق دے اس کی عدت سے پہلے (یعنی طہر کی حالت میں طلاق دے) میں نے پوچھا اس طلاق کا شمار ہوگا؟ انہوں نے فرمایا: بتلاؤ اگر طلاق دینے والا احکام شرع کے بجالانے سے عاجز ہو یا احمق بیوقوف ہو تو کیا علاج ہے، یعنی طلاق کا شمار ہوگا۔ (نصر الباری، اردو ترجمہ صحیح البخاری)

"حدثنا یحییٰ بن یحییٰ التمیمی قال: قرأت علی مالك بن أنس عن نافع عن ابن عمر أنه طلق امرأته وهی حائض فی عهد رسول الله ﷺ، فسأل عمر بن الخطاب رسول الله ﷺ عن ذلك، فقال له رسول الله ﷺ مره فلیراجعها، ثم لیترکها حتی تطهر، ثم تحیض ثم تطهر، ثم إن شاء أمسك بعد، وإن شاء طلق قبل أن یمس، فتلك العدة التی أمر الله عزوجل أن یطلق لها النساء" (صحیح مسلم، باب تحریم الطلاق الحائض بغیر رضاها وأنه خالف وقع الطلاق ویؤمر برجعتها، حدیث نمبر: ۱۷٤۱)

ترجمہ: نافع ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دیا تھا، چنانچہ عمر بن الخطاب نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں دریافت کیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم انہیں رجعت کرنے کا حکم دو، پھر اپنی بیوی کو چھوڑ دے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے، پھر ناپاکی کی مدت آئے، پھر پاک ہو، پھر اس کے بعد اگر وہ چاہے تو رکھے اور اگر چاہے تو تعلق قائم کرنے سے پہلے طلاق دے دے، یہی وہ وقت ہے جس میں اللہ تعالی نے طلاق کا حکم دیا ہے۔

"حدثنا القعنبی عن مالك عن نافع، عن عبد الله بن عمر أنه طلق امرأته وهی حائض علی عهد رسول الله ﷺ، فسأل عمر بن الخطاب رسول الله ﷺ عن ذلك؟ فقال رسول الله ﷺ: مره فلیراجعها ثم لیمسکها حتی تطهر ثم تحیض ثم تطهر، ثم إن شاء أمسك بعد ذلك وإن شاء طلق قبل أن یمس، فتلك العدة التی أمر الله سبحانه أن تطلق لها النساء" (سنن ابی داؤد، باب فی طلاق السنة، حدیث ۲۱۷۹)

ترجمہ: عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دیا تھا، چنانچہ حضرت عمر نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں دریافت کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ انہیں حکم دو کہ وہ رجعت کریں، پھر اس کو اپنے پاس رکھیں یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے، پھر ناپاکی کا زمانہ آئے پھر پاک ہو جائے، اس کے بعد اگر چاہیں تو رکھیں اور چاہیں تو تعلق قائم کرنے سے قبل طلاق دیدیں، یہی وہ طریقہ ہے جس کے مطابق اللہ تعالی نے عورتوں کو طلاق دینے کا حکم دیا ہے۔

"حدثنا قتیبة بن سعید، حدثنا حماد بن زید عن أیوب عن محمد بن سیرین عن یونس بن جبیر، قال: سألت ابن عمر عن رجل طلق امرأته وهی حائض، فقال: هل تعرف عبدالله بن عمر؟ فانه طلق امرأته وهی حائض، فسأل عمر النبی ﷺ، فأمره أن یراجعها، قال: قلت: فیعتد بتلك التطلیقة؟ فقال: فمه،

أرأيت إن عجز واستحمق؟" (جامع ترمذی، باب ماجاء فی طلاق السنة، حدیث ۱۱۷۵)

ترجمہ: یونس بن جبیر کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمر سے ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا جس نے ناپاکی کی مدت میں اپنی بیوی کو طلاق دے دیا ہو، انہوں نے کیا تم عبداللہ بن عمر کو جانتے ہو؟ انہوں نے بھی اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دیا تھا، چنانچہ حضرت عمر نے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا، رسول اللہ ﷺ نے انہیں رجعت کرنے کا حکم دیا، راوی کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کیا اس طلاق کا اعتبار ہوگا؟ انہوں نے فرمایا کہ اگر طلاق دینے والا احکام شرع کو بجالانے سے عاجز ہو یا بیوقوف ہو تو کیا علاج ہے؟

ہمارے فاضل جج صاحبان نے سورۂ نساء کی آیات ۳۴ اور ۳۵ میں اجتہاد کر کے وقوع طلاق کے لئے جو شرطیں عائد کی ہیں اس نہج پر اگر قرآن سے مسائل کا استنباط کیا جانے لگا، اور اجتہاد کی گرم بازاری ہوئی تو پورا دین ہی ملیامیٹ ہو جائے گا، اور اسلامی قانون کا نقشہ مکمل طور پر تبدیل ہو جائے گا، غنیمت ہے کہ یہ نہیں کہا گیا کہ عورت کو طلاق دینے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اسے مار پیٹ کر سیدھا کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہو، کیونکہ سورۂ نساء کی آیت ۳۴ میں جہاں نصیحت کرنے اور بستر الگ کرنے کا ذکر ہے وہیں ہلکے انداز سے مارنے کا بھی ذکر ہے (واضربوھن)۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم صرف قانون کی کتاب نہیں ہے، اس میں بہت ساری اخلاقی تعلیمات و ہدایات بھی ہیں، وعظ و تذکیر کے مضامین بھی ہیں، اگر ہر سورت اور آیت کو قانون قرار دے کر اس سے احکام نکالے جائیں گے تو بہت دشواری پیش آئے گی، اور قرآن کے معانی اس سے بہت مختلف ہو جائیں گے جس طرح رسول اللہ ﷺ، صحابہ، تابعین، فقہاء امت نے انہیں سمجھا ہے۔

سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور ججز ہمارے لئے قابل احترام ہیں لیکن ان کے

سارے ادب واحترام کے ساتھ ہمیں یہ لکھنے میں کوئی جھجھک اور تکلف نہیں ہے کہ وہ حضرات عربی زبان وادب سے بالکل ناواقف ہیں، اور جن وکلاء کی معلومات کو بنیاد بنا کر ججز نے سورۂ نساء کی آیت ۳۴ اور ۳۵ کو طلاق واقع ہونے کے لئے شرط قرار دیا ہے، وہ حضرات بھی اپنی تمام تر قانونی قابلیت کے باوجود عربی زبان وادب اور اسلامی علوم سے بالکل ناآشنا ہیں، اس بارے میں ان کا سرمایہ علم قرآن کے بعض انگریزی تراجم ہیں، گوہاٹی ہائی کورٹ کے جسٹس بحر الاسلام سے پہلے ہمیں کوئی شخص نہیں ملتا جس نے سورہ نساء کی آیت ۳۴، ۳۵ میں مذکور امور کو وقوع طلاق کے لئے شرط قرار دیا ہو۔

قرآن کریم کی تفسیر میں ہزاروں ہزار کتابیں مختلف زبانوں میں لکھی گئی ہیں، لائبریریوں میں تفسیر کی کتابوں کا سیکشن دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے اور اس کے معانی واحکام کی دریافت میں کتنا عظیم علمی سرمایہ فراہم ہے، قرآن کریم کی تفسیر میں لاکھوں ذہین ترین انسانوں کی دماغی اور علمی صلاحیتیں صرف ہوئیں، لیکن اس وسیع تر علمی لٹریچر میں کہیں کوئی بات ایسی نہیں ملے گی جو اس نقطۂ نظر کی تائید کرے کہ سورہ نساء کی آیت ۳۴، ۳۵ میں مذکور امور طلاق واقع ہونے کے لئے شرط ہیں۔

اسلامی قانون دنیا کا مکمل ترین قانون ہے، فقہ اسلامی کا عظیم الشان لٹریچر اسلامی قانون کی وسعت اور عظمت کی گواہی دیتا ہے، اگر ہم صرف قانون طلاق پر لکھی ہوئی تحریروں کو جمع کریں تو بلا مبالغہ ایک لاکھ صفحات سے کم میں انہیں اکھٹا نہیں کر سکتی ہیں، طلاق کی حقیقت، قسمیں، احکام اور شرطوں پر بہت تفصیل اور دلائل کے ساتھ فقہاء نے گفتگو کی ہے، وقوع طلاق کی شرطیں، طلاق کا ایک اہم ترین موضوع ہے لیکن فقہ اسلامی کے پورے لٹریچر میں کوئی ایک حوالہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا کہ کسی نے طلاق واقع ہونے کے لئے ان چیزوں کو شرط قرار دیا ہو جنہیں جسٹس بحر الاسلام اور شمیم آرا کیس کا فیصلہ کرنے والے ججز صاحبان سورہ نساء کی آیت ۳۴، ۳۵ کے حوالہ سے شرط قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں، اس طرح کے بے سر و پیر کے فیصلے نہ صرف قرآن کریم اور اسلامی

قانون کی توہین کے مرادف ہیں بلکہ ایسے بے بنیاد فیصلوں سے ہماری عدالتوں اور ججوں کا قد بہت چھوٹا ہو جاتا ہے، اور قانون کی دنیا میں ان کی حیثیت بری طرح گر جاتی ہے، اس لئے ہمارے فاضل ججز کی ذمہ داری ہے کہ ملک کے وقار اور اپنی عزت کو بچانے کیلئے ایسے بودے اور بے بنیاد فیصلوں سے گریز کریں، اور قرآن کریم، احادیث نبویہ نیز اسلامی قانون کو سمجھنے کے لئے مستند کتابوں اور معتبر اہل علم کی طرف رجوع کریں۔

☆☆☆☆

حضانت: شرعی قوانین کے تناظر میں

مولانا مفتی محمد ظفر عالم ندوی
(استاذ حدیث وفقہ دار العلوم ندوۃ العلماء)

شریعت اسلامی نے خاندانی نظام اور حقوق میں خاندان کے دیگر افراد کی طرح بچوں وبچیوں کے حقوق اور پرورش کے قوانین بھی بیان کئے ہیں، اور اس سلسلہ میں جن باریکیوں اور نفسیات کا خیال رکھا ہے وہ دیگر قوانین کے درمیان ایک امتیاز رکھتا ہے۔ ذیل میں ہم تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنوء کے تحت منعقد ہونے والی فیملی لا سریز کی مجلس میں بچوں وبچیوں کی پرورش سے متعلق حقوق یعنی قانون حضانت پر مختصر گفتگو پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں گے، خدا کرے یہ سعی مفید اور لائق توجہ ہو۔

تعریف

حضانت کے لغوی معنی تربیت کے ہیں، شرعی اصطلاح میں ماں یا کسی شرعی مستحق کے چھوٹے بچے کی پرورش کرنے کو حضات کہتے ہیں۔

حضانت کا حکم

حضانت واجب ہے اس لئے کہ بچہ کی پرورش صحیح طور پر نہ کی جائے تو بچہ کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ (ردالمحتار جلد۲/۸۷۱تا۸۸۰)

استحقاق پرورش

اس سلسلہ میں امت مسلمہ کا اجماع ہے کہ پرورش کی مستحق سب سے پہلے اسکی ماں

ہے، دوسرے رشتہ داروں کا درجہ اسکے بعد ہے، البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ اس لڑکے یا لڑکی کی پرورش کا حق ماں کو کتنی عمر تک رہتا ہے؟

حنفیہ کا مسلک

امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک جب لڑکا خود کھانے پینے، لباس پہننے اور استنجاء کرنے لگے تو اسکی پرورش کا حق ماں سے باپ کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، لڑکے کی اس حالت کو پہونچنے کی عمر کا اندازہ امام خصاف علیہ الرحمہ نے سات آٹھ سال بیان کیا ہے، البتہ ماں کو لڑکی کی پرورش کا حق اس کے بالغ ہونے تک ہے، یہی قول امام ابو یوسف کا ہے، امام محمد کے نزدیک جب لڑکی میں نفسانی خواہش ظاہر ہو تو اس وقت تک ماں کو پرورش کا حق حاصل ہے، متاخرین احناف نے امام محمد کے قول کو پسند کیا ہے۔ (بدائع الصنائع جلد۴/۴۲، فتح القدیر: جلد۴ص۳۱۶)

ائمہ ثلاثہ کا نقطۂ نظر

امام مالک کے نزدیک ماں کو لڑکے کی پرورش کا حق اس وقت تک ہے جب تک کہ وہ لڑکا واضح طور پر بات چیت نہ کرسکے۔ اور لڑکی کا شادی ہونے تک۔ امام شافعی کے اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک لڑکے اور لڑکی کی پرورش کا حق دونوں کی سات سال کی عمر ہونے تک حاصل ہے، اسکے بعد بچے کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ ماں اور باپ میں جس کو پسند کرے اس کے سپرد کردیا جائے (المغنی لابن قدامہ جلد۷ص۶۱۴ تا ۶۱۶)

قرآن میں ظاہر نص نہیں

ماں کے حق حضانت کے بارے میں قرآن کریم میں کوئی آیت ظاہر نص کے طور پر نہیں ہے، البتہ اقتضاء نص کے طور پر فقہاء آیت رضاعت "والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن أراد أن یتم الرضاعة" سے ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے مائیں اپنی اولاد کو پورے دوسال تک دودھ پلائیں، یہ حکم اس شخص کے لئے ہے، جو رضاعت مکمل کرنا چاہتا ہے، اس آیت سے بطور اقتضاء یہ ثابت ہوتا ہے، کہ صغرسنی میں بچہ کی پرورش کا حق اولاً ماں کو حاصل ہے۔ اس آیت کے علاوہ کئی احادیث نبوی ہیں جن سے فقہاء نے ماں کے حق حضانت پر استدلال کیا ہے۔

احادیث نبوی

یہاں بغرض اختیار صرف دو حدیثیں نقل کرتا ہوں، بیہقی کی ایک روایت میں ہے کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ یہ میرا بیٹا ہے جس کے لئے میرا پیٹ ظرف تھا، میری چھاتی مشکیزہ تھی اور میری گود اس کے لئے پناہ گاہ تھی، اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے اور چاہتا ہے کہ اسے مجھ سے لے لے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو اپنے بچہ کی زیادہ مستحق ہے جب تک کہ تو دوسرا نکاح نہ کرنے۔ (السنن الکبری للبیہقی جلد۸-۴۰۵)

ابومیمونہؓ سے روایت ہے کہ ہم ابوہریرہ کے پاس تھے کہ حضرت ابوہریرہ نے کہا کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کیا کہ میرے باپ اور ماں آپ پر قربان ہوں، میرا شوہر چاہتا ہے کہ میرے بیٹے کو لے جائے اور وہ مجھے نفع دیتا ہے اور ابوعیینہ کے کنویں سے پانی پلاتا ہے۔ پس اس کا شوہر آیا اور کہا کون جھگڑتا ہے مجھ سے میرے بیٹے کے بارے میں؟ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لڑکے! یہ تیرا باپ ہے اور یہ تیری ماں ہے تو جس کا ہاتھ چاہے تھام لے، لڑکے نے ماں کا ہاتھ تھام لیا اور وہ عورت اس لڑکے کو لیکر چلی گئی" (السنن الکبری للبیہقی، جلد۸ص۳، نسائی جلد۲ص۹۳)

حق حضانت میں ماں کو فوقیت دینے کی وجہ بیان کرتے ہوئے فقہاء نے احادیث نبوی میں بیان کردہ انسانی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ صراحت کی ہے کہ بچے کی پرورش میں ماں کو تقدم حاصل ہے، امام شافعی بیان فرماتے ہیں:

فلما كان لا يعقل كانت الأم أولى به على إن ذلك حق للولد لا للابوين لان الام احنى عليه وارق من الاب (كتاب الأم ۸/۲۳۵ مطبوعه مصر)

(ترجمہ: جب بچہ ناسمجھ ہو تو ماں اسکی پرورش کی زیادہ حقدار ہے کیونکہ یہ حق بچے کا ہے نہ کہ والدین کا۔ ماں بچہ سے زیادہ محبت کرتی ہے اور بچہ پر باپ سے زیادہ مہربان ہوتی ہے۔ فقہاء احناف کی ترجمانی کرتے ہوئے مشہور فقیہ اور فقہ حنفی کے ترجمان علامہ برہان الدین المرغینانی صاحب ھدایہ اور علامہ کمال الدین ابن ہمام صاحب فتح القدیر نے اس سلسلہ کی روایات نقل کرنے کے بعد فرمایا:

ولأن الأم اشفق واقدر على الحضانة فكان الدفع اليهه انظر وإليه اشار الصديق بقوله، ريقها خير من شهد وعسل عندك يا عمر۔

یعنی اس لئے کہ ماں بچے کے حق میں بے انتہا شفیق ہوتی ہے اور نگرانی وحفاظت میں مرد کی نسبت زیادہ قدرت رکھتی ہے، اسی شفقت کی طرف حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے: ''اے عمر! بچے کی ماں کا لعاب دہن تمہارے شہد سے بھی زیادہ شیریں ہوگا۔ صاحب فتح القدیر تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں ماں باپ کی بہ نسبت اس لئے زیادہ شفیق ہوتی ہے کہ بچہ حقیقت میں ماں کے جسم کا ایک حصہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسا بھی وقت آتا ہے کہ بچے کو قینچی کے ذریعہ کاٹ کر ماں سے جدا کیا جاتا ہے اور عورت اسکی پرورش میں مشغول ہونے کی وجہ سے حضانت پر زیادہ قدرت رکھتی ہے، بر خلاف مرد کے کہ وہ مال حاصل کرنے پر زیادہ قدرت رکھتا ہے۔

ماں میں بہ نسبت دوسرے افراد کے بچوں کے بارے میں زیادہ شفقت اور محبت ہوتی ہے۔ بخاری اور مسلم کی حسب ذیل حدیثوں سے اندازہ ہوتا ہے

عن عائشةؓ قالت جاء أعرابى الى النبى ﷺ فقال :أتقبّلون الصبيان فما نقبّلهم.

''حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک دیہاتی عرب حاضر ہو کر کہنے لگا آپ لوگ بچوں کو بوسہ دیتے ہیں ہم تو ایسا نہیں کرتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ نے ترے دل سے رحم کو نکال دیا ہے تو اس میں میں کیا کر سکتا ہوں؟ ایک دوسری حدیث ہے:

وعنها قالت جائتنى إمرأة ومعها ابنتان لها تسألنى فلم اجد عندى غير تمرة واحدة الخ۔(بخارى ومسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ مرے پاس ایک سائلہ آئی جس نے مجھ سے سوال کیا۔ اس وقت میرے پاس سوائے ایک چھوارے کے اور کچھ موجود نہ تھا، میں نے وہ چھوارہ اس عورت کو دے دیا، اس نے اسکے دو حصے کر کے اپنی دونوں بچیوں کو دیدیا اور خود نہ کھایا۔

مذکورہ بالا دونوں روایتوں سے ماں اور باپ کی شفقت ومحبت کا اندازہ کرنا اور اُس سے پرورش کے حق میں ماں کا مقدم ہونا واضح ہو جاتا الا یہ کہ ایسے عوارض پیش آجائیں جن کی بنا پر بچے کے حق میں ماں کی شفقت ومحبت کے معدوم ہو جانے کا ظن غالب پیدا ہو جائے۔ جیسے کہ آنحضرت ﷺ نے اس طرف اشارہ فرمایا ''انت احق به مالم تنكحى''، تو اس وقت تک بچہ کی زیادہ مستحق ہے جس وقت تک دوسرا نکاح نہ کرلے۔ اسی طرح فقہاء نے ماں کے فاسقہ یا غیر مامونہ ہونے کی صورت میں بھی حضانت کو ساقط تصور کیا ہے۔ (تفصیل آگے آئے گی انشاء اللہ

نتیجہ فکر

تمام احادیث وآثار سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ حق پرورش میں بچہ کی بہبودی اور حفاظت کا لحاظ رکھا جائے گا اور حالات کے تقاضے کو نظر انداز نہ کیا جائے گا۔ اور جہاں تک ممکن ہو ماں کو تقدم حاصل ہوگا اگر کوئی مانع موجود نہ ہو اور بعض مواقع میں ایسے بھی حالات ہو سکتے ہیں کہ بچہ کو ماں اور باپ کے درمیان اختیار دینا مناسب ہوگا۔ ایسے بھی حالات پیدا ہو سکتے ہیں کہ ماں اور باپ کے ہوتے ہوئے ماں کے سلسلہ کے دوسرے رشتہ دار ونانی یا

ماموں کے زیر پرورش دینا بہتر ہوگا۔ان کے علاوہ بھی حالات پیش آسکتے ہیں، جن کے پیش نظر قاضی شرعی حالات کا جائزہ لیکر بچے کے بہبود اور حفاظت کی خاطر عصبات یا ذوی الارحام رشتہ داروں کو پرورش میں بچے کو دے سکتا ہے (بدائع الصنائع جلد۴/ص۴۴۳)

ماں کے بعد رشتہ دار عورتوں کا حق: ماں کے نہ ہونے یا اپنے حق سے دستبردار ہو جانے یا شرعاً غیر مستحق قرار دیئے جانے کی صورت میں سات سال سے کم عمر لڑکوں اور نابالغ لڑکیوں کی حضانت کا حق درج ذیل عورتوں کو ہوگا۔

نانی (اس میں پڑنانی بھی شامل ہے)، دادی (اس میں پڑدادی بھی شامل ہے) حقیقی بہن، اخیافی بہن، علاتی بہن، حقیقی بہن کی بیٹی، اخیافی بہن کی بیٹی، علاتی بہن کی بیٹی، خالہ (حقیقی، اخیافی، علاتی) اور پھوپھی (حقیقی، اخیافی، علاتی)

مردوں کا حق حضانت

حضانت کی مستحق عورتوں میں سے کوئی نہ ہو یا اس کے لئے آمادہ نہ ہو یا کسی شرعی سبب سے اس کا حق ساقط ہوگیا ہو تو مردوں کو بہ ترتیب عصوبت حضانت کا حق ہوگا۔یعنی جو عصبی رشتہ دار وراثت میں مقدم ہے وہ حضانت میں بھی مقدم ہوگا جیسے پہلے باپ پھر دادا (خواہ کتنا ہی اوپر درجہ کا ہو) پھر حقیقی بھائی اور ان کی اولاد پھر چچا اور ان کی اولاد۔لیکن لڑکی کسی غیر محرم مرد کو پرورش کے لئے نہیں دی جاسکتی ہے جیسے چچازاد بھائی، اسی طرح اس کا بھی لحاظ کرنا ہوگا وہ دیانت دار اور امانت دار ہو، فاسق یا خائن ہونے کی صورت میں اسکو حق حضانت نہیں ہوگا۔اسی طرح عصبات کے لئے مسلمان ہونا بھی شرط ہے۔(بدائع الصنائع/ جلد۳/ص۴۳، فتح القدیر جلد۳/۳۱۶)

حق حضانت کے شرائط

۱۔حق حضانت انہیں کو حاصل ہوگا جو عاقل بالغ ہوں اور بچے کی جسمانی و اخلاقی تربیت کی صلاحیت رکھتے ہوں اور قابل اعتماد ہوں کہ ان میں کوئی ایسا امر مانع موجود نہ ہو

جو انہیں بچے کی حضانت کے نا قابل بنادے۔علاوہ ازیں وہ فاسق بھی نہ ہوں۔-

۲-عورت کے مستحق حضانت ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کی منکوحہ نہ ہو جو اس بچہ کے لئے غیر ذی رحم محرم ہو، اس لئے اگر وہ عورت مستحق حضانت بچہ کے چچا یا بھتیجے سے نکاح کرے تو حق حضانت ساقط نہیں ہوگا

۳- باپ کے افلاس کی شکل میں مذکورہ بالا ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے مستحقین حضانت میں اس کا حق مقدم ہوگا جو بلا معاوضہ اس فریضہ کو انجام دے سکے (الدر المختار مع ردالمحتار باب الحضانۃ جلد۲-ص۸۷۱تا۸۷۴)

۴۔بچہ کے حق میں عورتوں کے مستحق حضانت ہونے کے لئے بھی ان کا ذی رحم محرم ہونا شرط ہے۔(الدر المختار مع ردالمحتار، باب الحضانۃ جلد۲-ص۸۷۹)

۵۔اگر بچہ کی ماں جو مطلقہ ہے، کسی ایسے دور دراز علاقہ کو چلی جائے جہاں باپ کے لئے وقتاً فوقتاً بچہ سے ملنا دشوار ہو تو اس کا حق حضانت ساقط ہوجائے گا۔(الدر المختار علی ہامش ردالمحتار، باب الحضانۃ جلد۲/ص۸۸۴)

۶۔پرورش کرنے والی عورت اگر ٹی بی، جنون، جذام، برص جیسے امراض میں مبتلا ہو تو حق حضانت ساقط ہوجائے گا۔(ردالمحتار، اوائل باب الحضانۃ: جلد۲ص۸۷۱)

۷۔پرورش کرنے والی عورت فاسقہ بدکار اور فاحشہ ہو جس کی پرورش میں رہ کر بچہ کی صحیح تربیت نہیں ہوسکتی ہو تو اس کا بھی حق حضانت ساقط ہوجائے گا۔

۸۔پرورش کرنے والی عورت اگر کسی ایسے شخص سے شادی کرے جو بچہ کا ذی رحم محرم نہ ہو تو بھی حق حضانت ساقط ہوجائے گا۔

۹۔اگر کسی مانع کے پیش آجانے سے حق حضانت ساقط ہوجائے اور وہ مانع دور ہو جائے تو پھر حق حضانت لوٹ آئے گا۔(حوالہ سابق: جلد ص۸۷۱تا۸۷۳و۸۸۱،۸۸۲)

۱۰۔اگر زوجین کے مابین خلع ہوجائے اور خلع میں یہ شرط لگادی جائے کہ ماں کو حق پرورش نہیں ہوگا تو بچہ کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ شرط باطل تسلیم کی جائے گی اور ماں کو

حق حضانت حاصل رہے گا۔(الدرالمختارعلی ھامش ردالمحتار باب الحضانۃ: جلد۲ص۸۷۵)

اجرت حضانت

۱۔اگر بچہ کے پاس مال ہوتو اس کی پرورش کی اجرت اس کے مال سے ادا کی جائے گی ورنہ جن پر اس بچہ کا نفقہ واجب ہے اس پر یہ اجرت بھی واجب ہوگی۔(الدرالمختارعلی ھامش ردالمحتار، باب الحضانۃ: جلد۲،ص۸۷۷)

۲۔وہ مطلقہ عورت جو عدت کے گزرنے کے بعد اپنے بچہ کو دودھ بھی پلا رہی ہو اور پرورش بھی کر رہی ہو ایسے بچہ کے باپ سے اجرت رضاعت اور اجرت حضانت بھی ملے گی اور مدت رضاعت گزر جانے کے بعد صرف اجرت حضانت کی مستحق ہوگی) حوالہ سابق: جلد۲ص۸۷۶/۸۷۷)

۳۔اگر بچہ اور اس کا باپ دونوں مفلس ہوں اور کوئی دوسرا معاوضہ کے بغیر پرورش کے لئے تیار نہ ہو تو بچہ کی ماں کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس کی پرورش اپنے ذمہ لے اور حضانت کی اجرت باپ پر قرض رہے گی، جو باپ کو استطاعت ہونے پر ادا کرنا ہوگا، اور اگر بچہ کا باپ خوشحال ہے یا بچہ کے پاس خود مال ہے تو عندالطلب بچہ کی ماں کو حضانت کا معاوضہ ملے گا بشرطیکہ ماں بچہ کے باپ کی زوجیت یا عدت میں نہ ہو، اور زوجیت یا عدت میں رہتے ہوئے ماں کو بچہ کی پرورش بلا معاوضہ کرنا ہوگی۔

۴۔ماں کے علاوہ اگر کوئی عورت ذی رحم محرم بلا اجرت پرورش کے لئے آمادہ ہو اور بچہ کے پاس مال نہ ہو اور اس کے والد مالدار ہوں تو اس صورت میں ماں ہی کو حضانت کے لئے ترجیح دی جائے گی، خواہ اجرت ہی دینی پڑے۔

۵۔اگر باپ و بچہ دونوں غیر مستطیع ہیں، اور ماں بلا اجرت حضانت کے لئے تیار نہ ہو تو جو ذی رحم محرم خاتون بلا اجرت حضانت کے لئے آمادہ ہو بچہ اس کے حوالہ کر دیا جائے گا (ردالمحتار، باب الحضانۃ: جلد۲ص۸۷۸)

۶۔بچہ اگر مالدار ہو تو بچہ اور اس کی پرورش کرنے والی کی رہائش کے اخراجات بچہ کے مال سے ادا کئے جائیں گے، اور اگر بچہ مالدار نہ ہو تو اخراجات کی ادائیگی کی ذمہ داری اس پر ہوگی جس کے ذمہ بچہ کا نفقہ ہے۔(حوالہ سابق)

۷۔باپ و ماں دونوں کو دوران حضانت جب چاہیں بچہ کو دیکھنے کا حق ہوگا۔

۸۔حاضنہ (پرورش کرنے والی کی پرورش میں بچہ سات سال تک رہے گا، اور بچی اگر ماں، دادی یا نانی کی پرورش میں ہے تو بالغ ہونے تک ورنہ نو سال تک پرورش میں رہے گی، اس کے بعد ولی عصبہ محرم اقرب کو مجبور کیا جائے گا کہ اپنے پاس رکھے اور تربیت کرے۔(الدرالمختارمع ردالمحتار ج۲ص۸۸۱)

☆☆☆☆

والدین، اولاد، قریبی رشتہ دار اور بیوی کا نفقہ

منور سلطان ندوی
(رفیق علمی مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ)

نفقہ کا لغوی معنی

نفقہ کا لغوی معنی ہے: الاخراج یعنی نکالنا، انسان جو اپنے اہل وعیال پر خرچ کرے، اسے نفقہ کہا جاتا ہے۔

شریعت میں نفقہ کا مطلب ہے روزمرہ کے اخراجات، جس میں کھانا، کپڑا اور رہائش شامل ہیں۔

نفقہ کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں، اول: جو انسان خود اپنی ذات پر خرچ کرے، اگر وہ اس پر قادر ہو، دوم: وہ نفقہ جو ایک انسان پر دوسرے انسان کے لئے واجب ہوتا ہے۔ دوسرے انسان پر واجب ہونے والے نفقہ کے تین اسباب ہیں: زوجیت، قرابت، ملک۔ زوجیت میں شوہر و بیوی، قرابت میں والدین اور دیگر رشتہ دار اور ملک میں غلام اور باندی شمار ہوتے ہیں۔

حضرت جابر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان كان أحدكم فقيرا فليبدأ بنفسه فان فضل فعلى عياله فان فضل فعلى قرابته۔(صحيح مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک

صحابی حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ میرے پاس ایک دینار ہے، میں اسے کہاں خرچ کروں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی ذات پر خرچ کرو، صحابی نے کہا میرے پاس دوسرا دینار ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنی اولاد پر خرچ کرو، صحابی نے دریافت کیا اگر میرے پاس تیسرا دینار بھی ہو؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی بیوی پر خرچ کرو، صحابی نے دریافت کیا اگر میرے پاس چوتھا دینار بھی ہو؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے خادم پر خرچ کرو، صحابی نے پھر دریافت کیا کہ اگر میرے پاس پانچواں درہم بھی ہو؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: انت ابصر۔ تم خود سمجھدار ہو۔ (سنن ابوداؤد، مسند احمد)

ماں باپ کا نفقہ

ماں باپ کا نفقہ اولاد پر واجب ہے، جمہور فقہاء کی یہی رائے ہے۔

دلائل اس طرح ہیں:

۱۔وقضى ربك الا تعبدوا الا اياه وبالولدين احسانا(سوره اسراء:۲۳)

اور آپ کے پروردگار نے فیصلہ فرمادیا کہ تم لوگ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، ماں باپ کے ساتھ بہتر سلوک کرو۔

احسان کا تقاضہ یہ ہے کہ والدین اگر ضرورت مند ہوں تو ان پر خرچ کیا جائے۔

۲۔وصاحبهما فى الدنيا معروفا(سوره لقمان)

یہ آیت کافر والدین کے بارے میں نازل ہوئی، اسی بنیاد پر فقہاء کی رائے ہے کہ والدین مسلمان نہ ہوں تب بھی ان کا نفقہ اولاد پر واجب ہوگا۔

معروف یہ نہیں ہوگا کہ انسان خود تو اچھا کھائے، اور والدین کو بھوکا چھوڑ دے۔

۳۔ووصينا الانسان بوالديه حسنا۔(سوره عنكبوت:۸)

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید کی۔

٤۔ووصينا الانسان بوالديه حملته امه وهنا على وهن وفصله فى عامين

ان اشکرلی ولوالدیك الی المصیر۔(سورہ لقمان:١٤)

ترجمہ:اورہم نے انسان کواس کے ماں باپ کے بارے میں بڑی تاکید کی،اس لئے کہ اس کی ماں بے حد کمزوری سے دوچار ہوکراس کو اپنے پیٹ میں اٹھائے رکھتی ہے اور دوسال میں اس کا دودھ چھڑانا ہے، کہ میرا اور اپنے والدین کا شکرادا کرتے رہو، آخر میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔

شکر کا مطلب ہے کہ والدین کے ساتھ بہترین سلوک کیا جائے،اوران کے احسانات کو چکانے کی کوشش کی جائے۔

۵۔عن عائشة قالت قال رسول الله ﷺ:ان اطیب ماا کلتم من کسبکم وان اولادکم من کسبکم ۔(سنن الترمذی،ابواب الاحکام،حدیث نمبر:١٣٥٨)

بعض روایات میں''فکلوہ ھنیئامریئا'' کا اضافہ بھی ہے۔

۶۔حضرت عمروبن شعیب روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

ان لی مالاوولدا وان والدي یحتاج مالی قال رسول الله ﷺ:انت ومالك لوالداك، ان اولادکم من اطیب کسبکم فکلوا من کسب اولادکم۔(سنن ابی دائود،حدیث نمبر:٣٥٣٠)

٨۔رسول اللہﷺ سے ایک صحابی نے پوچھا:

من ابر ؟قال امك،ثم امك ،ثم امك ،ثم اباك ،ثم الاقرب فالاقرب۔(سنن ابی دائود،کتاب الادب،حدیث نمبر:٥١٣٩)

جمہورفقہاء کے نزدیک ماں،باپ کی طرح دادا،دادی،اوراس کے اوپر کے افراد کا نفقہ بھی واجب ہوتا ہے،امام مالک کے نزدیک دادادادی کا نفقہ واجب نہیں ہوگا۔

مشہورحنبلی عالم علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

ویجب الانفاق علی الاجداد والجدات وان علوا وولد الولد وان سفلوا وبذلك قال الشافعی والثوری واصحاب الرای ،وقال مالك :لا تجب النفقة علیهم ولا لهم ۔(المغنی،ج١١،ص:٣٧٤)

اصول کا نفقہ کب واجب ہوگا؟

اولاد پروالدین کا نفقہ اس وقت واجب ہوگا جب درج ذیل شرائط پائی جائیں:

١۔والدین غریب ہوں،ان کے پاس مال نہ ہو

٢۔وہ کمانے پر قادر نہ ہوں،اس شرط کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے،امام ابوحنیفہ اورامام شافعی کے نزدیک والدین کمانے پر قادر ہوں،تب بھی اگران کے پاس مال نہیں ہے تواولاد پران کا نفقہ واجب ہے،جبکہ امام مالک اورامام شافعی کے نزدیک والدین اگر کمانے پر قادر ہیں تو ایسے والدین کا نفقہ اولاد پرواجب نہیں ہوگا۔امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے،اوراف تک نہ کہنے کا بھی حکم ہے، اولاد مالدار ہوں اور والدین غریب ہوں تو انہیں کمانے پر مجبور کرنا حسن سلوک کے منافی ہیں۔(بدائع الصنائع ،ج۴،ص:۳۵)

٣۔اولاد کے پاس مال ہو،یاوہ کمانے پر قادر ہو،جمہورعلماء کی یہی رائے ہے، صرف امام مالک کے نزدیک تنگدست بیٹے کواپنے والدین پرخرچ کرنے کے لئے کمانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

۴۔اولاداور والدین کا ایک دین پرہونا ضروری نہیں ہے،والدین غیر مسلم ہوں تب بھی ان کا نفقہ اولاد پرواجب ہوگا۔

ووصینا الانسان بوالدیه حسناوان جاهداك لتشرك بی مالیس لك به علم فلا تطعهما۔(سورہ عنکبوت:٨)

اورہم نے انسان کواپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید کی،اور

ہاں اگر وہ تم پر زور دیں کہ تم میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھراؤ جس کی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس سلسلہ میں ان کی بات نہ ماننا۔

اور سورہ لقمان میں ہے:

وان جاهداك على ان تشرك بى ماليس لك به علم فلا تطعهما وصاحبهمافى الدينامعروفا۔(سوره لقمان:١٥)

اور اگر وہ تم پر زور ڈالیں کہ تم میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو تم ان کا کہنا نہیں مانو اور بہتر طور پر دنیا میں ان کے ساتھ رہو۔

والدین کا نفقہ کس پر واجب ہوگا؟

والدین کا نفقہ اولاد پر واجب ہوگا، اس لئے کہ وہی والدین کے سب سے قریبی ہوتے ہیں، امام ابوحنیفہ کے نزدیک اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں، جمہور فقہاء کے نزدیک بیٹا نہ ہو تو پوتا پر نفقہ واجب ہوگا، جبکہ امام مالک کے نزدیک پوتا پر نفقہ واجب نہیں ہوگا۔

اگر اولاد ایک ہے تو اسی پر پورا نفقہ واجب ہوگا، اور اگر کئی اولاد ہیں مثلاً بیٹا، بیٹی، یا دو بیٹے تو ایک درجہ کی اولاد میں ہر ایک پر برابر برابر نفقہ واجب ہوگا۔

والدین کا نفقہ کتنا واجب ہے؟

والدین کے لئے اتنا نفقہ دینا ضروری ہے جو ان کے لئے کافی ہو، یعنی جس سے ان کی ضرورت پوری ہو جائے۔

ماں کے علاوہ باپ کی دوسری بیویوں کا نفقہ بھی اولاد پر واجب ہے، جمہور علماء کی یہی رائے ہے۔

اولاد کا نفقہ

اولاد کا نفقہ والد پر واجب ہوتا ہے، دلائل اس طرح ہیں:

١۔والوالدات يرضعن اولادهن حولين كاملين لمن اراد ان يتم الرضاعة وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف لا تكلف نفس الا وسعها لا تضار والدة بولدها ولا مولود له بولده۔(سوره بقره:٢٣٣)

مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، یہ حکم اس کے لئے ہے جو دودھ کی مدت پوری کرنا چاہے، اور اس مدت میں دودھ پیتے بچہ کے باپ پر ان عورتوں کا مروجہ طریقہ کے مطابق کھانا اور کپڑا واجب ہے۔

٢۔رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان کی بیوی ہند کے سوال کے جواب میں فرمایا: خذى مايكفيك وولدك بالمعروف۔(صحيح البخارى،حديث نمبر:٥٣٦٤)

جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ اولاد اور اولاد کی اولاد کا نفقہ بھی واجب ہوتا ہے، یعنی اگر والد نہیں ہے یا ان کے پاس مال نہیں ہے اور دادا موجود ہے تو دادا پر پوتے کا نفقہ واجب ہوگا، اور اسی طرح نیچے کی اولاد کا حکم ہے۔ صرف امام مالک کے نزدیک صرف اولاد کا نفقہ واجب ہوگا، اولاد کی اولاد کا نہیں۔(المغنی، ج١١،ص:٣٧٤)

اولاد کا نفقہ ماں پر واجب نہیں ہوتا ہے، کیونکہ قرآن میں باپ کو خاص کیا گیا ہے۔

اولاد کا نفقہ کب واجب ہوتا ہے؟

درج ذیل شرائط پائے جانے پر والد یا دادا پر اولاد کا نفقہ واجب ہوگا:

١۔اولاد کے پاس مال نہ ہو، اور وہ کمانے پر بھی قادر نہ ہوں۔ لہٰذا اگر ان کے پاس مال ہے تو وہ اپنا مال اپنی ذات پر خرچ کریں گے، اسی طرح اگر وہ کمانے پر قادر ہیں تو ایسی صورت میں کما کر اپنی ضروت پوری کریں گے، والد یا دادا پر ان کے نفقہ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

٢۔والد یا دادا اولاد کا نفقہ ادا کرنے پر قادر ہوں، مالداری کی وجہ سے یا کمانے پر

قادر ہونے کی وجہ سے۔

حضرت جابر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان کان احدکم فقیرا فلیبدأ بنفسه فان فضل فعلی عیاله فان فضل فعلی قرابته۔ (صحیح مسلم)

اولاد کا نفقہ واجب ہونے کے لئے باپ کا مالدار ہونا ضروری نہیں ہے، اگر وہ تنگدست ہو، تب بھی اولاد کا نفقہ اس پر واجب ہوگا، جمہور علماء کی یہی رائے ہے، صرف امام مالک کے نزدیک اولاد کے نفقہ کے لئے باپ کو کمانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ (بدائع الصنائع، ج۴، ص:۳۵، جالفقہ الاسلامی وادلتہ، ج۱۰، ص:۷۳۵۳)

کمانے پر قدرت نہ ہونے کے اسباب

۱۔کم سنی یعنی ایسا بچہ جو کمانے کی عمر کو نہیں پہونچا ہے، بچہ اگر کمانے کی عمر کو پہونچ گیا ہے تو والد انہیں کسی مزدوری حاصل کرنے پر لگا سکتے ہیں، بچی اس سے مستثنی ہے، یعنی بچی اگر کمانے کی عمر تک پہونچ گئی ہے تب بھی اس کا نفقہ والد یا دادا پر واجب ہوگا، کیونکہ بچی کو کمانے پر لگانے کی صورت میں دوسرے مسائل کا سامنا کرنا ہوگا، البتہ اس بچی کو کسی عورت کے پاس بھیج کر کوئی صنعت وحرفت سکھائی جاسکتی ہے۔ ایسا کرنا والد یا دادا کے لئے جائز ہوگا۔

بالغ لڑکوں کا نفقہ والد یا دادا پر واجب نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہ کسی معذوری مثلاً ذہنی بیماری، جسمانی بیماری کی وجہ سے کمانے پر قادر نہ ہوں، طلب علم کو بھی اسی زمرہ میں رکھا گیا ہے، یعنی بالغ لڑکا اگر تعلیم کے حصول میں مصروف ہے تو اس کا نفقہ والد یا دادا پر واجب ہوگا، اسی طرح اگر بے روزگاری عام ہے، اور ذریعہ معاش اختیار کرنے کے مواقع نہیں ہیں، یا روزگار نہیں مل پا رہا ہے، ان صورتوں میں اگر والد اور دادا کے پاس مال ہے تو ان کے لئے اولاد پر خرچ کرنا ضروری ہوگا۔

جمہور فقہاء کی یہی رائے ہے کہ بالغ لڑکا اگر معذور نہیں ہے تو اس کا نفقہ والد پر

واجب نہیں ہوگا، صرف امام احمد بن حنبل اس بات کے قائل ہیں اگر بالغ لڑکا تندرست ہے، مگر اس کے پاس مال نہیں ہے تو اس صورت میں بھی اس کا نفقہ والد پر واجب ہوگا۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج۱۰، ص:۷۴۱۳)

۲۔انوثت: بچی بالغ ہوجائے تب بھی اس کے نکاح ہونے تک اس کا نفقہ والد یا دادا پر واجب ہوگا، نکاح ہونے کے بعد اس کا نفقہ اس کے شوہر پر واجب ہوگا، اگر کسی وجہ سے علاحدگی ہوگئی تو ایسی صورت میں پھر اس کا نفقہ والد یا دادا پر واجب ہوگا، والد یا داد کے لئے ایسی لڑکی کو کمانے پر مجبور کرنے کا اختیار نہیں ہے، اگر وہ اپنی خوشی سے کوئی مناسب صنعت سیکھ لیتی ہے اور کمانے لگتی ہے ایسی صورت میں اس کا نفقہ والد یا دادا سے ساقط ہوجائے گا، اگر وہ اپنی ضرورت کے بقدر نہیں کما پاتی ہے تو ایسی صورت میں بھی والد پر نفقہ واجب ہوگا۔

۳۔مرض: ایسا مرض جو کمانے سے مانع ہو، مثلاً ذہنی امراض، جسمانی امراض، لہذا اگر بچہ بالغ ہے مگر وہ مرض کی وجہ سے کمانے پر قادر نہیں ہے، تو ایسے بالغ بچہ کا نفقہ بھی والد یا دادا پر واجب ہوگا۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

وأما قرابة الولاد فينظر ان كان المنفق هو الاب فلا يشترط يساره لوجوب النفقة عليه بل قدرته على الكسب كافية حتى تجب عليه النفقة على اولاده الصغار والكبار الذكور الزمنى انقراء والاناث الفقيرات وان كن صحيحات وان كان معسرا بعدأن كان قادرا على الكسب لان الانفاق عليهم عند حاجتهم وعجزهم عن الكسب احيائهم واحياء هم احياء نفسه لقيام الجزئية والعصبية واحياء نفسه واجب ۔(بدائع الصنائع ،ج٤،ص:٣٥)

۴۔حصول تعلیم: بالغ لڑکے اگر تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہیں تو ان کا نفقہ ان کے والد پر واجب ہوگا، خواہ وہ کمانے پر قادر ہی کیوں نہ ہوں، کیونکہ تعلیم کا حصول فرض کفایہ

ہے،اگر بچوں کو کمانے میں مشغول کیا جائے تو امت کے مصالح کا وجود نہیں ہو پائے گا،تعلیم میں مصروف رہنے کی صورت میں یہ شرط بھی ہے کہ وہ پڑھنے میں کامیاب بھی ہو،اگر وہ کند ذہن ہے تو اس کے لئے کوئی صنعت وحرفت سیکھنا زیادہ بہتر ہے۔(الفقہ الاسلامی وادلتہ،ج۱۰،ص:۷۴۱۴)

اولاد کا نفقہ کس پر واجب ہوتا ہے؟

جمہور فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر والد موجود ہیں،ان کے پاس مال ہے یا وہ کمانے پر قادر ہیں تو اولاد کا نفقہ انہی پر واجب ہوگا،اولاد پر خرچ کرنے کی ذمہ داری تنہا والد پر ہے،اس میں کوئی شریک نہیں ہوگا:وعلی المولود له زرقهن و کسوتهن

اگر والد موجود نہیں ہیں یا ان کے پاس مال نہیں ہے اور وہ کسی وجہ سے کمانے پر قادر بھی نہیں ہیں ایسی صورت میں ان کا نفقہ ان کے اصول پر واجب ہوگا،یعنی اگر دادا کے پاس مال ہے تو دادا پر،ورنہ اس کی ماں پر نفقہ واجب ہوگا،اور اگر دونوں موجود ہوں تو دونوں پر ،وراثت میں ان کے حصہ کے بقدر۔یعنی ماں پر ایک تہائی اور دادا پر دو تہائی نفقہ واجب ہوگا۔

اولاد کے لئے نفقہ کی مقدار

فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اولاد کے نفقہ سے مراد اتنا نفقہ ہوتا ہے جو اولاد کے لئے کافی ہو،کیونکہ یہ نفقہ ضرورت کی تکمیل کے لئے واجب ہوتا ہے،لہذا اولاد کی بنیادی ضرورت مثلا کھانا،کپڑا،رہائش،دودھ پینے والا ہے تو اس کے لئے دودھ نفقہ میں شامل ہوگا،نفقہ میں جس علاقہ میں بچہ موجود ہے وہاں کا لحاظ کیا جائے گا یعنی وہاں کے لحاظ سے اس کا کھانا اور دیگر چیزیں ہوں گی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:خذی مایکفیك وولدك بالمعروف۔

اگر بچہ کو کسی خادم کی ضرورت ہے تو اس کے لئے خادم فراہم کرنا بھی نفقہ میں شامل ہوگا۔

اسی طرح اگر بچہ کی بیوی بھی ہے تو اس بیوی کا نفقہ بھی والد کے ذمہ ہوگا،یہ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کی رائے ہے،امام ابوحنیفہ کے نزدیک لڑکے کی بیوی کا نفقہ

والد پر واجب نہیں ہے۔

۳۔والدین اور اولاد کے علاوہ قریبی رشتہ داروں کا نفقہ

والدین اور اولاد کے علاوہ قریبی رشتہ دار مثلا بھائی،چچا،ماموں،بھتیجا،پھوپھی، خالہ کا نفقہ بھی واجب ہوتا ہے۔دلائل اس طرح ہیں:

۱۔وآت ذاالقربی حقه(سوره اسراء:۲۶)

۲۔واعبدوا الله ولاتشرکوا به شیئا وبالوالدین احسانا وبذی القربی۔(سوره نساء:۳۶)

۳۔واولوا الارحام بعضهم اولی ببعض فی کتاب الله ۔(سوره انفال :۷۵)

٤۔یدالمعطی العلیا،وابدأ بمن تعول امك واباك واختك واخاك ثم ادناك ادناك۔(السنن الکبری للبیقهی،حدیث نمبر:۲۳۲۳)

قال رجل یارسول الله من ابر؟قال امك واباك واختك واخاك ومولاك الذی یلی ذلك حق واجب ورحم موصولة ۔(الادب المفرد،باب وجوب وصلة الرحم،سنن دائود،حدیث نمبر:٥١٤٠)

فقہ حنفی کے مطابق ذورحم محرم یعنی ایسے رشتہ دار جن سے نکاح کرنا حرام ہے،ان کا نفقہ واجب ہوگا،جیسے چچا،بھائی،بھتیجا،چچی،خالہ،خالو وغیرہ،البتہ ایسے رشتہ دار جو محرم نہیں ہیں یعنی جن سے نکاح کرنا جائز ہے،مثلا چچازاد بھائی ،ان کا نفقہ واجب نہیں ہوگا،اسی طرح جو محرم ہیں مگر رشتہ دار نہیں ہیں،مثلا رضاعی بھائی،ان کا نفقہ بھی واجب نہیں ہوگا۔

فقہ حنبلی میں ایسے رشتہ داروں کا نفقہ واجب ہوگا جو وارث بنتے ہیں۔فقہ مالکی اور فقہ شافعی میں والدین اور اولاد کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کا نفقہ واجب نہیں ہوتا ہے۔

قریبی رشتہ داروں کا نفقہ کب واجب ہوتا ہے؟

۱۔ذورحم محرم کے پاس مال نہ ہو،یعنی وہ فقیر ہو،اور کسی معذوری کی وجہ سے کمانے پر

قادر نہ ہو، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وعلى الوارث مثل ذلك۔(سورہ بقرة آیت نمبر ۳۳۳)

حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرات میں یہ آیت اس طرح ہے: وعلى الوارث ذى الرحم المحرم مثل ذلك۔

مذکورہ صفات کا پایا جانا ضروری ہے، اس کے بغیر ذورحم محرم کا نفقہ واجب نہیں ہوگا، یعنی اگر وہ کمانے پر قادر ہے تو اس کا نفقہ واجب نہیں ہوگا۔

۲۔ ذورحم محرم کا نفقہ جس پر واجب ہے ان کا اور ذوالرحم کا دین ایک ہو، اختلاف دین کے ساتھ یہ نفقہ واجب نہیں ہوتا، برخلاف والدین، اولاد اور شوہر و بیوی کے، کہ وہاں اختلاف دین کے ساتھ بھی نفقہ واجب ہوتا ہے۔

۳۔ جن پر نفقہ واجب ہے، ان کے پاس مال ہو، اگر ان کے پاس مال نہیں ہے تو ان پر نفقہ واجب نہیں ہوگا، گرچہ وہ کمانے پر قادر ہوں، یعنی انہیں ذورحم محرم کو نفقہ دینے کے لئے کمانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، کیونکہ ذورحم محرم کا نفقہ صلہ رحمی کی قسم کا ہوتا ہے، اور صلہ رحمی مالدار پر واجب ہے۔

ذورحم محرم کا نفقہ قضاء قاضی کے ذریعہ واجب ہوتا ہے یا آپسی رضامندی سے، یعنی اگر ذورحم محرم کو اس شخص کا مال مل جائے جس پر اس کا نفقہ واجب ہے تو وہ مال اس کے لئے حلال نہیں ہوگا، برخلاف والدین اور اولاد کے۔

۴۔ بیوی کا نفقہ

فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہے، خواہ بیوی مسلم ہوں یا غیر مسلم، بشرطیکہ وہ نکاح صحیح کے ذریعہ بیوی بنی ہو، دلائل اس طرح ہیں:

بیوی کا نفقہ واجب ہونے کے دلائل

اس بارے میں درج ذیل آیات ہیں:

۱۔ لينفق ذو سعة من سعته ومن قدر عليه زرقه فلينفق مما آتاه الله لا يكلف الله نفسا الا ما آتاها۔(سورہ طلاق:۷)

۲۔ وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف۔(سورہ بقرہ:۳۳۳)

۳۔ اسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم ۔(سورہ طلاق :٦)

٤۔ ولا تضاروهن لتضيقوا عليهن۔(سورہ طلاق:٦)

احادیث:

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا:

اتقوا الله فى النساء فانهن عوان عندكم اخذتموهن بامانة الله واستحللتم فروجهن بكلمة الله ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف۔(صحيح مسلم)

اسی خطبہ میں مزید فرمایا:

الا ان لكم على نساء كم حقا ولنساء كم عليكم حقا، فأما حقكم على نسائكم فلا يوطئن فرشكم من تكرهون ولا يأذن فى بيوتكم لمن تكرهون ألا وحقهن عليكم ان تحسنوا اليهن فى كسوتهن وطعامهن ۔(سنن الترمذى،باب ماجاء فى حق المراة على زوجها،حديث نمبر١١٦٣)

ایک صحابی رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا کہ بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

يطعمها اذا طعم ويكسوها اذا كسى وان لا يهجر ها الا فى البيت ولا يضربها ولا يقبح۔

ہندنامی صحابیہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: ابوسفیان بہت کنجوس ہیں، وہ مجھے اتنا بھی نہیں دیتے کہ میرے لئے اور میرے بچوں کے لئے کافی ہو، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

خذی مایکفیك وولدك بالمعروف ۔(سنن ترمذی)

اجماع:

فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ بیویوں کا نفقہ ان کے شوہروں پر واجب ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ بالغ ہوں اور ناشزہ نہ ہوں۔ (المغنی، ج۱۱،ص:۳۴۸) لہذا اگر بیوی اتنی چھوٹی ہے کہ ان سے لطف اندوز ہونا ممکن نہیں ہے تو اس کا نفقہ واجب نہیں ہوگا۔

عقلی دلیل:

نکاح کے نتیجہ میں بیوی شوہر کے لئے گھری ہوئی ہوتی ہے، شوہر کے حقوق کی بنیاد پر وہ اپنے لئے کمانے کے لئے فارغ نہیں ہوتی، لہذا شوہر کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی بیوی پر خرچ کرے، جو کسی کے لئے گھرا ہوا ہو اس کا نفقہ اسی پر واجب ہوتا ہے، جسے ملازم، فوجی کہ ملازم کا نفقہ اپنے مالک پر اور فوجی کا نفقہ حکومت پر واجب ہوتا ہے۔ (المغنی، ج۱۱،ص: ۳۴۸، الفقہ الاسلامی وادلتہ)

نفقہ میں کس کا اعتبار کیا جائے گا؟

کھانا، کپڑا اور رہائش میں کس کا اعتبار کیا جائے گا؟ شوہر کا یا بیوی کا، یا دونوں کا؟

اس بارے میں فقہاء کے رائیں الگ الگ ہیں، امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ شوہر اور بیوی دونوں کی معاشی صورت حال کا خیال رکھا جائے گا، یعنی اگر دونوں مالدار ہیں تو مالداروں والا نفقہ، دونوں غریب ہیں تو غریبوں والا نفقہ، اور اگر ایک مالدار ہے اور دوسرا غریب تو اوسط درجہ کا نفقہ واجب ہوگا، امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک عورت کی حیثیت کا اعتبار کیا جائے گا، کیونکہ نفقہ عورت کی ضرورت کی تکمیل کے لئے ہے، لہذا اس کو اتنا نفقہ دیا جائے کہ اس سے اس کی ضرورت پوری ہو سکے۔ (المغنی، ج۱۱،ص:۳۴۹)

فقہاء احناف کے درمیان بھی اس مسئلہ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے، امام کرخی کی رائے یہ ہے کہ کھانے اور کپڑے میں شوہر کی معاشی پوزیشن کا اعتبار کیا جائے گا، جبکہ

امام خصاف کی رائے کے مطابق شوہر اور بیوی دونوں کی معاشی صورت حال کا اعتبار کیا جائے گا۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ)

بیوی کا نفقہ شوہر پر کیوں واجب ہوتا ہے؟

اس بارے میں علماء کی دو رائیں ہیں: فقہائے احناف کی رائے یہ ہے کہ نکاح صحیح کے نتیجہ میں بیوی کا شوہر کے لئے (گھری ہوئی) محبوس ہونا نفقہ کے مستحق ہونے کی علت ہے۔

اس علت سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ نکاح فاسد کی صورت میں بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب نہیں ہوگا۔

اسی طرح عدت کی حالت میں بھی بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہوگا، خواہ عدت طلاق کی وجہ سے ہو یا انتقال کی وجہ سے ہو، کیونکہ عدت میں بھی بیوی گھری ہوئی ہوتی ہے۔

دوسری رائے جمہور علماء کی ہے، ان کے نزدیک بیوی کا نفقہ واجب ہونے کی بنیاد زوجیت ہے، یعنی بیوی ہونا ہے۔

علت میں اس فرق کی بنیاد پر فقہائے احناف کے نزدیک طلاق رجعی کی صورت میں بیوی نفقہ کی حقدار ہوگی، اور طلاق بائن کی صورت میں بھی وہ نفقہ کی حقدار ہوگی، خواہ وہ حاملہ ہو یا نہ ہو، جبکہ دوسرے فقہاء کے نزدیک طلاق بائن کی صورت میں اگر عورت حاملہ ہے تبھی وہ نفقہ کی حقدار ہوگی۔

بیوی کا نفقہ کب واجب ہوتا ہے؟

شوہر پر بیوی کا نفقہ واجب ہونے کے لئے چار شرائط ہیں:

۱۔ بیوی اپنے آپ کو شوہر کے حوالے کردے۔ اپنے نفس کو شوہر کے حوالے کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کہ درمیان ایسی تنہائی ہوجائے کہ جنسی تعلق قائم کرنے یا لطف اندوز ہونے میں کوئی چیز رکاوٹ نہ بنے، ایسی صورت میں اگر وہ شوہر کی اجازت سے اپنے میکے میں رہے گی تب بھی نفقہ کی حقدار ہوگی۔

اس بنیاد پر اگر بالغ بیوی رخصت ہوکر شوہر کے گھر گئی تو اس کا نفقہ واجب ہوگا، کیونکہ نفقہ کا سبب پایا جارہا ہے۔

اسی طرح اگر بیوی اپنے گھر پر ہی ہے، مگر اس نے شوہر کو اپنے قریب آنے سے منع نہیں کیا تب بھی وہ نفقہ کی حقدار ہوگی۔

لیکن اگر بیوی نے خود کو شوہر کے حوالہ کرنے سے منع کردیا یا اس کے ولی نے منع کیا، ایسی صورت میں وہ نفقہ کی حقدار نہیں ہوگی۔

۲۔ بیوی اتنی بڑی ہو کہ اس سے استمتاع ممکن ہو، لہذا اگر وہ اتنی کم عمر ہے کہ اس سے کسی طرح لطف اندوز ہونا ممکن نہیں ہے تو ایسی صورت میں اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ واجب نہیں ہوگا۔ امام ابو یوسف کی رائے یہ ہے کہ اگر بیوی کم عمر ہے، اس سے جنسی تعلق قائم کرنا ممکن نہیں ہے، مگر وہ شوہر کی خدمت کرتی ہے، اور اس نے خود کو شوہر کے سپرد کردیا، تو ایسی صورت میں اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ واجب ہوگا۔ (بدائع الصنائع)

اسی طرح اگر شوہر کم عمر ہے، مگر بیوی بالغہ ہے، تو اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ واجب ہوگا، کیونکہ اس کی طرف سے شرط پوری ہورہی ہے۔ یہی حکم اس صورت میں بھی ہوگا جب شوہر نامرد ہو، کسی وجہ سے بیوی سے جنسی تعلق قائم کرنے پر قادر نہ ہو۔

۳۔ اس کا نکاح 'نکاح صحیح' ہو، یعنی وہ نکاح صحیح کے ذریعہ بیوی بنی ہو، اگر کسی وجہ سے نکاح فاسد ہوگیا تو بیوی نفقہ کی حقدار نہیں ہوگی، کیونکہ نکاح فاسد کو ختم کرنا ضروری ہوتا ہے۔

۴۔ شوہر کا حق کسی عذر شرعی کے بغیر فوت نہ ہورہا ہو، اسی طرح کوئی ایسی وجہ نہ ہو جو شوہر کی طرف سے پائی جائے، مثلاً بیوی ناشزہ (نافرمان) ہے، تو وہ نفقہ کی حقدار نہیں گی، لیکن اگر شوہر نامرد ہے تو بیوی نفقہ کی حقدار ہوگی، کیونکہ وجہ شوہر کی طرف سے پائی جارہی ہے۔

نفقہ میں کیا کیا چیزیں شامل ہوں گی؟

فقہائے احناف کے نزدیک بیوی کے نفقہ کی مقدار متعین نہیں ہے، اسے اتنا نفقہ ملے گا جس سے اس کی ضرورت پوری ہوسکے۔

نفقہ میں درج ذیل چیزیں شامل ہوں گی:

۱۔ کھانا: اس میں کھانے سے متعلق تمام ضروری چیزیں شامل ہیں۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ شوہر پر پکا ہوا کھانا دینا ضروری ہے، اگر کچا اناج پکانے کے لئے دیا، اور بیوی اسے نہیں پکانا چاہتی ہے تو اسے انکار کرنے کا اختیار ہوگا۔ (بدائع الصنائع)

۲۔ کپڑا: سال میں دو مرتبہ کپڑا دینا نفقہ میں شامل ہے، ایک مرتبہ سردی میں اور ایک مرتبہ گرمی میں، یہ علاقہ کی مناسبت سے ہوگا، یعنی جس شہر میں بیوی رہتی ہو وہاں کے تقاضوں کے مطابق۔ اسی طرح آرام کرنے اور سونے سے متعلق ضروری چیزیں مثلاً بستر، تکیہ، گدا وغیرہ بھی نفقہ میں شامل ہوگا۔ امام شافعی کے نزدیک سال میں ایک مرتبہ ہی کپڑا ملے گا۔ (المغنی، ج۱۱، ص:۳۵۹)

۳۔ رہائش: بیوی کی حیثیت کے مطابق مکان فراہم کرنا شوہر کی ذمہ داری ہے، مکان خواہ شوہر کی ملکیت ہو یا کرایہ کا ہو، یا عاریتاً ہو، یا وقف کا ہو، اسی طرح مکان میں رہائش سے متعلق تمام ضروریات موجود ہوں۔

۴۔ خادم کا انتظام: اگر شوہر مالدار ہے یا بیوی ایسے خاندان سے تعلق رکھتی ہے جہاں خادم ہوتے ہیں تو ایسی صورت میں بیوی کے لئے خادم کا انتظام کرنا بھی شوہر پر لازم ہوگا، اور اس خادم کا نفقہ یعنی اس کا کھانا، کپڑا شوہر کے ذمہ لازم ہوگا۔

امام مالک اور امام شافعی کی رائے کے مطابق ایسی عورت کو ایک خادم ملے گا۔ (المغنی، ج۱۱، ص:۳۵۶) جبکہ امام ابو یوسفؒ اور امام ابوثورؒ کی رائے ہے کہ دو خادم ہونے چاہئے، ایک گھر کے اندر کے کاموں کے لئے اور دوسرا باہر کے کاموں کے لئے۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ۱۰، ص:۷۳۹۳)

۵۔ گھریلو ساز وسامان مثلاً گھر کی ضرورت کی تمام چیزیں اور صفائی کے آلات بھی بیوی

کے نفقہ میں شامل ہیں۔(الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج۱۰،ص:۷۳۹۵)

بیوی کا علاج

بیوی کا علاج نفقہ میں شامل ہوگا یا نہیں؟اس بارے میں قدیم فقہاء کی رائے یہ ہے کہ بیوی کے علاج کی ذمہ داری شوہر پر نہیں ہے، بلکہ بیوی اپنا علاج اپنے مال سے کرائے گی،اور اگر اس کے پاس مال نہیں ہے تو ایسی صورت میں اس کا نفقہ جس کے ذمہ ہوگا اسی کے ذمہ علاج کا خرچ بھی ہوگا،فقہاء اس کی علت یہ بیان کرتے ہیں کہ علاج اصل جسم کی حفاظت کے لئے ہے،اور جبکہ شوہر کا تعلق جسم کی منفعت سے ہے،مثلاً مکان کی مرمت کی ذمہ داری مالک مکان پر ہوتی ہے،نہ کہ کرایہ دار پر۔

قدیم فقہاء کی رائے اس پس منظر میں تھی کہ اس زمانہ میں علاج کا باضابطہ کوئی نظام نہیں تھا، جڑی بوٹیوں سے علاج ہو جایا کرتا تھا،اور یہ چیزیں آسانی سے مفت میں مل جاتی تھیں،لیکن موجودہ دور میں علاج ایک مستقل فن بلکہ مہنگے فن کی شکل اختیار کر چکا ہے،اس لئے موجودہ دور کے فقہاء کی رائے یہ ہے کہ علاج بھی غذا کی طرح ہے،اور جس طرح غذا فراہم کرنا شوہر کی ذمہ داری ہے اسی طرح علاج کرانا بھی شوہر پر لازم ہوگا۔

ناشزہ کا نفقہ

نشوز کے معنی ہیں شوہر کی نافرمانی،شوہر کے جو حقوق نکاح کے نتیجہ میں بیوی پر لازم ہیں ان کی ادائیگی سے انکار کرنا نشوز کہلاتا ہے، بیوی شوہر کو اپنے پاس آنے سے منع کردے، یا اس کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے چلی جائے یا شوہر کے ساتھ کہیں جانے سے منع کردے،تو ان صورتوں میں اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ واجب نہیں ہوگا،(المغنی، ج۱۱، ص:۴۰۹)، کیونکہ جب بیوی کسی عذر شرعی کے بغیر شوہر کے گھر سے چلی گئی تو اب اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا۔ یہاں عذر شرعی سے مراد یہ ہے کہ مہر معجّل طے پایا ہو اور شوہر مہر ادا نہ کر رہا ہے یا شوہر کوئی مناسب رہائش بیوی کو نہ فراہم کر رہا ہو۔

بیوی اگر اپنی رہائش گاہ میں شوہر کو نہ آنے دے تب بھی بیوی ناشزہ سمجھی جائے گی،اور اس کا نفقہ شوہر پر واجب نہیں ہوگا۔

ملازمت کرنے والی عورت کا نفقہ

عورت دن یا رات میں ملازمت کرتی ہے مثلاً تدریس،نرسنگ، یا کوئی ملازمت ،ایسی صورت میں اگر شوہر کو بیوی کی ملازمت پر کوئی اعتراض نہیں ہے تب اس کا نفقہ شوہر پر واجب ہوگا،لیکن اگر شوہر نے بیوی کو ملازمت کرنے سے منع کیا پھر بھی بیوی ملازمت کر رہی ہے تو ایسی صورت میں وہ نفقہ کی حقدار نہیں ہوگی۔

بیمار بیوی کا نفقہ

بیمار بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہوتا ہے،اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے،خواہ وہ نکاح کے وقت بیمار ہوئی ہو۔

جس کی رخصتی نہیں ہوئی ہے

اگر بیوی کسی شرعی سبب کی بنا پر شوہر کو اپنے گھر آنے سے روک دے یا وہ شوہر کے مکان میں منتقل ہونے سے منع کردے تو ایسی صورت میں وہ نفقہ کی حقدار ہوگی،عذر سے مراد مہر معجّل کا حاصل کرنا ہے،لیکن اگر وہ کسی سبب شرعی کے بغیر شوہر کو اپنے گھر آنے سے منع کرتی ہے یا شوہر کے گھر نہیں جاتی ہے تب وہ نفقہ کی حقدار نہیں ہوگی۔

بیوی جیل چلی جائے

اگر کسی وجہ سے بیوی قید ہو جائے،جیل چلی جائے تو اس صورت میں بھی اس کا نفقہ شوہر پر واجب نہیں ہوگا۔ کیونکہ ایسی صورت میں شوہر کا حق استمتاع معطل ہو جاتا ہے۔اگر ظلماً بیوی قید ہوگئی یا کسی نے اس کا اغوا کر لیا ایسی صورت میں بھی امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک اس کا نفقہ ساقط ہو جائے گا،لیکن امام مالک کے نزدیک اس وقت وہ نفقہ

کی حقدار ہوگی۔

بیوی کا سفر

فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر بیوی شوہر کے علاوہ کسی کے ساتھ حج یا اس کے علاوہ کسی سفر پر جاتی ہے تو اس صورت میں اس کا نفقہ ساقط ہو جائے گا، اسی طرح اگر وہ محرم کے بغیر تنہا کہیں سفر کرتی ہے تب بھی اس کا نفقہ ساقط ہو جائے گا، کیونکہ شوہر کا حق ختم ہو رہا ہے۔

اگر بیوی محرم کے ساتھ حج کا سفر کرتی ہے تو اس وقت وہ نفقہ کی حقدار ہوگی، چاہے وہ شوہر کی اجازت کے بغیر حج کے لئے گئی ہو۔

ارتداد

بیوی کے مرتد ہونے سے اس کا نفقہ ساقط ہو جائے گا، کیونکہ مرتد ہونے کی وجہ سے نکاح ختم ہو جاتا ہے۔

زمانہ عدت کا نفقہ

عدت کی مختلف شکلیں ہیں، مثلاً شوہر کے وفات کے نتیجہ میں واجب ہونے والی عدت، میاں بیوی کے درمیان علاحدگی کی صورت میں عدت، وغیرہ۔

اگر شوہر کے وفات کی وجہ سے عورت پر عدت لازم ہوئی ہے، تو ایسی صورت میں اس کا نفقہ شوہر پر لازم نہیں ہوگا۔ لیکن عدت طلاق میں خواہ طلاق رجعی ہو یا طلاق بائن یا مغلظہ، بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہوگا، کیونکہ طلاق رجعی میں بیوی ابھی نکاح کے حکم میں ہی ہے، مرد جب چاہے رجوع کر سکتا ہے، طلاق بائن اور تین طلاق والی عدت میں اگر چہ نکاح ختم ہو جاتا ہے، اور عورت مکمل طور پر نکاح سے خارج ہو جاتی ہے، مگر دوران عدت ایسی عورت کسی مرد سے نکاح نہیں کر سکتی ہے، اس بناء پر اس کا نفقہ شوہر پر واجب رہے گا۔

شوہر غائب ہو جائے

نکاح کے بعد اگر شوہر غائب ہو جائے اور بیوی کا نفقہ نہ ادا کرے، ایسی صورت میں عورت کیا کرے گی؟ اس بارے میں فقہائے احناف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایسی عورت شوہر کے نام پر قرض لے کر گزارہ کرے گی، بشرطیکہ عدالت نے اس کا نفقہ مقرر کر دیا ہو، جبکہ ائمہ ثلاثہ یعنی امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل کی رائے یہ ہے کہ شوہر کے غائب ہونے کی صورت میں عورت کو قرض لینے کا اختیار مطلقا ہوگا، اس کے لئے عدالت سے نفقہ مقرر کرانا لازم نہیں ہے۔ اور اگر شوہر نفقہ کی ادائیگی کے سلسلہ میں مسلسل لاپروائی برت رہا ہے اور نفقہ نہیں دے رہا ہے تو ایسی صورت میں نفقہ کی عدم ادائیگی کی بنیاد پر عورت عدالت میں درخواست دے سکتی ہے کہ اسے نفقہ دیا لا جائے یا اس بنا پر تعزیر کی جائے۔

شوہر کی تنگدستی کے سبب تفریق

کیا شوہر کے تنگدست ہونے کی بنیاد پر زوجین کے درمیان تفریق کی جا سکتی ہے؟ اس بارے میں فقہائے احناف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ شوہر اپنی تنگدستی کے سبب بیوی کا نفقہ نہ ادا کر رہا ہو تو ایسی صورت میں اس کے درمیان تفریق نہیں کرائی جائے گی، احناف کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ میں بھی بعض خوشحال تھے، اور بعض تنگدست، مگر دور نبوی میں ایک بھی ایسی مثال موجود نہیں ہے کہ شوہر کی تنگدستی یا عدم انفاق کی وجہ سے تفریق کرائی گئی ہو، چنانچہ احناف کے نزدیک شوہر اگر خوش حال ہے پھر بھی وہ نفقہ نہیں ادا کرتا ہے تو قاضی اس کے مال کو فروخت کرنے یا شوہر کو قید میں ڈالنے کا حکم دے گا، اور اگر شوہر تنگدست ہے اور وہ اپنی عسرت کی وجہ سے نفقہ نہیں ادا کر رہا ہے تو قاضی اس کو مہلت دے گا، کیونکہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: وہ تنگی کے بعد فراغت پیدا فرماتا ہے۔

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک شوہر کے نفقہ ادا نہ کرنے کی صورت میں تفریق کرائی جائے گی، کیونکہ ایسی صورت میں ان عورتوں کو ایسے مردوں کے ساتھ نکاح میں رکھنا ان عورتوں پر ظلم

وزیادتی کے مترادف ہوگا،اوراللہ تعالی کاارشاد ہے:

لاتمسکوھن ضرارا لتعتدوا۔(سورہ بقرہ:۲۳)

موجودہ حالات میں نفقہ نہ ادا کرنے کی صورت میں عورت کودارالقضاء سے رجوع کرنا چاہیے،اگر قاضی محسوس کرتا ہے کہ شوہر نفقہ ادا کرنے پر قادر نہیں ہے یا جان بوجھ کر بیوی کونفقہ نہیں دیتا ہے،اوراس طرح وہ بیوی کو پریشان کررہا ہے تو ایسی صورت میں قاضی شوہر سے بات کرے گا،اورانہیں ضرورت محسوس ہوئی تو مذکورہ عورت کا نکاح فسخ کردے گا۔

☆☆☆☆☆☆

عدت: شرعی نقطہ نظر اور ضروری احکام ومسائل

مفتی منور سلطان ندوی

(رفیق علمی مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء)

عدت کی تعریف

یہ لفظ عَدَّ یَعُدُّ سے بنا ہے،جس کے لغوی معنی ہیں شمار کرنا،گننا۔عدت مہینوں اور دنوں کو شمار کر کے گزاری جاتی ہے،اسی لئے اس کو عدت کہا جاتا ہے۔

عدت کی اصطلاحی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

ایک ایسی مدت کا انتظار جو عورت پر نکاح یا شبہ نکاح کے ختم ہونے پر لازم ہوتی ہے۔(الفقہ الاسلامی وادلتہ،ج۹،ص:۷۱۶۶)

اسلامی قوانین کے شارح اوراس کو قانونی شکل میں پیش کرنے والے مشہور قانون داں ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن (پاکستان) نے عدت کی تعریف اس طرح کی ہے:

''زوال نکاح کے بعد خواہ نکاح حقیقتاً ہو یا شبہۃ، جو دخول یا موت سے مؤکد ہوا ہو، عورت کا ایک مدت معلومہ تک نکاح ثانی سے باز رہنا عدت کہلاتا ہے''۔(مجموعہ قوانین اسلامی، ج،ص:۷۴۵،دفعہ:۱۳۹)

اس تعریف کی تشریح کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں:

''شریعت اسلام میں عدت دراصل وہ ایام ہیں جو عورت پر سے شوہر کی ملک تمتع

زائل ہونے کے بعد اس کو انتظار میں گزارنے لازم ہوتے ہیں بشرطیکہ شوہر نے اس سے صحبت کی ہو، یا خلوت صحیحہ ہوگئی ہو، یا شوہر مر گیا ہو، چنانچہ جس عورت سے نکاح بالشبہ کی صورت میں صحبت کی گئی ہو، اس پر بھی عدت کے احکام نافذ ہوں گے''۔(حوالہ سابق)

عدت کی مشروعیت

طلاق یا وفات کے بعد عورت پر عدت لازم ہے، عدت کی مشروعیت قرآن، احادیث اور اجماع امت سے ثابت ہے، قرآن کریم میں متعدد آیات عدت سے متعلق موجود ہیں، مثلا:

۱۔والمطلقات یتربصن بانفسھن ثلاثة قروء۔(سورة بقرہ:۲۲۸)

۲۔والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بانفسھن أربعة أشھر وعشرا۔(سورة بقرة:۲۳٤)

۳۔والئی یئسن من المحیض من نسائکم ان ارتبتکم فعدتھن ثلاثة اشھروالئی لم یحضن وأولات الاحمال أجلھن أن یضعن حملھن۔(سورہ طلاق:٤)

احادیث میں عدت کا ذکر

۱۔عن أم عطیة أن رسول اللہ ﷺ قال :لا یحل لامرة تومن باللہ والیوم الآخر أن تحد علی میت فوق ثلاث لیال الا علی زوج أربعة اشھر وعشرا۔(صحیح البخاری، صحیح مسلم)

۲۔رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ بنت قیس سے فرمایا:

اعتدی فی بیت ابن ام مکتوم۔(صحیح مسلم)

۳۔عن عائشة قالت:أمرت بریرة أن تعتد بثلاث حیض۔(سنن ابن ماجة)

عدت کی مشروعیت پر فقہاء کا اجماع ہے اور رسول اللہ ﷺ کے دور سے لے کر آج

تک کسی نے اس پر نکیر نہیں کی۔

عدت کی حکمت ومصلحت

جس طرح اسلامی شریعت کے دیگر تمام احکامات میں اللہ تعالی نے بہت سی حکمتیں رکھی ہیں، اسی طرح اس عدت کے پیچھے بھی بہت سی حکمتیں ہیں، ان میں بعض حکمتوں کو سائنسدانوں نے بھی اپنے سائنسی تحقیقات کی روشنی میں ثابت کیا ہے، عدت کی چند حکمتیں اس طرح ہیں:

۱۔ برأت رحم

علاحدگی کے وقت عورت کے رحم میں حمل ہے یا وہ حمل سے خالی ہے، یہ معلوم ہونا انتہائی ضروری ہے، نسب کی حفاظت کے لئے یہ ناگزیر ہے اور نسب کی حفاظت ہی بچہ کو خاندانی شناخت عطا کرتا ہے، اس وجہ سے شریعت میں اختلاط نسب سے بچنے کی بڑی تاکید آئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا یحل لامری یومن باللہ والیوم الآخر أن یسقی ماءہ زرع غیرہ۔(سنن ابی داؤد)

لہذا اگر عورت کا نکاح مرد سے علاحدگی کے فورا بعد کر دیا جائے تو معلوم نہیں ہو پائے گا کہ بچہ کس کا ہے اور نسب خلط ملط ہو جائے گا، اس لئے رحم یعنی بچہ دانی کے خالی ہونے کا یقین ہونے اور نسب کی حفاظت کے لئے عدت کا ہونا ضروری ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی عدت کی مصلحتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اعلم ان العدة کانت من المشھورات المسلمة فی الجاھلیة وکانت مما لایکادون یترکون وکان فیھا مصالح کثیرة:منھا:معرفة براء ة رحمھا من مائه لئلا تختلط الانساب فان النسب احد ما یشاح به ویطلبه العقلاء وھو من خواص نوع الانسان ومماامتازبه من سائر الحیوان وھی المصلحة المرعیة من

باب الاستبراء۔(حجة الله البالغة ،ج۲،ص:۲۱۹)

۲۔عدت کی ایک مصلحت نکاح کی اہمیت کا اظہار بھی ہے،شاہ ولی اللہ دہلوی کے بقول نکاح ایک غیر معمولی عمل ہے،اس کے وجود میں لانے کے لئے مردوں کو جمع ہونا پڑتا ہےاور نکاح کا رشتہ ختم ہونے کے لئے ایک مدت تک عورت کو انتظار کرنا پڑتا ہے،اس سے نکاح کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے،لکھتے ہیں:

ومنها التنويه بفخامة امر النكاح حيث لم يكن أمرا ينتظم الابجمع رجال ولا ينفك الا بانتظار طويل ،ولولا ذلك لكان بمنزلة لعب الصبيان ينتظم ثم ينفك فى الساعة۔(حواله سابق)

علامہ شامی نے مذکورہ دونوں حکمتوں کا ذکر کیا ہے،وہ لکھتے ہیں:

قوله'فالاولى'بيان لحكمة كونها ثلاثا مع ان مشروعية العدة لتعرف برأة الرحم أى خلوه عن الحمل وذلك يحصل بمرة فبين ان حكمة الثانية لحرمة النكاح اى لاظهار حرمته۔(ردالمحتار)

۳۔رشتہ نکاح مرد وعورت دونوں کے لئے ایک اہم نعمت ہے،اس نعمت کے ختم ہونے پر حزن وملال کا ہونا فطری امر ہے،لہذا اس حزن وملال کے اظہار کے لئے ایک مدت ہونی چاہیے۔

فقہ حنفی کے نامور محقق علامہ ابن ہمام نے اس جانب بھی اشارہ کیا ہے،وہ لکھتے ہیں:

وأفاد المصنف فيما سيأتى أنها ايضا تجب لقضاء حق النكاح باظهارالاسف عليه ۔(فتح القدير،ج۳،ص:۲۶)

۴۔علامہ شامی نے عدت کی حکمتوں میں ایک یہ بھی ذکر کیا ہے کہ عدت کی وجہ سے آزاد عورت اور باندی میں امتیاز ظاہر ہوتا ہے،بایں طور کہ آزاد عورت کی عدت تین ماہ یا تین ناپاکی کی مدت ہے،جبکہ باندی کی عدت دو ماہ اور دو ناپاکی کی مدت ہے۔(حوالہ بالا)

۵۔عدت کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اس سے نکاح میں دوام کا اظہار ہوتا ہے،

یعنی ایسا عمل نہیں ہے کہ جب دو مرد وعورت چاہیں نکاح کرلیں،اور جب چاہیں اس عمل کو ختم کردیں، بلکہ یہ عمل اصلا دوام یعنی ہمیشگی کے لئے ہوتا ہے،عدت کے ذریعہ دونوں کو ایک مدت تک پریشانیوں سے گزرنا پڑتا ہے،حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے عدت کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی بیان کیا ہے،وہ لکھتے ہیں:

ومنها ان مصالح النكاح لا تتم حتى يوطنا انفسهما على ادامة هذا العقد ظاهرا فان حدث حادث يوجب فك النظام لم يكن بد من تحقيق صورة الادامة فى الجملة بان تتربص مدة تجد لتربصها بالا وتقاسى لها عناء۔(حجة الله البالغة،ج۲،ص:۲۱۹)

مذکورہ بالا حکمتوں میں سب سے بنیادی مصلحت برات رحم ہے،رحم کا خالی ہونا ایک حیض کی مدت گزرنے سے بھی معلوم ہوجاتا ہے،مگر چونکہ اس میں دیگر مصالح بھی ہیں، اس لئے عدت کی مدت کہیں تین ناپاکی کی مدت اور کہیں اس سے زیادہ ہے۔

عدت واجب ہونے کے اسباب

دو اسباب میں سے کسی سبب کے پائے جانے سے عدت واجب ہوتی ہے،اول شوہر و بیوی کے درمیان علاحدگی اور دوسری موت۔

شوہر و بیوی کے درمیان علاحدگی عموما درج ذیل چار شکلوں میں ہوتی ہے:

الف۔شوہر طلاق دے۔

ب۔بیوی شوہر سے خلع حاصل کرے۔

ج۔قاضی دونوں کے درمیان علاحدگی کرائے،اسے فسخ نکاح کہا جاتا ہے۔

د۔شوہر کی موت ہوجائے۔

ا۔عدت واجب ہونے کے لئے شوہر بیوی کے درمیان جنسی تعلق قائم ہونا یا دونوں کے درمیان تنہائی کا پایا جانا ضروری ہے،اس کے بغیر عدت واجب نہیں ہوتی ہے،خواہ رشتہ

نکاح طلاق، خلع، فسخ سے ختم ہو یا شوہر کی موت سے۔

خلفائے راشدین کا یہی فیصلہ ہے، امام احمد نقل کرتے ہیں:

قضی خلفاء الراشدون ان من اغلق بابا وارخی سترا فقد وجب المهر ووجبت العدة ۔(مسند الامام احمد بن حنبل)

۲۔جس طرح نکاح صحیح میں علاحدگی کی بنیاد پر عدت واجب ہوتی ہے، اسی طرح اگر نکاح کسی وجہ سے فاسد ہوگیا تب بھی عدت واجب ہوتی ہے، کیونکہ مرد وعورت کے درمیان جنسی تعلق کے نتیجہ میں رحم کے مشغول ہونے کا امکان پیدا ہوگیا ہے اور اس طرح اختلاط نسب سے بچانے کے لئے عدت ضروری ہے۔

فقہاء نے نکاح فاسد کی یہ مثال بیان کی ہے کہ جیسے عورت کو ایسے مرد کے کمرہ میں داخل کر دیا گیا، جس سے اس کا نکاح نہیں ہوا تھا، اور اس مرد کو بتایا گیا کہ یہی اس کی منکوحہ ہے، حالانکہ بعد میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ دونوں کا نکاح نہیں ہوا تھا بلکہ اشتباہ کی بنیاد پر یہ معاملہ وجود پذیر ہوا۔

۳۔شوہر کے انتقال سے عدت واجب ہوتی ہے، خواہ دونوں کے درمیان ابھی جنسی تعلق قائم ہوا ہو یا نہ، اور خواہ لڑکی ابھی چھوٹی ہو، البتہ اس صورت میں عدت واجب ہونے کی شرط یہ ہے کہ یہ نکاح صحیح ہوا ہو، یعنی نکاح فاسد کے بعد شوہر کا انتقال ہو جائے تو عدت واجب نہیں ہوگی۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: والذين يتوفون منكم ويذرون أزواجا يتربصن بأنفسهن اربعة اشهروعشرا۔(سورہ بقرہ:۲۳٤)

عدت کی قسمیں

عدت کی تین قسمیں ہیں: ناپاکی کی مدت والی عدت، مہینہ والی عدت اور وضع حمل والی عدت، ان تینوں کی مختصر تفصیل اور شرائط ذکر جاتی ہیں:

مہینہ والی عدت:

۱۔قرآن کریم میں مطلقہ عورتوں کو تین مدت انتظار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور اس کے لئے لفظ ''قرء'' استعمال ہوا ہے، جس کی جمع ''قروء'' ہے:

والمطلقات يتربصن بأنفسهن ثلاثة قروء(سورہ بقرہ:۲۲۸)

اس لفظ ''قروء'' کے معنی کے میں اختلاف ہے، کہ کیا اس سے مراد طہر یعنی پاکی کی مدت ہے یا اس سے مراد حیض یعنی ناپاکی کی مدت ہے، بہت سے صحابہ، فقہائے مدینہ کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد طہر ہے، اسی رائے کو امام مالک اور امام شافعی نے اختیار کیا ہے جبکہ خلفاء راشدین، حضرت عبداللہ بن مسعود اور بہت سے صحابہ کی رائے ہے کہ قرء سے مراد حیض ہے، اسی کو امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل نے اختیار کیا ہے۔(الموسوعۃ الفقہیۃ، ج۲۹،ص:۳۰۸)

۲۔ناپاکی کی مدت کے ذریعہ عدت کے واجب ہونے کی شرط یہ ہے کہ دونوں کے درمیان نکاح صحیح ہوا ہو، اور یہ نکاح صحیح طلاق یا خلع یا کسی اور ذریعہ سے ختم ہوا ہو۔

۳۔اس صورت میں بیوی سے جنسی تعلق یا خلوت صحیحہ ضروری ہے، لہذا جنسی تعلق یا خلوت نہ پائے جانے کی صورت میں یہ عدت واجب نہیں ہوگی، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

يا ايها الذين آمنوا اذا نكحتم المومنات ثم طلقتموهن من قبل أن تمسوهن فما لكم عليهن من عدة تعتدونها۔(سورہ احزاب:٤٩)

مہینہ والی عدت:

فقہاء کی رائے یہ ہے کہ مہینہ والی عدت دو صورتوں میں واجب ہوتی ہے:

اول: ایسی مطلقہ جسے کمی سنی کی وجہ سے ناپاکی کی مدت ابھی شروع نہیں ہوئی ہے، یا عمر کی زیادتی کی وجہ سے ناپاکی کا سلسلہ موقوف ہو چکا ہے، ایسی عورتوں کی عدت تین ماہ ہے، اللہ تعالی فرماتے ہیں:

والئی يئسن من المحيض من نسائكم ان ارتبتم فعدتهن ثلاثة أشهر

والئی لم یحضن وأولات الاحمال أجلھن أن یضعن حملھن(سورہ طلاق:٤)

مہینہ کو ناپاکی کی مدت کا بدل قرار دیا گیا ہے، لہذا جن عورتوں کو ناپاکی کی مدت سے عدت گزارنا تھا، انہیں ناپاکی کے مرحلہ میں نہ ہونے کی وجہ سے تین ماہ عدت گزارنی ہوگی۔

دوم: جب شوہر کا انتقال ہوجائے اور عورت حمل سے نہ ہو، خواہ وفات جنسی تعلق قائم کرنے سے پہلے ہوا ہو اس کے بعد، ایسی صورت میں عدت مہینوں کے اعتبار سے واجب ہے، یعنی چار ماہ دس دن، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

والذین یتوفون منکم ویذرون أزواجا یتربصن بأنفسھن أربعة أشھر وعشرا۔(سورہ بقرہ:٢٣٤)

اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

لا یحل لامرأة تومن باللہ والیوم الآخر أن تحد علی میت فوق ثلاث لیال الا علی زوج أربعة أشھر وعشرا۔(صحیح بخاری،وصحیح مسلم)

وضع حمل والی عدت:

جس عورت کو طلاق دی گئی یا وطی بالشبہ کے نتیجہ میں اس سے تعلق قائم ہوا، اور وہ حمل سے ہے، تو اس کی عدت وضع حمل ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وأولات الاحمال أجلھن أن یضعن حملھن۔(سورہ طلاق:٤)

ایسی عورت جس کے شوہر کا انتقال ہوگیا، اور وہ حمل سے ہے، اس کی عدت کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے، ایک رائے یہ ہے کہ ایسی عورت کی عدت وضع حمل ہے، یعنی جب بچہ کی پیدائش ہوگی، اس وقت تک عدت ہے، اور پیدائش کے ساتھ ہی اس کی عدت مکمل ہوجائے گی، خواہ یہ مدت طویل ہو، یا کم ہو، مثلا شوہر کے انتقال کے کچھ دیر بعد بھی ولادت ہوگئی تو عدت مکمل ہوجائے گی۔

جمہور فقہاء کی یہی رائے ہے، جبکہ حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، مشہور فقیہہ ابن ابی لیلی اور امام سحنون کی رائے یہ ہے کہ ایسی عورت کی عدت وہ مدت ہوگی جو عدت وفات

اور وضع حمل دونوں میں زیادہ لمبی ہو، اور ان دونوں مدتوں میں سے جو اخیر میں مکمل ہوگی اسی سے عدت پوری ہوگی۔(الموسوعة الفقہیة، ج۲۹،ص:۳۱۸)

عدت کی تبدیلی

کبھی عورت ایک متعین عدت گزار رہی ہوتی ہے، مگر ایسا ہوتا ہے کہ بعض حالات کی وجہ سے اس کی عدت دوسری عدت میں تبدیل ہوجاتی ہے، اس طرح تبدیلی عدت کی درج ذیل چار شکلیں معروف ہیں:

اول۔عدت کا مہینہ سے ناپاکی کی مدت میں بدل جانا

ایک عورت ابھی کم سن ہے، اسے ناپاکی کی مدت شروع نہیں ہوئی ہے، اسی طرح عمر کی زیادتی کی وجہ سے کسی عورت کی ناپاکی کا سلسلہ موقوف ہوچکا ہے، انہوں نے مہینہ کے اعتبار سے عدت گزارنا شروع کردیا، مگر ایک عرصہ کے بعد ناپاکی کی مدت شروع ہوگئی، اس صورت میں مذکورہ عورت کی عدت ناپاکی کی عدت میں تبدیل ہوجائے گی، اور جو عرصہ گزر چکا ہے، وہ شمار نہیں ہوگا بلکہ ازسرے نو ناپاکی کی مدت کے اعتبار سے تین ناپاکی کی مدت تک عدت گزارنی ہوگی، البتہ اگر کسی نے مہینے کے حساب سے اپنی عدت مکمل کرلی اس کے بعد ناپاکی کا سلسلہ شروع ہوا تو اب اس کی عدت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، کیونکہ عدت مکمل ہونے کے بعد یہ صورت حال پیش آئی ہے۔

دوم۔ایک مطلقہ عورت نے ناپاکی کی مدت کے اعتبار سے عدت گزارنا شروع کیا، ابھی ایک یا دو مدت ہی گزری تھی کہ ناپاکی کا سلسلہ بند ہوگیا، ایسی صورت میں اس کی عدت مہینے والی عدت میں تبدیل ہوجائے گی، اور اس عورت کو اب مہینے کے اعتبار سے تین ماہ عدت گزارنی ہوگی۔

سوم۔طلاق رجعی کے بعد شوہر کا انتقال ہوجائے

ایک عورت طلاق رجعی کی عدت گزار رہی تھی، کہ دوران عدت اس کے شوہر

کا انتقال ہوگیا،تو اس عورت کی عدت باتفاق فقہاء وفات کی عدت میں تبدیل ہوجائے گی،اور اس عورت کو چار ماہ دس دن والی عدت مکمل کرنی ہوگی۔

علامہ قدامہ نے اس پر فقہاء کا اتفاق نقل کیا ہے،وہ لکھتے ہیں:

أجمع كل من نحفظ عنه من اهل العلم على ذلك و ذلك لان الرجعية زوجة يلحقها طلاقه وينالها ميراثه فاعتدت للوفاة كغير المطلقة۔ (المغنی،ج۹،ص:۱۰۸)

البتہ اگر طلاق بائن یا تین طلاق کی عدت کے دوران شوہر کا انتقال ہوجائے تو اس سے عورت کی عدت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا،وہ پرانی عدت ہی مکمل کرے گی۔(الموسوعۃ الفقہیۃ،ج۲۹،ص:۳۲۵)

چہارم۔عورت ناپاکی کی مدت والی عدت گزار رہی ہے،یا مہینے کے اعتبار سے عدت گزار رہی ہے،اور دوران عدت معلوم ہوا کہ وہ حمل سے ہے،ایسی صورت میں اس کی عدت وضع حمل میں تبدیل ہوجائے گی،جمہور فقہاء کا اس مسئلہ پر اتفاق ہے۔(الموسوعۃ الفقہیۃ،ج۲۹،ص:۳۲۶)

پنجم۔مرض الموت میں شوہر نے اپنی بیوی کو اس مقصد سے طلاق دیا کہ وہ اس کی میراث میں حقدار نہ بنے،اور پھر اسی عدت کے دوران مذکورہ شوہر کا انتقال ہوجائے تو ایسی صورت میں عدت طلاق اور عدت وفات دونوں میں جس کی مدت زیادہ لمبی ہو،اس عدت کو مکمل کرنا لازم ہوگا،امام ابوحنیفہ،امام محمد اور امام احمد کی یہی رائے ہے،ایسی طلاق کو فقہاء طلاق فار سے تعبیر کرتے ہیں،جبکہ امام مالک اور امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ ایسی عورت طلاق کی عدت مکمل کرے گی۔(الفقہ الاسلامی والادلتہ،ج۹،ص:۷۱۹۱)

عدت کا آغاز اور اختتام

عدت کب شروع ہوگی؟عدت طلاق یا فسخ یا شوہر کی وفات کے بعد شروع ہوجاتی

ہے،اگر کسی عورت کو معلوم نہیں ہے کہ اس کے شوہر نے طلاق کب دیا،یا شوہر کی وفات کب ہوئی،تو اس صورت میں عدت کی مدت مکمل ہونے سے عدت پوری ہوجائے گی۔امام ابوحنیفہ کی یہی رائے ہے،جبکہ امام مالک کا موقف یہ ہے کہ جب طلاق کی خبر عورت کو ملے گی اس وقت عدت شروع ہوگی۔(الموسوعۃ الفقہیۃ،ج۲۹،ص:۳۲۶)

یہ حکم اس وقت ہے جب نکاح صحیح کے بعد یہ صورت حال پیش آئی ہو،لیکن اگر نکاح فاسد ہوا ہے تو ایسی صورت میں جب قاضی دونوں کے درمیان علاحدگی کرائے گا اس وقت سے عدت کا شمار ہوگا۔

عدت کے اختتام کے لئے ضروری ہے کہ جو عدت عورت پر لازم ہے اس کے اعتبار سے مدت مکمل ہوجائے،اور وضع حمل کی صورت میں ولادت ہوجائے۔

علامہ کاسانی نے لکھا ہے کہ عدت کا اختتام دو طرح سے معلوم ہوگا،اول قول کے ذریعہ،یعنی عورت بتائے کہ اس کی عدت مکمل ہوگئی ہے،اور دوسرا عمل کے ذریعہ،مثلاً عورت شرع کے مطابق نئے مرد سے نکاح کرلے،اس سے بھی عدت کا ختم ہونا سمجھا جائے گا۔ (بدائع الصنائع،ج۳،ص:۱۹۸)

کیا مرد پر عدت واجب ہوگی؟

نکاح کا رشتہ ختم ہونا مرد و عورت دونوں کے لئے اہم ہے،اس تناظر میں یہ سوال اہم ہے کہ جس طرح عورت مرد سے نکاح کا رشتہ ختم ہونے پر سوگ مناتی ہے،کیا اسی طرح مرد پر بھی عدت واجب ہوگی؟فقہاء نے اس کی وضاحت کی ہے،تکلیف اور آزردگی ایک فطری بات ہے،بیوی کے رشتہ ختم ہونے کا غم یقیناً مرد کو بھی ہوگا،البتہ اصطلاحی مفہوم میں ایک خاص مدت تک انتظار جس طرح عورت پر ضروری ہے،وہ حکم مرد کے لئے نہیں ہے،رشتہ ختم ہونے کے فوراً بعد مرد اگر چاہے تو دوسرا نکاح کرسکتا ہے،بشرطیکہ کوئی شرعی مانع موجود نہ ہو۔علامہ شامی نے اس مسئلہ کو بیان کیا ہے۔(ردالمحتار)

غیر مسلم بیوی کے لئے عدت

شرعی احکام کا مکلّف صرف وہی افراد ہیں جنہوں نے شریعت کو قبول کیا ہے، یعنی جو مسلمان ہیں، بیوی اہل کتاب یعنی یہودی یا عیسائی ہے تو ایسی عورت پر بھی عدت واجب ہوگی۔

امام ابوحنیفہ کے علاوہ امام صاحب کے دونوں شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد اور دیگر ائمہ کے نزدیک بیوی اگر ذمیہ (یعنی کتابیہ) ہے تو اس پر عدت واجب ہوگی۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج۹، ص:۷۱۶۸)

کم سن بیوی کی عدت

نابالغ لڑکی کا نکاح ہوا، اور پھر اس کے شوہر کا انتقال ہوگیا، ایسی صورت میں مذکورہ لڑکی پر شوہر کے وفات والی عدت لازم ہوگی، اس مسئلہ میں بالغہ اور نابالغہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

نامرد کی بیوی کی عدت

جس عورت کا شوہر نامرد ہو، یعنی کسی وجہ سے جنسی تعلق پر قادر نہ ہو، یا اس کا عضو تناسل کٹا ہوا ایسے مرد کی بیوی پر طلاق کی صورت میں عدت طلاق اور شوہر کے وفات کی صورت میں عدت وفات لازم ہوگی، فقہائے احناف کی یہی رائے ہے، دیگر فقہاء کے نزدیک اس مسئلہ میں تفصیل ہے۔

عدت کے احکام

عدت گزارنے والی عورت سے درج ذیل احکام متعلق ہوتے ہیں:

۱۔نکاح کا پیغام دینا

عورت طلاق کی عدت گزار رہی ہے یا شوہر کے وفات کی عدت گزار رہی ہے تو دوران عدت اس عوت کو صراحت کے ساتھ نکاح کا پیغام دینا ناجائز ہے، کیونکہ طلاق رجعی میں عورت ابھی شوہر کے نکاح میں ہی ہوتی ہے، طلاق بائن اور وفات کی صورت میں

نکاح کے احکام ابھی باقی ہیں۔البتہ وفات کی عدت میں اشارہ وکنایہ میں نکاح کی بات کہی جاسکتی ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

ولا جناح عليكم فيما عرضتم به من خطبة النساء او اكننتم فى أنفسكم علـم الله أنكم ستذكرونهن ولكن لا تواعدوهن سرا الا أن تقولوا قولا معروفا ۔(سورہ بقرہ:۳۸)

۲۔عدت میں نکاح

عدت کی حالت میں نکاح کرنا جائز نہیں ہے، لہذا کسی اجنبی مرد کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی عدت والی عورت سے نکاح کرے۔

ولا تعزموا عقدة النكاح حتى يبلغ الكتاب أجله۔(سورہ بقرہ:۳۸)

۳۔گھر سے باہر نکلنا

طلاق کے نتیجہ میں لازم ہونے والی عدت میں عورت کے لئے لازم ہے کہ وہ گھر میں رہے، اور گھر سے بلاضرورت باہر نہ نکلے، نہ دن میں اور نہ رات کے وقت، کیونہ ایسی عورت کے لئے عدت کی مدت کا نفقہ اس کے شوہر پر لازم ہوتا ہے، اللہ تعالی کے اس حکم کی وجہ سے:

لا تـخـرجـوهن من بيوتهن ولا يخرجن الا ياتين بفاحشة مبينة۔(سورہ طلاق:٦٥)

وفات والی عدت میں عورت دن کے اوقات میں باہر نکل سکتی ہے، کیونکہ نفقہ کا انتظام کرنا اسی کے ذمہ ہے، البتہ رات کے وقت میں بلاضرورت گھر سے باہر نہیں نکلے گی۔

کسی انسانی ضرورت کی وجہ سے گھر سے نکلنا ضروری ہو مثلا مکان کے گرنے یا سامان ضائع ہونے کا خطرہ ہو، یا کرایہ کا مکان ہو اور عدت وفات میں کرایہ ادا کرنے کی کوئی سبیل نہ ہو یا شوہر کا مکان ہو، لیکن ان کا حصہ رہنے کے لئے ناکافی ہو یا بیماری کی وجہ سے ڈاکٹر کے پاس جانا ہو، وغیرہ تو ایسی حالت میں گھر سے نکلنے کی اجازت ہوگی، علامہ

کاسانی نے اس بارے میں تفصیلی گفتگو کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

وأما فی حالة الضرورة فان اضطرت الی الخروج من بیتها بأن خافت سقوط منزلها أو خافت علی متاعها أو کان المنزل بأجرة ولا تجد ماتودیه فی اجرته فی عدة الوفاة..... وان کان المنزل لزوجها وقد مات عنها فها ان تسکن فی نصیبها ..... وان کان نصیبها لایکفیها او خافت علی متاعها منهم فلا بأس أن تنتقل وانما کان کذلك لان السکنی وجبت بطریق العبادة حقا لله تعالی علیها والعبادات تسقط بالاعذار..... واذا انتقلت لعذر یکون سکناها فی البیت الذی انتقلت الیه بمنزلة کونها فی المنزل الذی انتقلت منه فی حرمة الخروج عنه۔(بدائع الصنائع ،ج۳،ص:۲۰۵)

۴۔جمہورفقہاء کی رائے یہ ہے کہ عدت وفات میں عورت کے لئے سفر کرنا، یا حج کے لئے جانا، یا اعتکاف کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ ان صورتوں میں عدت فوت ہوجائے گی، مذکورہ چیز کی تلافی ممکن ہے اور حج کی قضاء ہے، جبکہ عدت کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ (الموسوعۃ الفقہیۃ، ج۲۹،ص:۳۵۱)

۵۔معتدہ کی رہائش

عورت عدت کہاں گزارے گی؟ اس بارے میں جمہورفقہاء کی رائے یہ ہے کہ طلاق، یا فسخ یا موت کی صورت میں عورت عدت اس مکان میں ہی گزارے گی جہاں وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی، اگر وہ طلاق یا وفات کی وقت کہیں اور تھیں تو وہ واپس اپنے گھر آئے گی اور وہیں عدت گزارے گی۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

واتقوا الله ربکم لا تخرجوهن من بیوتهن ولا یخرجن الا أن یأتین بفاحشة مبینة۔(سورہ طلاق:۱)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی نے بیوت یعنی گھر کی نسبت عورتوں کی طرف فرمائی ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابیہ کے لئے لازم کیا کہ وہ اپنے شوہر کے گھر میں

عدت گزارے، اور حضرت عثمانؓ نے یہی فیصلہ صحابہ کرام کی موجودگی میں فرمایا۔(الموسوعۃ الفقہیۃ، ج۲۹،ص:۳۴۷، المغنی، ج۹،ص:۱۷۰)

عدت وفات والی عورت کے بارے میں حضرت جابر بن زید، حسن بصری، عطاء اور تابعین کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ وہ جہاں چاہے عدت گزارے، اسے اس بات کا اختیار ہوگا۔(الموسوعۃ الفقہیۃ، ج۲۹،ص:۳۴۷)

۶۔معتدہ کا نفقہ

عدت کے دوران نفقہ کی تفصیلات اس طرح ہیں:

الف۔اگر طلاق رجعی کی عدت ہے تو عورت کو مکمل نفقہ اور سکنی یعنی رہائش ملے گی، یعنی شوہر پر یہ دونوں چیزیں لازم ہیں۔

ب۔اگر طلاق بائن کی عدت ہے تو خواہ عورت حمل سے ہو یا نہ ہو، بہرصورت فقہاء احناف کے نزدیک وہ عورت اپنے شوہر سے نفقہ ورہائش کی حقدار ہوگی۔

وان کن أولات حمل فأنفقوا علیهن حتی یضعن حملهن۔(سورہ طلاق:۶۵)

ج۔عدت وفات کی صورت میں اس کو شوہر سے نفقہ نہیں ملے گا، کیونکہ نکاح کا رشتہ ختم ہوچکا ہے، فقہائے احناف کی یہی رائے ہے، جبکہ امام مالکؒ کے نزدیک اگر اس عورت کے شوہر کے پاس اپنا مکان تھا، یا مکان کرایہ کا تھا مگر اس نے کرایہ ادا کردیا تھا، تو ان صورتوں میں ایسی عورت کو شوہر کے مکان میں رہنے کا حق ہوگا۔

د۔اگر نکاح فاسد اور وطی بالشبہ کی بناء پر عدت لازم ہوئی ہے تو جمہورفقہاء کے نزدیک اس عورت کو نفقہ نہیں ملے گا۔

۷۔سوگ منانا

قریبی رشتہ داروں کے انتقال پر عورت کے لئے تین دن کا سوگ منانا جائز ہے، جبکہ شوہر کے انتقال کی صورت میں چار ماہ دس دن وہ سوگ منائے گی، حضرت ام حبیبہؓ سے

منقول ہے کہ جب ان کے والد ابوسفیان کے انتقال کی خبر ملی تو انہوں نے تین دنوں تک انتظار کیا، اس کے بعد خوشبو منگوائی اور کہا:

والله مالی بالطیب من حاجة غیر انی سمعت رسول الله ﷺ یقول علی المنبر:لا یحل لامرة تومن بالله والیوم الآخر أن تحد علی میت فوق ثلاث لیال الا علی زوج أربعة أشهر وعشرا۔(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

سوگ منانے کا مطلب ہے زیب وزینت سے دوری اختیار کرنا، یعنی اس مدت میں جسمانی زیب وزینت اختیار کرنا اس کے لئے درست نہیں ہے۔

وفات کی عدت سوگ منانا ہے، کیونکہ شوہر جیسی نعمت اس سے چھن گئی ہے، اسی طرح طلاق بائن اور تین طلاق کی عدت میں سوگ منانا ہے، کیونکہ ان دونوں حالتوں میں شوہر سے علاحدگی پر افسوس کا اظہار مقصود ہے۔

فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ طلاق رجعی میں سوگ منانا درست نہیں ہے، کیونکہ طلاق رجعی میں نکاح باقی ہوتا ہے، لہذا شوہر کے رہتے ہوئے زیب وزینت سے دوری اختیار کرنا درست نہیں ہے۔

۸۔معتدہ کے بچہ کا نسب

فقہاء احناف کے نزدیک طلاق رجعی کی عدت میں ہونے والے بچہ کا نسب اس کے شوہر سے ثابت ہوگا بشرطیکہ چھ ماہ اور اس کے بعد بچہ کی ولادت ہوئی ہو، اسی طرح طلاق بائن اور عدت وفات میں پیدا ہونے والے بچہ کا نسب بھی ثابت مانا جائے گا۔

اگر عورت نے عدت کے مکمل ہونے کا اعلان کر دیا، اس کے بعد چھ ماہ کے اندر بچہ کی پیدائش ہوئی، تب بھی وہ بچہ ثابت النسب مانا جائے گا، اور یہ سمجھا جائے گا کہ عورت نے عدت کے ختم ہونے کے بارے میں جھوٹ کہا ہے۔

۹۔دوران عدت وارثت

طلاق رجعی کی عدت میں شوہر و بیوی میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تو دوسرا اس

کا وارث ہوگا، خواہ طلاق مرض کی حالت میں دی گئی ہو یا صحت کی حالت میں، کیونکہ نکاح کا رشتہ ابھی باقی ہے۔

طلاق بائن یا تین طلاق کا وقوع اگر صحت کی حالت میں ہوا ہے تو اس حالت میں عدت کے دوران زوجین میں کسی کا انتقال ہو تو دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے، کیونکہ اس طلاق سے نکاح کا رشتہ ختم ہو چکا ہے، لیکن اگر مرض کی حالت میں شوہر نے بیوی کو طلاق دیا، اور بیوی شوہر کے اس فیصلے سے متفق نہ ہو تو جمہور علماء کے نزدیک ایسی عورت اپنے شوہر کا وارث مانی جائے گی، کیونکہ یہ طلاق فار کا معاملہ ہے، جبکہ حضرت امام شافعی کے نزدیک وہ شوہر کے مال میں وراثت کی حقدار نہیں ہوگی۔(الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج۹ ص:۷۲۰۹)

۱۰۔عدت کے دوران شوہر کی حیثیت

طلاق بائن کی عدت میں شوہر کی حیثیت اجنبی کی ہوتی ہے، لہذا ایسے شوہر کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ بیوی کو دیکھے، اس کے ساتھ ایک کمرہ میں رہے، کیونکہ نکاح کا رشتہ مکمل ختم ہو چکا ہے، اب اگر آئندہ ساتھ رہنا ہو تو نئے مہر کے ساتھ نکاح کرنا ضروری ہے۔

البتہ طلاق رجعی کی عدت میں شوہر بیوی کے ساتھ رہ سکتا ہے، خلوت بھی ہو سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

نسب: شرعی نقطۂ نظر

مولانا مفتی مسعود حسن حسنی ندوی
(استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

آج کے اس پرآشوب دور میں جب کہ دنیا اپنے جملہ مادی اسباب ونظریات کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے، روز بروز نت نئی ایجادات کے ساتھ دوسرے پر سبقت لے جانے کی فکر میں لگی رہتی ہے اور سیاروں پر کمندیں ڈالنے میں اپنے ہم عصروں کو پیچھے چھوڑ رہی ہے لیکن دوسری طرف جاہلیت اختیار کرتی چلی جارہی ہے، اور ان جاہلی افکار ونظریات کا طوق اپنی گردنوں میں ڈالنے کا عزم مصمم کرچکی ہے، جس کو اس نے ۱۴ سو سال پہلے اپنی گردنوں سے نکال پھینکا تھا، آج جاہلیت نئے لباس میں ہمارے سامنے آچکی ہے۔

افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ جس چیز کی حفاظت کے لئے شریعت نے نہایت اہم اصول بنائے تھے اور اس میں ادنی سے ادنی پہلو کو اختیار کر کے انسان کی حیثیت اور اس کی بقاء کے لئے نسب کے ثبوت کو مدار قرار دیدیا تاکہ کوئی انسان بغیر نسب کے زندگی نہ گزارے، آج اسکی اہمیت کو بڑی بے باکی سے نظر انداز کیا جارہا ہے، عمدۃ الرعایۃ میں ہے:

اعلم أن هذه المسألة وكذا جميع مسائل النسب مبنية على أصلين مؤسسين بالكتاب والسنة :

أحدهما أن النسب مما يحتاط فى اثباته فيحتال له ،ولو بتأويل و استخراج صورة نادرة وثانيهما:أن لولد للفراش وللعاهر الحجر فاحفظ ذلك۔ (عمدة الرعاية ٦٥٧/٢ ،مطبوعه دارالحديث القاهرة)

حالانکہ نسب کی اہمیت ہر مذہب، ہر فرقہ اور ہر قوم میں یکساں رہی ہے، سماجی لحاظ سے بھی اس کو اہم مقام حاصل رہا ہے اور شرعی لحاظ سے بھی خاندانی نظام کی بنیاد نسب پر قائم ہے، نسب کی بنیاد پر رشتے جڑتے ہیں اور افراد ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں، صلہ رحمی کا جذبہ موجزن ہوتا ہے، قطع رحمی کا قلع قمع ہوتا ہے اور اسی کی بنیاد پر وراثت وولایت کے حقوق کی بجا آوری ہے۔

صالح فوزان لکھتے ہیں :

من هذا العرض السريع لأحكام لحوق النسب تدرك حرص الإسلام على حفظ الأنساب ،لما يترتب على ذلك من المصالح ،لصلة الارحام والتوراث والولاية وغير ذلك ،قال تعالىٰ يا أيهاالناس انا خلقناكم من ذكر وأنثىٰ وجعلنا كم شعوبا وقبائل لتعارفوا ۔ان أكرمكم عندالله أتقاكم ان الله عليم خبير، سورة الحجرات ١٣ ،فليس المقصود من معرفة الأنساب هو التفاخر والحمية الجاهلية وإنما المقصود به التعاون والتواصل والتراحم وفق الله الجميع لمايحبه ويرضاه۔(الملخص الفقهى :٤١٨)

اس طرح نسب کی بنیاد پر ایک صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے، محبت والفت کا جذبہ سینوں میں موجزن ہوجاتا ہے، شفقت ورحم دلی، ہمدردی ومساوات اور مواخات (بھائی چارگی) کا سیل رواں رگ وریشہ میں سرایت کرجاتا ہے، اسی لئے اللہ رب العزت نے اپنے ایک عظیم احسان کے طور پر اس کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا:

وهوالذى خلق من الماء بشرا وجعله نسباوصهراً وكان ربك قديرا۔ (سورةالفرقان ٥٤)

اللہ ہی تو ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا، پھر اس کو نسبی اور سسرالی رشتوں میں جوڑا اور تمہارا پروردگار تو ہر چیز پر قادر ہے۔

اس آیت کو سامنے رکھا جائے تو یہ امر پوری طرح واضح ہوجاتا ہے کہ شریعت

اسلامیہ نے نسب کی حفاظت کے لئے وہ اصول وضوابط مقرر کر دیئے ہیں جن سے اسلام میں بچہ کو صحیح النسب قرار دینے اور اسکی اہمیت کو اجاگر کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، تاکہ اس کو اپنے والدین کی جائز اولاد تسلیم کیا جاسکے اور معاشرہ میں انتشار و بداخلاقی نہ پھیلے، اسی وجہ سے نکاح فاسد، اور وطی بالشبہہ کو ثبوت نسب کے لئے حجت قرار دیا گیا، اور زبان نبوی سے یہ اصول بیان کر دیا گیا "الولد للفراش وللعاهر الحجر"۔

اس اہتمام کی وجہ سے ماں کو ملزم نہیں گردانا جاتا، فحشاء کی تہمت سے وہ بچ جاتی ہے، باپ کے لئے بھی اس کے بیٹے کا نسب محفوظ ہو جاتا ہے، اور بیٹا دوسرے کی طرف منسوب نہیں ہوتا اور ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے اور بچہ کے حقوق وواجبات سے کوئی پہلوتہی نہیں کرتا۔

اس سلسلہ میں شیخ زکریا البشری صاحب لکھتے ہیں:

صانت الشريعة الإسلامية الأنساب من الضياع ---وجعلت ثبوت النسب حقا للولد ،يدفع به عن نفسه -----وحقا لأمه تدرأبه الفضيحة والاتهام بالفحشاء ،وحقالأبيه يحفظ به نسبه وولده أن يضيع أو ينسب لغيره الخ ۔(الاحكام الأسياسية للأسرة الإسلامية فى الفقه والقانون ص: ۱۷۵)

اب آیئے ذرا معلوم کریں کہ نسب ہے کیا چیز؟ اور شریعت اسلامی میں اس کا تصور کیا ہے؟

لغوی طور پر باپ کی طرف انتساب کرنے کو نسب سے تعبیر کیا جاتا ہے، ابن سکیت کا کہنا ہے کہ نسب یا باپ کی طرف سے ہوگا یا ماں کی طرف سے ہوگا۔

اصطلاح میں اس تعلق کو کہتے جو دو انسانوں کے درمیان عقد شرعی کے نتیجہ میں تولد کے بعد اولاد کا اپنے والدین سے ہوتا ہے، ملاحظہ ہو مجموعہ قوانین مرتبہ ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن ص-۸۴۷ ودفعہ ۱۴۳-اس کو صاحب الموسوعۃ الفقہیہ نے کچھ اسطرح بیان کیا ہے:

نسبته إلى أبيه نسباً – والنسب فى الإصطلاح هو: القرابة وهى الإتصال بين إنسانين بالاشتراك فى ولادة قريبة أو بعيدة۔(الموسوعة الفقهية،ج ٤٠،ص:٢٣١)

اس کے مرادف الفاظ میں عصبہ کا لفظ ہے، عصبہ کا اطلاق مذکر اولاد پر ہوتا ہے:

والعصبة فى الاصطلاح عند الإطلاق، هم الذكور من ولد الميت و آبائه وأولادهم۔

نسب میں عمومیت ہے اور عصبہ میں تخصیص ہے، اس کے علاوہ دیگر وہ الفاظ جو مرادفات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، وہ نیچے ذکر کئے جارہے ہیں:

(۱) ولاء-آزادی کی بنیاد پر حکم شرعی کا تحقق ہونا

والولاء فى الاصطلاح هوثبوت حكم شرعى بالعتق أو تعاطى أسبابه۔

ولاء ونسب کے درمیان جو تعلق ہے، وہ وراثت کی بنیاد پر ہے کہ دونوں میں انسان وراثت کا حق دار ہوتا ہے۔

(۲) رحم، یعنی قرابت کا پایا جانا، ایسی رشتہ داری جس میں نہ فرضیت کا تحقق ہوتا ہے اور نہ ہی وہ عصبات میں شامل ہو، لیکن ان لوگوں کی عدم موجودگی میں وراثت کی حقداری ان کے لئے ثابت ہوتی ہو، نسب اور ان میں تعلق یہی ہے کہ دونوں میں ارث کا تحقق ہوتا ہے۔

(۳) مصاہرت: عورت کے گھر والے، اصطلاح میں کہتے ہیں، نکاح کی بنیاد پر جو قرابت حاصل ہوتی ہے، بیوی کی قرابت کی بنیاد پر اس کی بہنیں قرابت میں شامل ہو جاتی ہیں اور شوہر کی قرابت کی بنیاد پر دیوروں کا وجود ہوتا ہے، نسب اور مصاہرت میں جو تعلق ہے وہ اس بنیاد پر ہے کہ نسب کے بعض احکام مصاہرت میں بھی پائے جاتے ہیں۔

جس طرح نسب کی بنیاد پر کچھ رشتوں کو حرام قرار دیا گیا اسی طرح صہر کی بنیاد پر بھی بعض رشتوں کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

" و أخرج عبد بن حميد عن قتادةؓ " فجعله نسبا و صهرا،" قال: ذكر الله الصهر مع النسب وحرم أربع عشرة إمرأة: سبعا من النسب وسبعاً من الصهر، فاستوى محرم الله فى النسب والصهر" (الدر المنثور فى تفسير المأثور لأبى بكر السيوطىؒ ١٣٦/٥)

صاحب تفسیر البیضاوی" فجعله نسبا و صهرا،" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

أی قسمه قسمین ذوی نسب أی ذکورا ینسب إلیهم وذوات صهر أی اناثا یصاهر بهن کقوله تعالی(فجعل منه الزوجین الذکر والأنثی) تفسیر البیضاوی لعبد الله بن عمر بن محمد الشیرازی البیضاوی ۲/ ۱٤٤)

(۴) رضاعت: بچہ کا خاص مدت میں عورت کے دودھ کا پی لینا، نسب اور رضاعت کے درمیان جو تعلق ہے وہ یہ ہے کہ نسب کی بنیاد پر جو احکامات ثابت ہوتے ہیں ان میں سے بعض احکام رضاعت کی بنیاد پر بھی ثابت ہوتے ہیں جیسے نکاح کا حرام ہونا۔ (الموسوعۃ الفقہیہ، ۴۰/۲۳۳)

نسب سے متعلق احکام

نسب کے سلسلہ میں احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھا گیا، شریعت نے ادنی امکان کی بنیاد پر بھی نسب کو ثابت کیا ہے اور "الولدللفراش وللعاهرالحجر "کا ایسا اصول بنا دیا گیا ہے کہ کوئی شخص آسانی سے نہ اقرار کرے اور نہ انکار کرے، کیونکہ نسب کے ثبوت کی صورت میں شریعت کے احکامات کا تحقق ہوتا ہے اور کسی بھی انسان پر اس بات کو حرام قرار دے دیا گیا ہے کہ وہ کسی ایسے کو اولاد بنائے جو اس کی اولاد نہیں ہے اور اپنی اولاد کے اولاد ہونے کا انکار کرے، حدیث میں اس کی سخت ممانعت وارد ہوئی ہے:

"أیما رجل جحد ولده وهو ینظر الیه احتجب الله منه وفضحه علی رؤوس الأولین والآخرین یوم القیام"(اخرجه ابود اؤ د ۲/ ٦۹٥- ٦۹٦ ط حمص، الموسوعة الفقهیة،٤ /۲۳۲)

یہ چیز فعل قبیح کے دائرہ میں آتی ہے اور بدترین گناہ کے زمرہ میں اس کو شمار کیا گیا ہے، اس کے علاوہ متعدد روایات اس باب میں منقول ہیں۔

(۲) حقوق النسب: نسب کی بنیاد پر بہت سے حقوق متعلق ہوتے ہیں، باپ پر کچھ

احکامات کا لزوم ہوتا ہے، اسی طرح ماں کے بھی حقوق ہوتے ہیں، کیونکہ ماں کو اس کی بنیاد پر عار دلائی جاتی ہے اور وہ بہت کچھ اس کے لئے برداشت کرتی ہے، اور اسی طرح سے حق اللہ بھی اس سے متعلق ہوتا ہے کہ صلہ رحمی کرنا اللہ کے حکم کی بنیاد پر ہوتا ہے، اب اگر کوئی نسب کا انکار کردے جبکہ اس سے نسب متعلق ہو رہا ہو تو گویا کہ وہ ان تمام حقوق سے پہلوتہی کر رہا ہے، جو کہ گناہ کا باعث ہے۔

نسب کے اسباب

دو ہیں (۱) نکاح (۲) استیلاد- بعض لوگوں نے اس کو اس طرح ذکر کیا ہے کہ نکاح کے تین مراتب ہیں۔ یعنی نکاح کی بنیاد پر نسب کے ثبوت کے لئے جو فراش (زوجیت) پائی جاتی ہے وہ تین مراتب پر مشتمل ہوتی ہے۔

(۱) فراش قوی (۲) فراش متوسط (۳) فراش ضعیف، پہلی صورت میں ہر حال میں نسب کا ثبوت ہوگا الا یہ کہ باپ نسب کا انکار کرے تو ایسی صورت میں لعان کی صورت میں نسب کا ثبوت نہیں ہوگا، اور اگر لعان سے انکار کردے تو نسب اسی سے ثابت ہوگا۔

(۲) فراش متوسط یعنی عورت کا ام ولد ہونا، بغیر دعوی کے نسب کا ثبوت ہو جائے گا اور محض نفی کر دینے سے اس کی نفی کو معتبر مان لیا جائے گا۔

(۳) فراش ضعیف: دعوی کی بنیاد پر ہی نسب کا ثبوت ہوگا، وہ باندی ہے جس کے یہاں آقا سے کوئی اولاد نہ ہوئی ہو:

الفراش ثلاثة: قوی وهی المنکوحة فلا ینتفی ولدها إلا باللعان، متوسط: وهو فراش أم الولد فیثبت نسب ولدها من غیر دعوة. وینتفی بمجرد النفی ضعیف: لایثبت نسب الولد منه إلا بدعوة وهو فراش الأمة التی لم تثبت لها أمومیة الولد انتهی۔(کشاف اصطلاحات الفنون للعلامة محمد علی التهانوی ۲/۲۲۲)

مذکورہ تفصیل کو سامنے رکھنے کے بعد اگر ہم جائزہ لیں تو ہمارے لئے یہ امر بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ نسب کے ثبوت کا جو سب سے بنیادی اور قوی ضابطہ وکلیہ ہے وہ نکاح کا پایا جانا ہے، اور نکاح کا صحیح ہونا اس معاملہ میں لزوم کے درجہ میں نہیں، نکاح صحیح ہو یا فاسد ہو، نسب کا ثبوت صرف اسی پر منحصر نہیں ہے بلکہ شبہ کی بنیاد پر اگر وطی پائی جاتی ہے تو اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو نکاح صحیح یا فاسد کا ہوگا، اور اس میں ضابطہ اور کلیہ وہی روایت ہے۔"الولد للفراش وللعاهر الحجر" فراش سے مراد زوجیت کا پایا جانا ہے، نکاح کی بنیاد پر نسب کے صحیح ہونے کے لئے چند بنیادی شرطیں ہیں:

(۱) شوہر اس عمر کا ہو جس سے عادتاً حمل قرار پا سکتا ہو یعنی یہ کہ بالغ ہو، مالکیہ و شافعیہؒ کے یہاں کم از کم نو سال کا ہونا ضروری ہے، اس سے کم پر بلوغ کا تحقق نہیں ہوگا، احناف کے یہاں ۱۲ سال کی عمر میں بلوغ کا تحقق ہوگا، حنابلہ کے یہاں دس سال کی عمر بلوغ کے لئے معتبر ہے، حنفیہ کا ایک قول یہ ہے کہ علامت بلوغ میں سے کسی علامت کے پائے جانے کی صورت میں بلوغ کا تحقق ہوجائے گا عمر کی قید نہ ہوگی۔

(۲) ثبوت نسب کے لئے امکان وطی سے کم از کم چھ ماہ کی مدت کا ہونا شرط ہے جمہور ائمہ کے نزدیک، احناف کے نزدیک نکاح کے بعد چھ ماہ کا گزرنا کافی ہے، اور چھ ماہ سے کم میں بچہ کی پیدائش ہوتی ہے تو بچہ ثابت النسب نہ ہوگا، بلکہ یہ سمجھا جائے گا کہ بچہ نکاح سے پہلے کا ہے کیونکہ مدت حمل کم از کم ۶ ماہ ہے اور زیادہ سے زیادہ احناف کے یہاں دو سال ہے بعض ائمہ کے یہاں پانچ سال، اور بعض کے یہاں چار سال ہے۔

(۳) عقد نکاح کے بعد بیوی اور شوہر کے ملنے کا امکان ہو، لہذا ان تمام صورتوں میں نسب کو ثابت مانا جائے گا، کیونکہ یہ فراش قوی کے دائرہ میں آتا ہے، ہاں اگر مجلس عقد ہی میں طلاق دے دیتا ہے اور عقد زواج کے وقت وہ دونوں اتنی دور ہیں جن میں کسی بھی طرح ملاقات کا امکان نہیں ہے تو جمہور ائمہ کے نزدیک نسب کا ثبوت نہ ہوگا، لیکن احناف ایسی صورت میں بھی نکاح کی بنیاد پر نسب کے ثبوت کے قائل ہیں:

وعند الحنفية يلحقه، لأن عقد الزواج الصحيح عندهم كاف فى ثبوت النسب حتى لولم يلتقيا (الموسوعة الفقهية ، ٤٠/ ٢٣٥)

جہاں تک عقد فاسد کی بنیاد پر نسب کے ثبوت کا تعلق ہے تو اس میں مرد وزن کے درمیان جنسی تعلق کا پایا جانا شرط ہے۔ اگر دخول نہ پایا جائے تو نسب ثابت نہ ہوگا، اس لئے کہ نسب کے معاملہ میں بچہ کی بقاء کے لیے احتیاطی پہلو کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔

اب معاملہ یہ آتا ہے کہ جس طرح نکاح صحیح میں نکاح کے بعد سے چھ ماہ کی مدت کا اعتبار کیا جاتا ہے کیا نکاح فاسد میں بھی ایسا ہی ہے یا کچھ فرق ہے؟ تو بعضوں نے نکاح صحیح پر قیاس کرتے ہوئے یہی بات کہی ہے، لیکن امام محمد نے میاں بیوی کے ملاپ کے وقت سے چھ ماہ کی مدت کا اعتبار کیا ہے، اس لئے کہ نکاح فاسد وطی کے قائم مقام نہیں ہوتا ہے، برخلاف نکاح صحیح کے وہ وطی کے قائم مقام ہوتا ہے اور امام محمد کا قول راجح ہے۔ (ایضاً، ملاحظہ ہو الموسوعۃ الفقہیہ)

وطی بالشبہہ یعنی اجنبی مرد کا کسی عورت کے ساتھ بیوی کے شبہہ میں جنسی تعلق قائم ہونا تو اس سے بھی نسب ثابت ہوگا، کیونکہ وطی بالشبہہ کو تحری کے قائم مقام مانا ہے اور تحری کا پایا جانا حکم کے اثبات میں مانع نہیں ہے، مثال کے طور پر کسی نے کسی عورت سے اس شبہہ میں وطی کرلی کہ وہ اس کی بیوی ہے یا اس کی باندی ہے یا تین طلاق دی پھر کسی مفتی نے اس کے ایک ہونے کا فتوی دیا، اس کی بنیاد پر اس نے اس سے وطی کرلی اور اس وطی کی بنیاد پر چھ ماہ کے بعد بچہ پیدا ہوجاتا ہے تو وہ ثابت النسب مانا جائے گا۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ زنا کی بنیاد پر نسب کا ثبوت نہ ہوگا، کیونکہ زنا حرام ہے اور اولاد نعمت ہے اور نعمت کا حصول حرام ذریعہ سے ممکن نہیں ہے۔

نسب کے ثبوت کا دوسرا سبب استیلاد ہے، جس کے لغوی معنی لڑکے کا طلب کرنا ہے اور اصطلاح میں کہتے ہیں کہ جاریہ ام ولد ہوجائے، احناف کے یہاں یہ فراش متوسط کے دائرے میں مانا گیا ہے کہ شوہر کے اقرار کے بعد ہی وہ ام ولد ہوگی اور بچہ کا نسب اس سے

ثابت مانا جائے گا اورنسب کے ثابت ہونے کی صورت میں بہت سے شرعی احکام ان دونوں سے متعلق ہوں گے۔

ثبوت نسب کی صورتیں

ثبوت نسب کے اسباب کے بعد اب ثبوت نسب کی صورتیں ذکر کی جاتی ہیں:

ا۔ان میں سب سے پہلی صورت نکاح کی ہے جس کو فراش سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے فراش کے لغوی معنی وطی کے ہوتے ہیں اور اصطلاح میں فراش کا اطلاق منکوحہ پر ہوتا ہے اس کی بنیاد حدیث "الولد للفراش وللعاهر الحجر "پر ہے۔

احناف کے یہاں نسب ثابت ہونے کے لئے فراش کا ہونا کافی ہے، دیگر حضرات کے یہاں امکان التلاقی کی بنیاد پر ہی نسب ثابت ہوگا۔

۲۔دوسری صورت اقرار کی ہے، یہ اقرار کریں کہ بچہ میرا ہے، اس کے ذریعہ نسب ثابت ہونے کی متعدد شرطیں ہیں:

الف۔جس کے بارے میں اقرار کیا جارہا ہے وہ معروف النسب نہ ہو اور اگر وہ معروف النسب ہے تو اقرار باطل قرار دیا جائے گا۔

ب۔اقرار کرنے والا ایسی عمر میں ہو کہ اس سے بچہ کی پیدائش ممکن ہو۔

ج۔ بچہ عاقل و بالغ ہو، احناف کے نزدیک ممیّز ہو کہ وہ اقرار کرنے والے کی تصدیق کرسکتا ہو۔

د۔ یہ ظاہر نہ ہو کہ اقرار کرنے والا کسی قسم کا نفع حاصل کرنا چاہتا ہے یا اقرار سے کسی نقصان سے بچنا چاہتا ہے مثلاً کوئی مالدار مرے اس کے بارے میں کوئی دعوی کرے کہ وہ میرا بیٹا ہے تو اس کی بات نہیں مانی جائے گی۔

ہ۔تیسری صورت بینہ کی ہے: نسب ثابت ہونے کی تیسری صورت یہ ہے کہ اس پر بینہ یعنی دعوی نسب پر ثبوت پیش کیا جائے، جمہور فقہاء کے نزدیک دو عادل مردوں کی

شہادت کا اعتبار کیا جائے گا، احناف کے نزدیک دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت معتبر ہوگی۔

و۔نسب کے معروف ہونے کا شہرہ ہو، ہر شخص اس کو معروف النسب سمجھتا ہو اور اس کے نسب کی بات اتنی مشہور ہو کہ انکار کی گنجائش نہ ہو۔

ز۔جمہور فقہاء نے قیافہ کی بنیاد پر نسب کو ثابت کیا ہے جبکہ کسی قسم کا تعارض نہ ہو اور نسب کے عدم ثبوت کے سلسلہ میں کوئی راجح دلیل نہ ہو، اس سلسلہ میں حضرت زید بن حارثہ کے واقعہ کو حجت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، احناف اس کو حجت شرعی کے دائرہ میں نہیں مانتے ہیں۔

ح۔حمل کی مدت کم سے کم چھ ماہ پر محیط ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ احناف کے نزدیک دو سال پر محیط ہے، شوافع، حنابلہ و مالکیہ کے نزدیک چار سال کی مدت پر محیط ہے اور حنابلہ کا ایک قول دو سال کا اور مالکیہ کا ایک قول پانچ سال کا بھی ہے۔(ملاحظہ ہو الموسوعۃ الفقہیہ ۴۰/۲۳۷ تا ۲۴۰)

زنا کی بنیاد پر نسب کا ثبوت ہوگا یا نہیں؟

فقہاء کا کہنا ہے کہ زنا کی بنیاد پر نسب کا ثبوت نہیں ہوگا کیونکہ نسب کا تعلق کرامت پر مبنی ہوتا ہے اور زنا میں اہانت پائی جاتی ہے، لہذا دونوں کو یکجا نہیں کیا جاسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بنیاد پر نسب ثابت نہیں فرمایا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "الولد للفراش وللعاهر الحجر " کا ذکر کرکے اس کی نفی کردی ہے۔

اس اصول سے یہ ثابت ہوگیا کہ عورت اگر بغیر شوہر کی ہے تو اس کے بطن سے پیدا ہونے والے بچہ کا نسب اسی عورت سے متعلق ہوگا اور ساری ذمہ داریاں اسی عورت سے متعلق ہوں گی، اس کا وہ وارث بھی بنے گا اور اگر وہ شوہر والی ہے اور شوہر اس لڑکے یا لڑکی کا منکر نہیں ہے تو اسی سے اس کا نسب ثابت ہوگا اور سارے حقوق حتی کہ وراثت کے

معاملات سب اسی کی طرف لوٹیں گے، وہ لڑکا اپنے ماں کے شوہر کی اولاد قرار دیا جائے گا، ایک سوال کے جواب میں مفتی کفایت اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں: وہ اس شخص کا لڑکا ثابت النسب نہ ہوگا، اگر خوشدامن کا خاوند ہو تو اس کی طرف منسوب ہوگا، ورنہ وہ لدالزنا قرار پائے گا، صرف ماں سے اس کا نسب ثابت ہوگا (کفایت المفتی: جلد۵/۲۵۹)

اقرار کے علاوہ اور کن کن چیزوں کا اعتبار کیا جائے گا اس کی تفصیل آگے آئے گی لیکن اقرار کی کیا کیا نوعیتیں ہیں اور کیا تفصیلات ہیں، اس کی مختصر وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

نسب کے علم ہونے کی صورت میں اقرار وجوب کے درجے میں ہے اور عدم علم کی صورت میں اقرار حرام ہے، اقرار کی بنیاد پر نسب ثابت ہو جاتا ہے، اس پر تمام علماء وفقہاء کا اتفاق ہے لیکن تفاصیل کے سلسلے میں اختلافات ہیں۔

حنفیہ کے نزدیک اقرار بالنسب دو نوعیّتوں پر مبنی ہے:

(۱) وارث کے سلسلے میں اقرار کرنا۔

(۲) وارث کا اقرار اپنے مورث کے سلسلے میں۔

اس کی تفصیلات کے لیے الموسوعۃ الفقہیہ ۴۰/۲۴۰ تا ۲۴۹

اقرار کرنے کے بعد اپنے اقرار سے رجوع جائز نہیں ہے

لقیط کا کیا حکم ہے؟

لقیط کے نسب کے سلسلہ میں فقہاء کا کہنا ہے کہ جس سے وہ اپنا نسب ثابت کرنا چاہتا ہے، اگر وہ مسلمان وآزاد ہے اور نسب کے ثابت ہونے کا امکان ہے تو اس سے اس کا نسب جوڑ دیا جائے گا۔

سابق میں جو صورتیں ذکر کی گئی ہیں، ان کے علاوہ بھی فقہاء اور علماء نے نسب کے ثبوت کے لیے کچھ چیزوں کا اعتبار کیا ہے، ان میں سے ایک چیز قرعہ اندازی ہے، جمہور

فقہاء نے قرعہ کو نسب کے ثبوت کے لیے معتبر نہیں مانا ہے، البتہ ضرورتاً سماع کی شہادت کی بنیاد پر ثبوت نسب کو معتبر مانا ہے۔

احناف کے نزدیک اگر خبر کو روایت کرنے والی ایک بڑی جماعت ہو تو اس کی بنیاد پر نسب ثابت مانا جائے گا۔

اور اسی طرح کسی کے نسب کی شہرت ہو اور اس شہرت کی کوئی گواہی دے تو اس کی شہادت کا اعتبار کیا جائے گا۔

الشهادة بالشهرة فی النسب وغیره بطریقتین الحقیقیة والحکمیة۔ (الفتاوی الهندیة، ج۳، ص:۴۵۸)

قال المالکیة الشهادة علی السماع عند مالك وأصحابه جائزة فی النسب المشهور.....واشترط الشافعیة الاستفاضة ایضاً.....وذکر النووی ان مما تجوز فیه الشهادة بالتسامع وهو الاستفاضة النسب۔(الموسوعة الفقهیة، ج۴۰/۲۵۰)

ویوافق الحنابلة الشافعیة کذلك فی اشتراط العدد أو الاستفاضة بالنسبة للنسب۔(الموسوعة الفقهیة، ج۴۰/۲۵۱)

اسی طرح نسب کے ثبوت کے لیے دعوی کا پایا جانا اس وقت ضروری ہوگا جب کہ شہادت کا مطالبہ ہو۔

فذهب الحنفیة والحنابلة والشافعیة فی مقابل الصحیح الی ان الشهادة علی النسب لا تقبل من غیر دعوی ووجه ذلك ان النسب حق لآدمی وحقه لا تقبل فیه شهادة الحسبة۔((الموسوعة الفقهیة، ج۴۰، ص:۲۵۳)

اسی طرح قاضی کے فیصلے کو بھی حکم کے درجہ میں رکھا گیا ہے، نسب میں بعضوں نے تحکیم کا اعتبار کیا اور بعضوں نے نہیں کیا ہے، تحلیف (قسم کھلانا)، نسب کے سلسلے میں حنفیہ مالکیہ اور حنابلہ نے تحلیف کا اعتبار نہیں کیا امام ابو یوسف محمد نے تحلیف کو معتبر مانا ہے۔

نسب کے ثبوت کے بعد بہت سے شرعی احکامات کا لزوم ہوتا ہے:

(۱) نفقہ: نفقہ کا ثبوت ہونا اس کی تفصیلات ہیں لزوم نفقہ کے سلسلے میں فقہاء متفق ہیں۔

(۲) قصاص کا سقوط، جمہور کا کہنا ہے کہ باپ سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔

(۳) نسب کا ثبوت بہت سے معاملہ میں ولایت کا سبب بنتا ہے، ولی ہونے کی صورت میں نکاح کرانا، قصاص کی ادائیگی کروانا اور مال پر تصرف کا اختیار ہونا وغیرہ کا حق ہوگا۔

(۴) وراثت کا سبب بنے گا، فقہاء کا اتفاق ہے کہ وارث مورث کے مال کا حقدار ہوگا۔

(۵) نسب کی بنیاد پر نکاح حرام ہوگا اور اس میں تقریباً ۱۲/ رشتے ملتے ہیں جس میں سات رشتے نسب کی بنیاد پر حرام ہیں جن کا ذکر قران مجید کی آیت حرمت علیکم أمهاتكم الخ (سوره النساء ۲۳)

اور پانچ سے رشتہ صہری بنیادوں پر حرام ہے:

والصهر خمسة اصناف ذكروا فى قوله "وامهاتكم التى ارضعنكم" الى قوله" وحلائل ابنائكم الذين من اصلابكم "النساء/۲۳ (احكام القران للجصاص ۳/ ٤٤٢)

کفاءت میں نسب کا اعتبار ہوگا

اس سلسلے میں علماء وفقہا کے درمیان اختلاف ہے، بعضوں نے اس کا اعتبار کیا اور بعضوں نے اعتبار نہیں کیا ہے، احناف نسب کے سلسلے میں کفاءت کو معتبر مانتے ہیں، فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

أحدها النسب وفى الخانية: لا خلاف فيها بيننا واعلم بان الناس طبقات ثلاثة قريش والعرب والموالى۔

اس پر طویل بحث کی گئی ہے، دلائل سے معتبر ماننے والے حضرات نے اس کو واضح کیا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتاوی تاتارخانیہ ۴/۱۳۱، خلاصۃ الفقہاء باب الکفاءۃ

اور مولانا عبید اللہ اسعدی کے جدید فقہی مباحث ۲۴۶/ جلد ششم تا ۲۵۸ ملاحظہ ہو)

کفاءت نسبی کو شریعت نے معتبر مانا ہے، ہاں فخر ومباہات سے منع کیا ہے، آیات وروایات جن کے ذریعے امت کا ایک طبقہ کفاءت نسبی کو معتبر نہیں مانتا ہے، وہ تفاخر بالنسب کے ناپسندیدگی کو بتاتا ہے، صاحب روح المعانی روایات کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وقد دلت على انه لا ينبغى التفاخر بالانساب۔ (ملاحظہ ہو جدید فقہی مباحث جلد ۶/ص ۲۶۰)

لعان کی بنیاد پر نسب کی نفی کر دی جائے گی اور شوہر سے لعان کے بعد نسب ثابت نہیں کیا جائے گا، ایسی صورت میں بچہ کا نسب بچہ کی ماں سے ثابت کیا جائے گا اور ماں پر ہی اس بچہ کا نفقہ واجب ہوگا اور دیگر شرعی معاملات میں وہ اسی کے تابع مانا جائے گا۔

اسی طرح اگر نسب کا اقرار کر لیا اور اقرار کے سلسلے میں اس کی جانب سے کوئی دلیل پالی گئی مثلاً خبر دینے کی صورت میں اس نے خاموشی اختیار کی یا دعا پر آمین کہی وغیرہ تو پھر وہ اپنے اقرار سے پھر نہیں سکتا اور اس سے اس کا نسب ثابت مانا جائے گا۔

اسی طرح انکار کرنے کی صورت میں اگر فراش قوی ہو اور عورت اس کی تصدیق بھی کر دے تب بھی نسب معتبر مانا جائے گا کیونکہ نفی نسب کے لیے لعان ضروری ہے جو یہاں نہیں پایا جا رہا ہے۔

اب اخیر میں مجموعہ قوانین اسلامی میں جو دفعات ثبوت نسب کے لیے ذکر کی گئی ہیں ان کو نقل کر دینے پر اکتفاء کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

(۱) حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ ہے اور زیادہ سے زیادہ مدت دو سال ہے، اس دوران اگر بچہ کی پیدائش ہوتی ہے وہ بچہ ثابت النسب مانا جائے گا۔

(۲) چھ ماہ سے کم مدت میں نکاح صحیح کے بعد اگر بچہ کی پیدائش ہوگی تو وہ بچہ شوہر سے ثابت النسب نہ ہوگا، پورے چھ ماہ یا اس سے زائد مدت میں اگر بچہ کی پیدائش ہوتی ہے وہ ثابت النسب ہوگا، اور اس سلسلہ میں شوہر کے دعوی کی ضرورت نہیں ہے، ہاں اگر

شوہر اس بچہ کا انکار کرتا ہے تو بغیر لعان کے بچہ کی نفی معتبر نہ ہوگی، لعان کی صورت میں بچہ کا نسب اس عورت کے شوہر سے ثابت نہ ہوگا۔

(۳) نکاح فاسد میں وطی کے دن سے چھ ماہ یا زائد کی مدت نسب کے معتبر ہونے کے لئے ضروری ہے اور بچہ کے ثابت ہونے کے لئے شوہر کا دعویٰ ضروری نہیں ہے۔

(۴) وطی بالشبہہ میں چھ مہینہ یا زائد پر بچہ پیدا ہو تو بچہ کے ثابت النسب ہونے کے لئے وطی کرنے والے کے لئے دعوی کرنا ضروری ہوگا، ورنہ بچہ ثابت النسب ہوگا۔

(۵) اگر معتدہ رجعیہ کو عدت گزر جانے کے اقرار سے پہلے بچہ پیدا ہو تو وہ بچہ ثابت النسب قرار پائے گا اگر چہ کہ بچہ دو سال کے بعد ہی پیدا ہو، اور اگر عورت نے عدت گزر جانے کا اقرار کر لیا اور اس کے بعد چھ مہینہ کے اندر بچہ پیدا ہو تو وہ ثابت النسب ہوگا ورنہ نہیں۔

(۶) مطلقہ بائنہ یا مغلظہ کو اگر بعد طلاق چھ مہینہ سے کم میں بچہ پیدا ہو تو وہ بھی ثابت النسب ہوگا، چھ مہینہ کے بعد دو سال کے اندر بچہ پیدا ہوا اور عورت نے عدت گزرنے کا اقرار نہ کیا ہو تو بھی بچہ ثابت النسب ہوگا، اسی طرح اگر دو سال پر یا دو سال کے بعد بچہ پیدا ہوا اور عورت نے عدت گزرنے کا اقرار نہ کیا ہو اور شوہر دعوی کرے تو بچہ کا نسب ثابت ہوگا ورنہ نہیں۔

(۷) اگر شوہر کی وفات کے بعد چھ مہینہ کے اندر بچہ پیدا ہو تو وہ ثابت النسب ہوگا اور اگر دو سال کے اندر پیدا ہوا اور اس نے عدت گزرنے کا اقرار نہ کیا ہو، یا اقرار کر لیا، مگر اقرار کے بعد چھ مہینہ گزرنے سے پہلے ہی بچہ پیدا ہو تو وہ ثابت النسب ہوگا ورنہ نہیں۔ (خلاصہ مجموعہ قوانین اسلام)

حوالہ جات:

۱۔ ملاحظہ ہو، ہدایہ باب ثبوت النسب

۲۔ ردالمحتار

۳۔ البحر الرائق

۴۔ بدائع الصنائع

۵۔ فتاوی ہندیہ

۶۔ خلاصۃ الفقہاء ۲۶۷ تا ۲۷۵

۷۔ فتاوی تاتارخانیہ ج ۴/۱۳۱ تا ۱۳۳

۸۔ مجموعہ قوانین اسلام مرتبہ ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب -نسب اولاد، اکیسواں باب)

۹۔ کفایت المفتی ج ۵/۲۴۵ تا ۲۶۱

۱۰۔ الموسوعۃ الفقہیۃ: ۴۰/۲۳۱ تا ۲۵۶

۱۱۔ فتاوی تاتارخانیہ: ج ۱۰/۲۱۱ تا ۲۱۸ - ج: ۱۲/۲۵۹ تا ۲۷۲

۱۲۔ الاحکام الاساسیۃ للأسرۃ الاسلامیۃ فی الفقہ والقانون ۱۷۵ تا ۱۹۲

۱۳۔ فتاوی ابن تیمیہ ج ۳۴

۱۴۔ بچوں کے احکام مسائل۔ مرتبہ: مولانا فیصل احمد بھٹکلی

۱۵۔ جدید فقہی مباحث: ۶/مولانا عبیداللہ اسعدی صاحب زید مجدہ

۱۶۔ جدید فقہی مسائلؒ ج ۴/مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب زید مجدہ

۱۷۔ الملخص الفقہی۔ شیخ صالح فوزان

۱۸۔ تفسیر البیضاوی۔ عبداللہ بن عمر بن محمد الشیر ازی البیضاوی

۱۹۔ الدر المنثور فی تفسیر الماثور۔ ابوبکر السیوطی

۲۰۔ کشاف اصطلاحات الفنون۔ علامہ محمد تھانوی

ہبہ: شرعی نقطہ نظر

مولانا شمیم احمد ندوی
(استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء)

ہبہ کی لغوی تعریف

ہبہ لغت میں دوسرے کو بلاعوض کوئی چیز دینے کو کہتے ہیں، خواہ مال ہو یا مال کے علاوہ کوئی دوسری چیز یا نعمت، چنانچہ کہا جاتا ہے: وهب له مالا وهباً وهبة اُس نے فلاں کا مال ہبہ کیا، اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کسی کو ولد صالح کی نعمت سے نوازا تو کہا جاتا ہے: "وهب الله فلاناً ولد اًصالحاً" اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فلان کو ولد صالح عطاء فرمایا اسی معنی میں قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیتیں نازل ہوئی ہیں:

۱۔فهب لی من لدنك ولیا یرثنی۔(مریم :٥)

۲۔ ووهبنا له اسحٰق ویعقوب۔(مریم:٤٩)

۳۔ ربنا هب لنا من أزواجنا وذریاتنا قرّة أعین۔(فرقان:٧٤)

صاحب مفرداتِ اُلفاظ القرآن علامہ راغب الاصفہانیؒ المتوفی ۴۲۵ھ نے ھبۃ کی لغوی تعریف اس طرح کی ہے:

الهبة أن تجعل ملكك لغیرك بغیر عوض۔(مفرادات لالفاظ القرآن)

اصطلاحی تعریف

اصطلاح میں بعض فقہا نے ہبہ کی تعریف یہ کی ہے: "ہبہ فی الحال بلاعوض کسی غیر کو اپنے

مال کا مالک بنا ہے" (موسوعۃ الفقہیہ ج ۴۴ص ۱۳۹، تکملہ شرح فتح القدیر لابن الھمام الحنفی)

دکتور وھبہ زحیلی نے ہبہ کی تعریف اس طرح ہے:

"الهبة فی الاصطلاح الشرعی بلا عقد یفید التملیك بلا عوضٍ حال الحیاة تطوعاً"(الفقه الاسلامی وأدلته لوهبه زحیلی ج٤/ ٦٧٧)

اور امام نوویؒ المجموع میں ہبہ کی شرعی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"الهبة شرعاً: تملیك لعین بلا عوض فی حال الحیاة تطوعاً"(المجموع جلد ١٦ ص٢٦٦)

ہبہ کے قریب المعانی کلمات

موسوعۃ فقہیہ میں ابن قدامہ کا یہ قول منقول ہے کہ:

ہبہ، صدقہ، ہدیۃ اور عطیہ کے معانی ایک دوسرے سے قریب تر ہیں، ان سب میں مشترک معنی ہے زندگی میں بغیر عوض کے غیر کو اپنے مال کا مالک بنانا، "اور لفظ "عطیہ" بطور خاص سب کو شامل ہے، ہبہ کے قریب المعنی ایک لفظ "وقف" بھی ہے، لیکن وقف وہبہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ وقف عین (مال کی ذات) کو اللہ تعالیٰ کی ملک میں باقی رہنے دینے کے ساتھ غیر کو منفعت کا مالک بنانا ہے، چنانچہ اس میں تصرف جائز نہیں ہوتا، جبکہ "ہبۃ" میں عین (مال کی ذات) غیر کو مالک بنانا ہے اس لیے "موھوب لہ" کو پورا اختیار ہوتا ہے کہ اس میں جس طرح چاہے تصرف کرے۔ (الموسوعۃ الفقہیۃ، جلد ۴۴ص ۱۲۸)

مذکورہ کلمات اور ہبۃ میں ربط وفرق

۱۔عطیہ: لغت میں عطیہ اس بخشش کو کہتے ہیں جو بلاعوض دی جائے اور اسکی جمع "عطایا" ہے۔

اصطلاح میں "عطیہ" ہبۃ ہی کی طرح ہے البتہ وہ (عطیہ) ہبہ، صدقہ اور ہدیہ سے عام ہے، اسلئے مہر کو بھی عطیہ کہا جاتا ہے۔ (المعجم الوسیط والمفردات للراغب)

ربط وفرق: ہبہ اور عطیہ میں ربط یہ ہے کہ ان دونوں میں عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے، چنانچہ عطیہ عام ہے اور ہبہ اسکی ایک خاص قسم ہے۔

۲۔ ہدیۃ: ہدیہ لغت میں ''ھد ی'' سے ماخوذ ہے، کہا جاتا ہے ''أھدیت الھدیة إلی فلان أو لفلان'' اور مفہوم ہوتا ہے کسی کو اعزازاً اور اکراماً ہدیہ اور تحفہ دینا (المعجم الوسیط)

اصطلاح میں: ہدیہ وہ مال ہے جو کسی کے اکرام کے لئے ہدیہ اور تحفہ کے طور پر اسکو دیا جائے (المفردات للراغب، المعجم الوسیط)

ربط وفرق: ہبہ اور ہدیہ میں ربط یہ ہے کہ دونوں میں بلاعوض زندگی میں کسی کو مالک بنانا ہے، البتہ اکثر فقہاء کے نزدیک ہبہ میں قبول کرنا رکن لازم ہے اور ہدیہ میں یہ لازم نہیں۔

۳۔ صدقہ: صدقہ لغت میں عطیہ، خیرات اور مہر کو کہتے ہیں، قرآن پاک میں ہے ''واتوا النساء صد قاتھن نحلة'' اور کہا جاتا ہے ''تصدقت فلانا و بکذا'' فلاں شخص کو میں نے بطور صدقہ (خیرات) کوئی چیز دی۔

ہبہ شریعت کی اصطلاح میں

ہبہ ثواب اور اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے کے لئے بلاعوض کسی کو مال کا مالک بنانا (المعجم الوسیط، المفردات للراغب، موسوعۃ فقہیہ ج ۴۴ ص ۱۳۹ و ۱۴۰)

ربط وفرق: صدقہ اور ہبہ میں ربط یہ ہے کہ دونوں بلاعوض دیئے جانے والے عطیات میں سے ہیں اور فرق یہ ہے کہ ''صدقہ'' آخرت کا ثواب حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے جبکہ ''ہبہ'' عام طور پر اظہار محبت کے لئے ہوتا ہے، اور دوسرا فرق یہ ہے کہ ''ہبہ'' میں قبول کرنا رکن لازم ہے، جبکہ بعض فقہاء کے نزدیک صدقہ میں قبول کرنا لازم نہیں ہے (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ج ۴ ص ۲۷۷ موسوعۃ فقہیۃ: ج ۴۴ ص ۱۴۰)

ہبہ کی مشروعیت

ہبہ کتاب اللہ، سنت اللہ اور اجماع کی رو سے مشروع ہے (یعنی ان تینوں سے ہبہ

ثابت ہے)، کتاب اللہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

''فإن طبن لکم عن شئی منه نفساً فکلوه هنیئا مریئاً'' (نساء: ٤)

ترجمہ: اگر وہ خوشدلی سے تمہارے لئے اس میں کا کوئی جز چھوڑ دیں تو تم اسے مزیدار اور خوشگوار سمجھ کر کھاؤ۔

اور سورۃ مائدہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وتعاونوا علی البر والتقویٰ'' (سورہ مائدہ: ۲)

اس آیت کریمہ میں مؤمنوں کو آپس میں تقویٰ اور نیکی کے کاموں میں تعاون کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ''ہبہ'' ایک بڑی نیکی ہے، اس لئے کہ باہم الفت ومحبت کا یہ ایک سبب ہے۔ اور سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۷ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے 'واتی المال علی حبه' اللہ تعالیٰ کی محبت میں مال تقسیم کرے (کشاف والبیضاوی، ماجدی) اور اس مال سے مراد صدقہ اور ہبہ ہے۔

احادیث میں ہبہ کا ذکر

۱۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ''تھادوا تحابوا'' (الأدب المفرد للبخاری، ص ۱۵۵) ایک دوسرے کو ہدیہ دو آپس میں محبت پیدا ہوگی، یہاں ہدیہ سے مراد ہبہ ہی ہے۔

۲۔ نیز نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''لا تحقرن جارة لجارتها ولو فرسن شاة'' (صحیح مسلم ج ۲ / ۱۴۷)

کوئی پڑوسن کسی پڑوسن کی کسی چیز (ہدیہ) کو حقیر نہ سمجھے اگرچہ بکری کا کھر ہی ہو۔

۳۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''العائد فی هبته کا لکلب یقیئی ثم یعود فی قیئه'' (صحاح ستہ عن ابن عباسؓ)

کوئی چیز کسی کو ہبہ کرکے لوٹانے والا اس کتے کی مانند ہے، جو قے کرکے پھر اپنی قے لوٹ کر دوبارہ کھالے۔

٤۔"عن عائشة أن النبی صلی الله علیه وسلم کا ن یقبل الهدیة ویثیب علیها" (ترمذی ج۲ص۴۸)

ہبہ پر اجماع

ہبہ کے تمام اقسام کے جائز اور مشروع ہونے بلکہ اس کے مستحب ہونے پر اجماع ہے، اسلئے کہ یہ لوگوں کے مابین الفت ومحبت کی اشاعت اور بھلائی، نیکی اور تقوی پر تعاون کا بہت اہم ذریعہ وسبب ہے، اور یہ صلہ رحمی کا بھی باعث ہے، اس سے آپس کی بغض وعداوت دور ہوتی ہے امام مالکؒ نے موطا: "باب ماجاء فی ا لمهاجرة" میں یہ حدیث روایت کی ہے:

وعن عطاء الخراسانیؒ قال : قال رسول الله صلی الله علیه وسلم "تصافحوا یذهب الغل، وتهادوا تحابوا وتذهب الشحناء"

مصافحہ کیا کرو کینۂ دل دور ہوجائیں گے اور آپس میں ہدیہ وہبہ کا معاملہ ایک دوسرے سے کرو ہو باہم محبت پیدا ہوگی اور بغض وعداوت زائل ہوتے رہیں گے۔

اور امام ترمذیؒ نے "باب ماجاء فی حث النبی صلی الله علیه وسلم علی الهدیة" کے ضمن میں نقل کیا ہے:

عن أبی هریرةؓ عن النبی صلی الله علیه وسلم قال : تهادوا فإن الهدیة وحرالصدور ولا تحقرن جارة لجارتها ولو شق فرسن شاة۔

باہم ہدیہ دیا کرو اسلئے ہدیہ (ہبہ) سینہ کے کینہ کو دور کرتا ہے، اور ہرگز معمولی نہ سمجھے کوئی پڑوسن کسی پڑوسن کے ہدیہ (ہبہ) کو چاہے بکری کے کھر کا ایک ٹکڑا ہی ہو۔

ہبہ کا حکم شرعی

ہبہ بالاجماع مندوب ہے اپنے جملہ شرائط اور براہین کی بنیاد پر، البتہ کبھی کبھی ایسی باتیں پیش آجاتی ہیں جو اس مندوب عمل کو حرام بنادیتی ہیں مثلاً ہبہ کا مقصد اگر معصیت ہو،

یا ہبہ کے ذریعہ کسی پر ظلم کرنے میں تعاون لینا ہو یا اس کے ذریعہ حکام کو رشوت دینا مقصود ہو۔ (مغنی المحتاج ج۲/۳۹۶ موسوعۃ فقہیہ ج۴۴ص۱۴۰)

اگر ہبہ کرنے والے کا مقصد ریا یا فخر، یا شہرت ونام ونمود ہو تو ہبہ مکروہ ہوجاتا ہے، اگر ہبہ کے ذریعہ کسی وارث کو وراثت سے محروم کرنا مقصد ہو یا ہبہ کے ذریعہ وراثت میں عدم مساوات پیدا کرنا ہو تو ناجائز اور حرام ہے۔

مسلم شریف کی ایک حدیث امام نوویؒ نے نقل کی ہے:

"قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم'إتقو اللہ واعدلوا فی اولادکم" (المجموع" جلد ١٦،ص:٢٦٩)

ہبہ کے ارکان

جمہور فقہاء کا مذہب ہے کہ ہبہ کے ارکان درج ذیل ہیں:

۱۔عاقدین۔(۔واہب۔موھوب لہ)

۲۔معقود علیہ (شئ موھوب

۳۔صیغے (ایجاب، قبول اور قبضہ)

فقہائے احناف کی رائے یہ ہے کہ ہبہ کے ارکان اسکے صیغے (ایجاب، قبول اور قبضہ) ہیں، اور ہر وہ کلمے اس کے صیغے بن سکتے ہیں جس میں ایجاب وقبول کے معنیٰ متضمن ہوں جیسے: ھدیہ، ھبہ، عطیہ، نحلۃ وغیرہ۔ (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ج۴ص۶۷۹)

شرائط ہبہ

عاقدین یعنی واھب اور موھوب لہ سے متعلق شرائط اس طرح ہیں:

واھب کے شرائط

واھب (ہبہ کرنے والا) کے بارے میں فقہاء نے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ تبرع کرنے

کا اہل یعنی عاقل، بالغ، رشید اور ہبہ کردہ چیز کا مالک ہو، (القوانین الفقہیہ ص ۳۱۴)

چنانچہ اس شخص کی طرف سے ہبہ کرنا درست نہ ہوگا جس کو کسی بھی وجہ سے تصرف کا حق حاصل نہ ہو جیسے مجنون، نابالغ بچہ خواہ باشعور ہو یا بے شعور، ان لوگوں کو ہبہ کے تصرف سے روکنے کی وجہ یہ ہے کہ ہبہ خالص ضرر ہے کیونکہ بلاعوض دوسرے کو مالک بنانا ہے۔

البتہ مرض الموت میں مبتلا مریض کے ہبہ کا وہی حکم ہوگا جو اسکی وصیت کا حکم ہے۔

یعنی ایک تہائی میں اسکا حکم نافذ العمل ہوگا اور زائد میں ورثاء کی اجازت اور عدم اجازت پر موقوف ہوگا، اسی طرح ''دین'' کی وجہ سے تصرف سے روکے گئے (مجور) شخص کا ہبہ قرض خواہوں کی اجازت پر موقوف ہوگا، اسلئے کہ ان ہی کی مصلحت کی وجہ سے اسکو تصرف سے روکا گیا ہے۔

نابالغ بیٹے کے مال کا ہبہ

اس بات پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ باپ کے لئے اپنے نابالغ بیٹے کا مال بلاعوض ہبہ کرنا جائز نہیں ہے، البتہ باپ اگر مشروط عوض کے بالمقابل ہبہ کرے تو اس کے صحیح ہونے میں فقہاء کی دو آراء ہیں۔

اول: ایک رائے یہ ہے کہ ''ناجائز ہے'' یہی قول امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسفؒ کا ہے، اس قول کی دلیل یہ ہے کہ عوض کی شرط کے ساتھ ہبہ کرنا، ابتداء میں تبرع اور انتہاء میں 'بیع' ہے، ہبہ میں قبضہ تکمیل ہبہ کا رکن ہے، بیع میں یہ رکن نہیں ہے اور شیخین کے نزدیک اصل یہ ہے کہ جو شخص تبرع کا مالک نہیں ہوگا، وہ عوض کے ساتھ یا عوض ہبہ کا بھی مالک نہیں ہوگا۔ (موسوعۃ فقہیہ ج ۴۴ ص ۱۴۲)

دوم: دوسری رائے یہ ہے کہ عوض کی شرط کے ساتھ باپ کے لئے اپنے نابالغ بیٹے کا مال ہبہ کرنا جائز ہے، یہی قول امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ کا ہے، اسلئے کہ ان کے نزدیک اصل یہ ہے کہ جو شخص بیع کا مالک ہے وہ عوض کے ساتھ ہبہ کا بھی مالک ہوگا، کیوں کہ ہبہ کی اصل

ہے ''مالک بنانا'' اور جب اس میں عوض کی شرط لگا دیگا تو عوض کے ساتھ مالک بنانا ہوگا اور یہی ''بیع'' کی حقیقت ہے، معنی میں متفق ہو جانے پر لفظ کے اختلاف کا کوئی اعتبار نہ ہوگا جیسے لفظ بیع اور لفظ تملیک اور یہی رائے مالکیہ کی بھی ہے۔ بدائع الصنائع ج ۶ ص ۱۱۸، موسوعۃ فقہیہ ج ۴۴، ص ۱۴۲)

فضولی کا ہبہ

فضولی کے ہبہ کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے:

چنانچہ جمہور مالکیہ، حنابلہ اور ایک قول شافعیہ کا ہے کہ ''فضولی کا ہبہ باطل ہے''، جبکہ حنفیہ، ایک قول شافعیہ اور بعض مالکیہ کا مذہب ہے کہ ''فضولی کا ہبہ'' موقوف ہو کر منعقد ہوگا کہ اگر مالک اسکی اجازت دے دے تو نافذ ہوگا، ورنہ باطل ہو جائے گا۔ (فتح القدیر ج ۶، ص: ۳۱۱)

ہر وہ تصرف جو فضولی کی طرف سے صادر ہوا اور اس کے صادر ہونے کے وقت کوئی اس کی اجازت دینے والا ہو تو وہ موقوف ہو کر منعقد ہوگا، خواہ ''بیع'' ہو یا نکاح، یا طلاق، ہبہ، یہی حکم ہر اس تصرف کا ہوگا، جس میں وکیل بنانا صحیح ہو۔

نشہ میں مدہوش شخص کا ہبہ

اگر نشہ کسی مباح شئ کی وجہ سے ہو یا ایسی چیز سے جس میں وہ معذور ہو، جیسا کہ اگر اسکے حلق میں شراب ٹپکا دی جائے تو اسکی طرف سے صادر ہونے والے تمام تصرفات غیر نافذ ہوں گے، لیکن اگر کسی حرام شئ کے ذریعہ نشہ ہو، مثلاً اگر اپنے اختیار سے تعدی کر کے نشہ آور چیز پی لے تو اس کے تصرفات کے نافذ ہونے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے:

۱۔ حنفیہ کا مذہب ہے، شافعیہ کا راجح قول یہی ہے اور اسی طرح ایک رائے حنابلہ کی ہے کہ اسکے تمام تصرفات اور اس کے تمام اقرار نافذ ہوں گے۔

ان کی دلیل "یـأیها الذین آمنوا لا تقربوا الصلوٰة وانتم سکاریٰ حتیٰ تعلموا

ما تقولون (سورۂ نساء:۴۳) ہے کہ نشہ بالاِ جماع خطاب کے منافی نہیں اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ وہ مخاطب ہے تو یہ بھی ثابت ہوگیا کہ نشہ اہلیت کے کسی جز کو باطل نہیں کرتا ہے۔

لہذا شریعت کے تمام احکام اس پر لازم ہوں گے، طلاق، عتاق، بیع وشراء اور اقرار کے تعلق سے اس کی تمام عبادتیں صحیح ہوں گی، نشہ کی وجہ سے صرف قصد وارادہ نہیں ہوگا، الفاظ معدوم نہیں ہوں گے۔

۲۔ مالکیہ کی رائے کہ حرام ذریعہ سے مدہوش شخص پر جنایات، عتق اور طلاق لازم ہوگی اقرار اور عقود (بیع، اجارہ، ہبہ، صدقہ اور وقف) لازم نہ ہوں گے۔

۳۔ حنابلہ اور ایک مرجوح قول شافعیہ کا ہے کہ ''نشہ میں مبتلا شخص کے تصرفات اور اسکا اقرار نافذ نہ ہوگا، استدلال یہ ہے کہ نشہ میں مدہوش شخص کا ارادہ نہیں ہوتا ہے لہذا وہ اس شخص کے مشابہ ہوگا جس پر اکراہ کیا جائے، نیز اسلئے بھی کہ عقل مکلّف ہونے کی شرط ہے چنانچہ معصیت کے ذریعہ ہو یا بلا معصیت کے شرط کے زائل ہونے میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ (فتح القدیر ج ۳ ص ۳۴۵، موسوعۃ فقہیہ ج ۴۴ ص ۱۴۳، حاشیہ ابن عابدین ج ۲، ص ۳۲۴)

موھوب لہ کے شرائط

موھوب لہ کے بارے میں تمام فقہاء نے یہ شرط لگائی ہے کہ جو چیز اس کو ہبہ کی جائے اس کے مالک بننے کا وہ اہل ہو، چنانچہ، موھوب لہ اگر عاقل بالغ ہو تو خود شئ موھوب پر قبضہ کریگا، اگر وہ قبضہ کا اہل نہیں ہے تو بھی اس کو ہبہ کرنا صحیح ہوگا، لیکن اسکی نیابت میں اس کے ولی وغیرہ کا قبضہ کرنا صحیح ہوگا۔

شئ موھوب (ہبہ کی ہوئی چیز) کی شرائط

شئ موھوب کے متعلق مندرجۂ ذیل شرائط ہیں: اس لئے کہ شئ موھوب ہی معقود علیہ ہے اور مبیع کی طرح اکثر احکام میں معقود علیہ (شئ موھوب) مشروط ہوتی ہے۔

۱۔ ہبہ کے وقت وہ (شئ موھوب) موجود ہو۔

۲۔ وہ شئ واھب کی مملوک ہو مباح نہ ہو۔

۳۔ مال متقوم ہو۔

۴۔ شئ ممتاز ہو (مشاع میں تفصیل ہے)

۵۔ واھب کی ملکیت (قبضہ) میں ہو۔

مذکورہ شرائط کی تفصیل

۱۔ جمہور فقہاء کا مذہب ہے کہ ہبہ کے وقت شئ موھوب کا موجود ہونا شرط ہے، اسلئے کہ ہبہ میں فی الحال مالک بنانا ہے، لہذا جو چیز ہبہ کے وقت موجود نہ ہو اس کا ہبہ صحیح نہیں ہوگا، مثلاً واھب اگر یہ کہے کہ اس سال کھجور کے درخت میں جو پھل لگے گا، یا اس سال اس کی بکریاں جو بچہ جنیں گی، یا ان جانوروں کے پیٹ میں جو بچہ ہے ہبہ کر رہا ہوں، پھل کے وجود میں آنے کے بعد یا بچہ کی ولادت کے بعد قبضہ دلائیگا تو یہ ہبہ باطل ہوگا، اس لئے کہ اشیاء موھوب فی الحال معدوم ہیں۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج ۶۸۴)

اور اس لئے کہ ممکن ہے پھل ہی نہ لگے اور جانوروں کے شکم میں بچے نہ ہوں، یا مرے ہوئے پیدا ہوں علی ھذا القیاس، اس طرح تل میں جو تیل ہے یا دودھ میں جو گھی اور مکھن ہے یا زیتون میں جو روغن ہے اس کو ہبہ کرے اور قبضہ ان اشیاء کے وجود میں آنے کے بعد ہوگا، تو ہبہ کی یہ شکلیں بھی باطل ہوں گی اس لئے کہ موھوب شئ فی الحال معدوم و مجہول ہے اور معدوم و مجہول کا مالک بنانا جائز نہیں اور ہبہ میں تملیک شرط ہے۔ (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ج ۴ ص ۶۸۵)

البتہ تھن کا دودھ، بھیڑ کے بدن میں لگا ہوا اون، درخت پر لگے ہوئے پھل یا کھڑی فصل ہبہ کرے تو مانع کی وجہ سے ''شئ مشاع'' کی طرح فی الحال فاسد ہوگا اور جب موانع دور کر کے موھوب لہ کے حوالے کر دی جائیں گی تو ہبہ جائز اور صحیح ہو جائیگا۔ (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ج ۴ ص ۶۸۵، موسوعۃ فقہیہ ج ۴۴، ص: ۱۴۴)

۲۔موھوب مملوک ہو:

۲۔''وہ شئی موھوب'' واھب کی مملوک ہو اور قبضہ میں ہو لہذا مباح اُشیاء کو ہبہ کرنا جائز نہ ہوگا اسلئے کہ وہ قبضہ میں نہیں ہے، نیز اسلئے کہ ہبہ میں تملیک شرط ہے اور جو مملوک نہیں اس کا مالک بنانا فی الحال محال ہے، اس طرح جو چیز مملوک نہیں بلکہ غیر کا مال ہے اس کا ہبہ مالک کی اجازت کے بغیر ممنوع اور ناجائز ہے۔

البتہ واھب کی مملوک ''عین'' ہو یا ''دین'' دونوں کا حکم ایک ہے، یعنی ''عین'' کا ہبہ کرنا تو ظاہر ہے کہ جائز ہوگا، اس لئے کہ موھوب لہ کا واھب کے ''عین'' پر قبضہ کرنا ممکن ہے، ''دین'' کا ہبہ: اگر واھب دین اسی کو ہبہ کردے جس پر دین ہے، یعنی مدیون کو ہی ہبہ کردے تو یہ بلا اختلاف تمام فقہاء کے نزدیک جائز ہے، اس لئے کہ یہ مدیون کو بری کرنے یا اس سے دین ساقط کرنے کے درجہ میں ہوگا، کسی نئے قبضہ کی ضرورت نہ ہوگی، لیکن اگر دین، مدیون کے علاوہ کسی شخص کو ہبہ کرے تو اس سلسلہ میں فقہاء کے دو مختلف اقوال ہیں:

۱۔حنفیہ، مالکیہ اور ایک مرجوح قول شافعیہ کا بھی ہے کہ جائز ہے اور وجہ جواز یہ ہے کہ دین پر موھوب لہ کو قبضہ کرنے میں نائب بنانا ہے نیز واھب کو قبضہ کرنے کی قدرت حاصل ہے، البتہ قبضہ کی تکمیل کے بعد ہبہ کی تکمیل ہوگی، حنفیہ کے نزدیک یہ استحسان ہے۔

۲۔حنابلہ، حنفیہ اور شافعیہ کا راجح مذہب ہے کہ جائز نہیں اور حنفیہ کے نزدیک یہی قیاس یہ ہے، وجہ قیاس یہ ہے کہ قبضہ کرنا ہبہ کے جائز ہونے کی شرط ہے۔جسکا یہاں احتمال ہے یقین نہیں۔(الموسوعۃ الفقہیہ ج ۴۴ص ۱۴۵)

۳۔موھوب شئی متقوم ہو

شریعت کی نظر میں شئی موھوب مال ہو جس کی قیمت ہو اور اتلاف کے وقت اس کا ضمان واجب ہوتا ہو۔لہذا ایسی شیئ کو ہبہ کرنا جائز نہ ہوگا جو سرے مال ہی نہ ہو، جیسے مردار، خون، صید الحرم وغیرہ، اسی طرح اس شیئ کا ہبہ بھی جائز نہ ہوگا جو متقوم نہ ہو جیسے شراب اور دوسری نشہ آور چیزیں، جو شرعاً حرام بھی ہیں۔

۴۔موھوب شیئ محرز اور ممتاز ہو:

حنفیہ کے نزدیک قابل تقسیم مشاع (شئ مشترک جیسے بڑے مکانات اور زمین وغیرہ) کا ہبہ ناجائز ہوگا اگر کوئی ہبہ کردے تو فاسد ہوگا، تقسیم کے بعد موھوب لہ کو اپنا حصہ حوالے کردے تو ہبہ جائز ہو جائیگا قبضہ پائے جانے کی وجہ سے، جو ہبہ کے صحیح ہونے کی شرط ہے۔

البتہ نا قابل تقسیم مشاع کا ہبہ احناف کے نزدیک جائز ہوگا جیسے مشترک گاڑی، مشترک حمام، چھوٹا گھر وغیرہ، اس میں کوئی فرق نہ ہوگا کہ ''مشاع'' کسی اجنبی کو ہبہ کرے یا شریک وسہیم کو مالکیہ، حنابلہ اور شافعیہ کے نزدیک مطلق جائز ہوگا خواہ قابل تقسیم ہو یا نا قابل تقسیم، ان کی دلیل یہ ہے کہ جیسے غیر تقسیم شدہ مشترک شیئ (مشاع) کی بیع جائز اور اس میں قبضہ درست ہے، اسی طرح غیر تقسیم شدہ شیئ مشترک کے ہبہ میں بھی قبضہ جائز ہے۔ (الفقہیہ الاسلامی وادلتہ ج ۴ص ۶۸۵)

اور احناف کے نزدیک دلیل تمام صحابۂ کرام کا اجماع ہے، یہی حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ اور حضرت علیؓ سے منقول ہے۔

۵۔موھوب واھب کی ملکیت میں ہو

احناف کے نزدیک قبضہ کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ شیئ موھوب غیر موھوب کے ساتھ اجزاء کے متصل ہونے کی طرح متصل نہ ہو، یعنی شیئ موھوب غیر موھوب سے ممتاز ہو اس سے متصل نہ ہو، اسی سے یہ مسئلہ مستنبط ہوگا کہ کوئی اگر ''کھیتی لگی زمین ہبہ کرے پیداوار نہیں، یا درخت ہبہ کرے پھل نہیں، یا کھیتی ہبہ کرے زمین نہیں، یا پھل ہبہ کرے درخت نہیں، پھر (شیئ موھوب) اس کے اور موھوب لہ کے درمیان تخلیہ کردے تو ہبہ جائز نہ ہوگا، اور اگر پہلے زمین ہبہ کرے پھر کھیتی ہبہ کرے، یا پہلے درخت پھر پھل ہبہ کرے اور دونوں کو سپرد کردے، تو جائز ہو جائیگا موھوب شیئ کا واھب کی ملکیت میں، ممتاز ہونے اور شرط ہبہ (قبضہ) کے پائے جانے کی وجہ سے۔(الفقہ الاسلامی ج ۴ص ۶۸۶، تکملہ فتح القدیر، ج ۷، ص:۱۲۱، موسوعۃ فقہیۃ، ج ۴۴، ص:۱۴۷) ☆☆☆☆☆

وصیت کے احکام

شریعت اور قانون کی نظر میں

مولانا محمد نصر اللہ ندوی
(استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

وصیت کے معنی

وصیت کے لغوی معنی آتے ہیں دوسرے کو تاکید کرنا، ہدایت دینا، حکم دینا، نصیحت کرنا وغیرہ۔ (لسان العرب، القاموس المحیط، مادہ: وصی)

شریعت میں وصیت کا مطلب ہوتا ہے اپنے مال کے سلسلہ میں کسی ایسے کام کی تاکید کرنا، جس کا نفاذ مرنے کے بعد ہو سکے۔ (بدائع الصنائع: ۷/۳۳۳)

قانون کے لحاظ سے وصیت کی تعریف یہ ہے کہ ترکہ میں کوئی ایسا تصرف کیا جائے، جس کا تعلق موت کے بعد سے ہو اور جس کا مقصد بلاعوض کسی کو مالک بنانا ہو۔ (الوصایا والوقف فی الفقہ الاسلامی، وھبہ زحیلی: ۱۳)

وصیت کے بارے میں اسلام کا مزاج

وصیت کی تاریخ بہت قدیم ہے، اسلام سے پہلے وصیت کے بارے میں لوگ افراط وتفریط کا شکار تھے، کچھ لوگ اصل ورثہ کو محروم کر دیتے اور نام ونمود کے لئے دوسروں کے حق میں وصیت کر دیتے، یا متعدد ورثہ میں سے ایک کے لئے وصیت کرتے اور بقیہ کو

محروم کر دیتے، ظاہر ہے کہ یہ ایک ظالمانہ اور غیر عادلانہ طرز عمل تھا، جس پر اسلام نے روک لگا دی، اس نے وصیت کے سلسلہ میں ایک ایسا نظام بنایا جو مکمل عدل وانصاف پر مبنی ہے، چنانچہ اس نے وصیت کو ایک تہائی مال میں محدود کر دیا اور اس بات کی اجازت نہیں دی کہ کسی وارث کے لئے وصیت کی جائے تاکہ دوسرے ورثہ محروم نہ رہیں اور سب کے ساتھ برابری اور انصاف کا برتاؤ کیا جائے۔ (الوصایا والوقف فی الفقہ الاسلامی، وھبہ زحیلی: ۱۲)

وصیت کا ثبوت

وصیت کا ثبوت قرآن وحدیث دونوں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿کتب علیکم إذا حضر أحدکم الموت إن ترك خیراً الوصیة للوالدین والأقربین بالمعروف حقا علی المتقین﴾۔ [سورہ بقرہ: ۱۸۰]

ترجمہ: تمہارے لئے فرض قرار دیا گیا ہے جب تم میں سے کسی کو موت آئے اور وہ مال چھوڑ کر جا رہا ہو، وصیت کرنا، والدین کے حق میں، رشتہ داروں کے حق میں، معروف طریقہ پر، یہ تقوی والوں پر حق ہے۔

سورہ نساء میں ہے:

﴿فإن کان لهن ولد فلکم الربع مما ترکن من بعد وصیة یوصین بها أو دین﴾۔ [سورہ نساء: ۱۲]

ترجمہ: اگر تمہاری بیویوں کے بچے ہوں تو تم کو ان کے ترکہ میں چوتھائی حصہ ملے گا اور یہ ان کی وصیت کو نافذ کرنے کے بعد اور ان کے قرض کو ادا کرنے کے بعد ہوگا۔

صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

ما حق امرئ مسلم له شئ یوصیه فیه یبیت لیلتین إلا و وصیته مکتوبة عنده۔ (بخاری کتاب الوصایا، حدیث نمبر ۴۵۱)

یعنی کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں جس کے پاس کوئی چیز ہو جس میں وہ وصیت کرنا

چاہتا ہواور دورات گذارے اوراس کی وصیت تحریری شکل میں اس کے پاس نہ ہو۔

وصیت پر اجماع

ہر دور کے علماء کا وصیت پر اتفاق رہا ہے، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (الفقہ الإسلامی وادلتہ ۸/۱۱)

عقلی دلیل

کار خیر میں انسان سے جو کوتاہیاں ہوجاتی ہیں، ان کی تلافی کے لئے وصیت کی ضرورت پڑتی ہے، اسی لئے وصیت کو مشروع کیا گیا ہے۔ اسی طرح جو رشتہ دار محتاج ہیں، لیکن میراث میں ان کا حصہ نہیں بنتا ہے، ایسے لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنا بھی وصیت کا مقصد ہے۔ (حوالہ سابق)

وصیت کا حکم

وصیت کی مختلف قسمیں ہیں، کبھی وصیت کرنا واجب ہوتا ہے، کبھی مستحب ہوتا ہے، کبھی مباح، کبھی مکروہ اور کبھی حرام وناجائز، تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

واجب

اگر کسی کے پاس کوئی امانت ہے، یا نامعلوم شخص کا قرض ہے، یا اس کے ذمہ کچھ فرائض باقی ہیں مثلاً: زکوٰۃ، نماز، روزہ کا فدیہ باقی ہو، یا کفارہ وغیرہ ہو، تو ایسی صورت میں وصیت کرنا واجب ہے۔ حج فرض ہونے کے باوجود نہ کر پایا تو اس کی وصیت کرنا بھی واجب ہے۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

الوصية بحقوق الله المفروضة واجبة ، فيجب عليه أن يوصى بالزكاة والكفارات ونحو ذلك۔(بدائع الصنائع ۳/۲۸۸)

مستحب

غیر وارث رشتہ داروں کے لئے وصیت کرنا، اسی طرح ضرورت مندوں اور خیر کے کاموں کے لئے وصیت کرنا مستحب ہے۔

احناف کے یہاں تہائی مال سے کم میں وصیت کرنا مستحب ہے، خواہ ورثہ مالدار ہوں یا محتاج، اس لئے تہائی سے کم کرنے میں ورثہ پر احسان ہوگا، لیکن مکمل تہائی میں وصیت کرے گا تو ورثہ پر کوئی احسان نہیں ہوگا۔ ہدایہ میں ہے:

ويستحب أن يوصى الانسان بدون الثلث، سواء كانت الورثة أغنياء أوفقراء، لأن فى التنقيص صلة القريب بترك ماله عليهم، بخلاف استكمال الثلث، لأنه استيفاء تمام حقه، فلا صلة ولا منة۔(هدايه ٤/٥١٥)

ایسی وصیت جس سے حقیقی ورثہ کو نقصان پہنچ جائے شریعت میں ناپسندیدہ ہے، اس لئے جس کے پاس کم مال ہو یا ورثہ نابالغ ہوں یا بالغ ہوں مگر اس قدر محتاج کہ مرنے والے کا دو تہائی متروکہ ان کی ضروریات کے لئے ناکافی ہو تو وصیت نہ کرنا بہتر ہے، اگر ورثہ مستغنی ہوں تو بہتر ہے۔ (قاموس الفقہ ۵/۲۷۴)

مباح

اگر وصیت کرنا واجب، مستحب، مکروہ اور حرام نہ ہو تو مباح ہے، مثلاً: کسی اجنبی شخص کے حق میں وصیت کرنا، یا ایسے رشتہ داروں کے حق میں وصیت کرنا، جو ضرورت مند نہ ہوں مباح ہے، اس کے لئے ورثہ کی اجازت ضروری نہیں ہے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

ثم تصح الوصية لأجنبى من غير اجازة الورثة، كذا فى التبيين (الفتاوى الهندية ٦/٩٠)

ردالمحتار میں ہے:

ومباحة كالوصية للأغنياء من الأجانب والأقارب۔(ردالمحتار۶/ ۶۴۸)

مکروہ

اصحاب فسق وفجور اور معصیت کے شوقین لوگوں کے لئے وصیت کرنا مکروہ ہے۔

ردالمحتار میں ہے:

ومكروهة كالوصية لأهل الفسوق والمعاصي۔(ردالمحتار۶/ ۶۴۸)

ناجائز اور حرام

اگر وصیت کسی معصیت کے لئے کی جائے مثلاً: لہو ولعب کی عمارت کے لئے، فحش وبے حیائی پر مبنی پروگرام کے انعقاد کے لئے، شراب نوشی کے لئے، قتل ناحق کے لئے، یا وارث کو نقصان پہنچانے کے لئے تو یہ وصیت شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔(بدائع الصنائع ۷/ ۳۱۴)

وصیت کے ارکان

جمہور کے نزدیک وصیت کے چار ارکان ہیں:

۱۔موصی، یعنی وہ شخص جو وصیت کرے۔

۲۔موصی لہ، یعنی جس کے حق میں یا جس کے لئے وصیت کی جائے۔

۳۔موصی بہ، یعنی وہ چیز جس میں وصیت جاری کی جائے۔

۴۔وصیت کا صیغہ، یعنی موصی کی طرف سے وصیت کے الفاظ پائے جائیں خواہ زبانی وصیت کرے، یا تحریری وصیت کرے، یا اشارۃ کرے۔(الوصایا والوقف فی الفقہ الإسلامی، وھبہ زحیلی: ۴۱)

احناف کے نزدیک وصیت کے لئے ایجاب وقبول ضروری ہے، یعنی موصی کی طرف سے وصیت کی جائے اور موصی لہ کی طرف سے صراحتاً یا دلالۃً قبول پایا جائے، اس

کے بغیر وصیت مکمل نہیں ہوگی، البتہ خاموش رہنا بھی قبولیت کی دلیل ہے، اگر موصی لہ کی طرف سے انکار کی امید ختم ہوجائے بایں طور کہ انکار سے پہلے اس کا انتقال ہوجائے تو اس کو قبول کے قائم مقام سمجھا جائے گا۔البتہ اگر وہ موصی کے انتقال کے بعد وصیت قبول کرنے سے انکار کردے تو وصیت باطل ہوجائے گی۔(بدائع الصنائع ۷/ ۳۳۱)

وصیت کی قبولیت کا اظہار بعض دفعہ فعل کے ذریعہ بھی کیا جاتا ہے، مثلاً: جس شخص کے حق میں وصیت کی گئی، وہ اس مال میں کوئی تصرف کردے جس کے بارے میں وصیت کی گئی ہو۔(بدائع الصنائع ۷/ ۳۳۷)

وصیت کی شرطیں

وصیت کے صحیح ہونے کی چند شرطیں ہیں جن پر وصیت کا درست ہونا موقوف ہے۔یہ شرطیں موصی، موصی لہ، موصی بہ میں سے ہر ایک کے لئے الگ الگ ہیں۔

موصی کی شرطیں

۱۔موصی (وصیت کرنے والا) کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ تبرع (Donate) کا اہل ہو۔لہذا بچے اور مجنون کی وصیت درست نہیں ہے کہ یہ دونوں تبرع کے اہل نہیں ہیں، اس لئے کہ وصیت ایسا تصرف ہے جس میں نقصان ہے اور اس کا کوئی دنیاوی معاوضہ نہیں ملتا ہے۔(بدائع الصنائع ۷/ ۳۳۴)

البتہ وصیت کرنے والے کے لئے مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے، اگر مسلم مسلمان کے لئے یا مسلمان غیر مسلم کے لئے وصیت کرے، تو یہ وصیت درست ہے۔(بدائع الصنائع ۷/ ۳۴۱)

۲۔موصی انتقال سے پہلے تک ہوش وحواس میں ہو، اگر انتقال سے پہلے اس پر جنون طاری ہوگیا اور وہ ایک ماہ سے زائد طاری رہا تو وصیت باطل ہوجائے گی۔(قاموس الفقہ ۵/ ۲۷۷)

۳۔موصی اپنے اختیار اور رضامندی سے وصیت کرے، اس لئے کہ وصیت نام ہے تملیک کا اور تملیک میں رضامندی ضروری ہے۔اگر کوئی مذاق میں یا بالجبر یا غلطی سے وصیت کرے تو یہ وصیت درست نہیں ہے، اس لئے کہ ان صورتوں میں رضامندی نہیں ہوتی ہے۔(بدائع الصنائع ۷/ ۳۳۵)

۴۔وصیت کرنے والا اس چیز کا مالک ہو جس کے بارے میں وصیت کررہا ہے۔(الدرالمختار ۲/ ۷۴۲)

۵۔وصیت کرنے والا اتنا مقروض نہ ہو کہ اس کا پورا ترکہ قرض کی ادائیگی میں صرف ہوجائے۔(فتاوی ہندیہ ۶/ ۳۹۰)

موصی لہ (جس کے لئے وصیت کی جائے) کی شرطیں

۱۔وصیت کے درست ہونے کے لئے شرط ہے کہ موصی لہ (جس کے لئے وصیت کی جائے) وصیت کے وقت موجود ہو۔مثلاً اگر کوئی بچہ ماں کے پیٹ میں موجود ہے تو اس کے لئے وصیت کرنا جائز ہے، لیکن اگر بچہ وصیت کرنے کے چھ ماہ بعد پیدا ہوا تو وصیت درست نہیں ہوگی، اس لئے کہ وصیت کے وقت اس کا موجود ہونا یقینی نہیں ہے۔(قاموس الفقہ ۵/ ۲۷۵)

۲۔موصی لہ معلوم اور متعین ہو، اس کے بارے میں کوئی جہالت نہ ہو، اس لئے کہ وصیت نام ہے مرنے کے بعد کسی کو مالک بنانے کا، مثلاً یہ کہے کہ یہ گھر میں فلاں (موصی لہ کا نام لے) کے لئے وصیت کرتا ہوں، تعین کبھی نام کے ذریعہ ہوتا ہے مثلاً: حامد، محمود وغیرہ، یا کبھی صفت کے ذریعہ مثلاً: یہ کہے کہ میری یہ وصیت فقراء اور مساکین کے لئے ہے۔(بدائع الصنائع ۷/ ۳۴۲)

۳۔موصی لہ موصی کا قاتل نہ ہو

اگر موصی لہ نے موصی کو قتل کردیا خواہ بطریق حرام عمدا یا خطا قتل کرے تو اس کو

وصیت سے محروم کردیا جائے گا، اس لئے کہ اگر کوئی اس طرح کی حرکت کرے تو اس کو وراثت سے محروم کردیا جائے گا، اس سے ثابت ہوا کہ وصیت سے بدرجہ اولی محروم کردیا جائے گا، اس لئے کہ میراث کا حکم وصیت سے زیادہ مؤکد اور اہم ہے۔(بدائع الصنائع ۷/ ۳۳۹)

۴۔موصی لہ دارالحرب کا باشندہ نہ ہو۔(حوالہ سابق)

۵۔موصی لہ موصی کے انتقال کے وقت زندہ ہو، اگر موصی سے پہلے اس کا انتقال ہوجائے تو وصیت باطل ہوجائے گی۔(بدائع الصنائع ۷/ ۳۸۶)

۶۔موصی لہ موصی کا وارث نہ ہو، اگر کسی وارث کے حق میں وصیت کی جاتی ہے تو یہ بقیہ ورثہ کی اجازت پر موقوف ہوگی، اگر اجازت مل جائے تو وصیت کو نافذ کیا جائے گا ورنہ وصیت باطل ہوگی۔(بدائع الصنائع ۷/ ۳۸۶)

۷۔موصی لہ معصیت سے متعلق نہ ہو

وصیت اصلاً عبادت یا صلہ رحمی کے لئے مشروع کی گئی ہے، اگر معصیت کے لئے وصیت کی جاتی ہے تو یہ باطل ہوگی، مثلا اگر کوئی وصیت کر جائے کہ اس کی قبر پر گنبد تعمیر کردیا جائے تو اس کی وصیت کی تعمیل نہیں کی جائے گی۔اگر یہ وصیت کر جائے کہ اس کی موت کے بعد ایک قاری اس کی قبر کے پاس قرآن مجید پڑھتا رہے تو یہ وصیت بھی غیر معتبر ہے۔(قاموس الفقہ ۵/ ۲۷۶)

خلاصہ یہ کہ کوئی بھی ایسی وصیت جس کا تعلق محرمات اور معاصی سے ہو غیر معتبر ہے۔

موصی بہ کی شرطیں

۱۔جس چیز کے بارے میں وصیت کی جائے وہ مال یا مال سے متعلق ہو، جیسے صدقہ اور ہبہ کی وصیت، یا مال کی منفعت کی وصیت کی جائے، چاہے وہ فی الحال موجود نہ ہو، مثلا یوں کہے کہ اس باغ میں جو پھل آئے اس کو فلاں فلاں پر تقسیم کردیا جائے تو یہ وصیت

درست ہے۔(ردالمحتار۵/۳۱۶)

اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایک شخص کے لئے اصل شئی کی وصیت کی جائے اور دوسرے کے لئے اس کے منافع کی، مثلاً: ایک آدمی کے لئے زمین کی وصیت اور دوسرے کے لئے اس کی پیداوار کی وصیت۔(بدائع الصنائع ۷/۳۹۴)

اگر کوئی خون اور مردار کی وصیت کرے، تو یہ وصیت درست نہیں، اس لئے کہ یہ شریعت کی نظر میں مال نہیں ہیں۔

اسی طرح مال کے لئے ضروری ہے کہ وہ شریعت کی نظر میں قابلِ قیمت ہو، لہذا شراب اور خنزیر کی وصیت معتبر نہیں ہے کہ یہ مال تو ہیں، لیکن شریعت کی نظر میں قابل قیمت نہیں ہیں۔(المغنی۴/۶۱۰)

۲۔اگر کسی متعین چیز کے بارے میں وصیت کی جائے تو ضروری ہے کہ موصی کی موت کے وقت وہ موجود ہو، اگر موصی کے موت سے پہلے وہ چیز ختم ہو جائے تو وصیت باطل ہو جائے گی۔(بدائع الصنائع ۷/۳۵۴)

۳۔ترکہ میں سے دین ادا کرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ ایک تہائی کے بقدر وصیت نافذ ہوگی، اگر ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کی گئی تو زائد وصیت معتبر نہیں ہے، لیکن اگر ورثہ اس کو نافذ کرنے پر راضی ہوں تو وصیت پر عمل کیا جائے گا۔البتہ موصی کی زندگی میں ورثہ کے راضی ہونے کا اعتبار نہیں اور اس کی موت کے بعد بھی نابالغ ورثہ کا راضی ہونا کافی نہیں، اگر وارثین میں کچھ بالغ یا کچھ نابالغ، یا کچھ اس کے نفاذ پر راضی اور کچھ راضی نہ ہوں تو ایسی صورت میں بالغان اور جو راضی ہیں، ان کے مال میں ان کے حصہ کی نسبت سے وصیت نافذ ہوگی۔(فتاوی ہندیہ ۶/۹۰-۹۷)

اس لئے بہتر یہ ہے کہ ایک تہائی میں ہی وصیت کرے، البتہ اگر مرنے والے کا کوئی وارث نہ ہو اور وہ پوری جائداد کے لئے وصیت کر جائے تو یہ وصیت نافذ ہوگی۔(حوالہ سابق)

۴۔ملکیت وصیت کے اعتبار سے ہوگی

وصیت کا حکم ہے کہ جس چیز کی وصیت کی گئی ہے، موصی کی موت کے بعد موصی لہ کی ملکیت اس پر ثابت ہو جاتی ہے، خواہ کسی شئی کی وصیت کی گئی ہو یا اس کے نفع کی، اگر کسی شخص کے لئے صرف منفعت کی وصیت کی گئی ہو، مثلاً گھر میں رہائش وغیرہ کی، تو یہ وصیت اتنی ہی مدت کے لئے ہوگی جو موصی نے طے کر دی ہے، جیسے کسی نے کہا فلاں کو میری موت کے بعد دس سال تک اس مکان میں رہنے کا حق حاصل ہوگا، تو دس سال کے بعد موصی لہ کا استحقاق ختم ہو جائے گا اور اگر وصیت مطلق تھی، مدت کی تحدید نہیں تھی، تو جس کے حق میں وصیت کی گئی اس کی وفات تک نفع اٹھانے کا استحقاق ہوگا، اس کی موت کے بعد اس کے ورثہ کو نفع اٹھانے کا استحقاق نہ ہوگا۔(بدائع الصنائع ۷/۳۸۶، قاموس الفقہ ۵/۲۷۷)

وصیت سے رجوع کرنا

وصیت ایک تبرع ہے، یہ عقد لازم نہیں ہے، یعنی موصی اپنی وصیت سے رجوع بھی کر سکتا ہے، رجوع کرنے کی تین صورتیں ہیں:

۱۔صراحتاً۔

۲۔دلالۃ۔

۳۔ضرورتاً۔

صراحت کا مطلب یہ ہے کہ وصیت کرنے والا خود کہے کہ میں اپنی وصیت سے رجوع کر رہا ہوں۔

یا ایسی بات کہے جس سے اگرچہ صراحت کے ساتھ وصیت سے رجوع کرنا معلوم نہ ہوتا ہو، لیکن رجوع کا مفہوم نکلتا ہو، مثلاً کپڑے کی وصیت کرے پھر اسے اپنے لئے سلا لے۔

ضرورتاً وصیت سے رجوع ثابت ہونے کی دو شکلیں ہیں، ایک یہ کہ جس چیز کے بارے میں وصیت کی ہے، اس میں ایسا اضافہ کر دیا جائے کہ اس کو الگ کرنا ممکن نہ ہو۔مثلاً زمین کی وصیت کی اور اس پر تعمیر کر دی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جس چیز کی وصیت کی، اس میں ایسی تبدیلی ہوئی کہ نام ہی بدل گیا، جیسے انگور کی وصیت کی اور وہ موصی کی موت سے پہلے کشمش بن گیا، یا انڈے کی وصیت کی اور اس نے بچے کی شکل اختیار کر لی، تو اب یہ وصیت باطل ہو جائے گی۔ علامہ کاسانی نے لکھا ہے کہ ضرور تا رجوع کی صورت، دلالۃ رجوع میں داخل ہے اور غالبا یہی صحیح ہے۔ (قاموس الفقہ ۵/۲۷۶)

عرب ملکوں کے قوانین میں وصیت کی تعریف اور شرطیں

مصری قانون میں وصیت کی تعریف کچھ اس طرح ہے:

ترکہ میں ایسا تصرف کرنا جس کا تعلق مابعد الموت سے ہو۔ (دیکھئے ویب سائٹ: قانون الأحوال الشخصیۃ المصری، دفعہ:۷۱)

کویت، امارات، قطر، اردن کے قانون میں بھی وصیت کی تعریف تقریبا انہیں الفاظ میں کی گئی ہے۔ (دیکھئے: احکام الوصیۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ ص ۱۹)

مراکش کے قانون میں وصیت کی تعریف یوں کی گئی ہے:

وہ ایک ایسا عقد ہے جس سے عاقد کے تہائی مال میں اس کی موت کے بعد کوئی حق واجب ہوتا ہے۔ (دیکھئے: ویب سائٹ مدونۃ الاسرۃ المغربیۃ، دفعہ:۷۰)

وصیت کی شرطیں (عرب ملکوں کے قوانین میں)

کویت کے پرسنل لا میں موصی کے لئے شرط لگائی گئی ہے کہ وہ تبرع کا اہل ہو، اگر کم عقلی یا نادانی کی وجہ سے موصی پر پابندی ہو یا وہ ۱۸ سال کو پہنچ چکا ہو تو عدالت کی اجازت سے وصیت کر سکتا ہے۔ (دیکھئے: ویب سائٹ، قانون الاحوال الشخصیۃ الکویتی، دفعہ:۲۱۷)

مرتد مرد اور عورت اگر اسلام میں لوٹ آئیں تو ان کی وصیت معتبر ہوگی۔ (حوالہ سابق)

عراق کے قانون میں موصی کے لئے شرط رکھی گئی ہے کہ وہ قانونا تبرع کا اہل ہو اور جس چیز کے بارے میں وصیت کر رہا ہے اس کا مالک ہو۔ (قانون الاحوال الشخصیۃ

العراقی، دفعہ:۶۷)

موصی لہ کی شرطیں

۱۔ موصی لہ کے لئے شرط ہے کہ وہ وصیت کے وقت یا موصی کی موت کے وقت حقیقی معنی میں زندہ ہو۔

۲۔ اسی طرح وصیت کے لئے شرط ہے کہ وہ متعین اشخاص کے لئے، خیر کے کاموں کے لئے اور ایسے اداروں کے لئے ہو، جن سے عوامی نفع پہونچتا ہو۔ (قانون الاحوال الشخصیۃ العراقی، دفعہ:۶۸)

۳۔ موصی لہ موصی کا قاتل نہ ہو۔ (حوالہ سابق)

موصی بہ کی شرطیں

کویت کے پرسنل لا میں موصی بہ کے لئے تین شرطیں ہیں:

۱۔ وہ ایسی چیز ہو جس میں وراثت جاری ہو سکتی ہو، یا موصی کی زندگی میں محل عقد ہو۔

۲۔ اگر مال ہو تو موصی کی نظر میں قابل قیمت ہو۔

۳۔ وصیت کرتے وقت وہ چیز موصی کی ملکیت میں موجود ہو۔ (دیکھئے: ویب سائٹ، قانون الاحوال الشخصیۃ الکویتی، دفعہ:۲۲۲)

وصیت کے الفاظ کا پایا جانا

وصیت کے انعقاد کے لئے وصیت کے الفاظ کا تحریراً یا زبانی طور پر پایا جانا ضروری ہے۔ اگر موصی بولنے یا لکھنے سے عاجز ہو، مثلاً وہ گونگا ہو یا اس کی زبان بند ہو تو ایسی صورت میں اشارہ کافی ہوگا۔ (دیکھئے: ویب سائٹ، قانون الاحوال الشخصیہ الکویتی، دفعہ:۲۱۴)

اس طرح کی شرطیں مصر، اردن اور امارات کے پرسنل لا میں بھی لگائی گئی ہیں۔ (تفصیل کے لئے ان ملکوں کے پرسنل لا کی ویب سائٹ دیکھیں)

عراق کے مسلم پرسنل لا میں وصیت کے معتبر ہونے کے لئے موصی کی طرف سے تحریری ثبوت کا پایا جانا ضروری ہے، یا اس پر موصی کا نشان انگوٹھا موجود ہو۔ (دیکھئے: ویب سائٹ، قانون الاحوال الشخصیہ العراقی، دفعہ:۶۵)

وصیت ایک تہائی سے زیادہ میں نہ ہو۔

عراق کے پرسنل لا کی دفعہ ۷۳ میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ وارث غیر وارث کے لئے وصیت کرسکتا ہے، بشرطیکہ کی ایک تہائی سے زیادہ میں نہ ہو، اگر ایک تہائی سے زیادہ میں وصیت ہو تو اس کے نفاذ کے لئے وارثین کی اجازت شرط ہے۔ (قانون الاحوال الشخصیۃ العراقی، دفعہ:۷۳)

وصیت سے رجوع کرنے کا قانون

مندرجہ ذیل صورتوں میں وصیت باطل ہوجاتی ہے:

۱۔ وصیت کرنے والا وصیت سے رجوع کرلے، چاہے رجوع صراحۃً ہو یا دلالۃً، مثلا یوں کہے کہ فلاں کے حق میں اپنی وصیت سے رجوع کرتا ہو یا میں نے اپنی وصیت کو کینسل کردیا۔

۲۔ وصیت کرنے والا موصی بہ میں کوئی ایسا تصرف کردے، جس سے اس کا نام تبدیل ہوجائے، یا اس کی صفت تبدیل ہوجائے، مثلا موصی بہ جانور تھا، موصی نے اسے ذبح کردیا، یا کپڑا تھا، موصی نے اسے اپنے لیے سلا لیا، یا اس طرح کا کوئی دوسرا عمل کیا تو وصیت ختم ہوجائے گی۔

۳۔ موصی بہ ہلاک ہوجائے، مثلا کسی جانور کے بارے میں وصیت کی گئی اور وہ موصی کی زندگی میں ہلاک ہوجائے، یا موصی اسے ہلاک کردے، ہر دو صورت میں وصیت باطل ہوجائے گی، اسی طرح موصی اس کو بیچ دے، یا ہبہ کردے تب بھی وصیت باطل ہوجائے گی۔

۴۔ موصی لہ موصی کے انتقال کے بعد وصیت کو قبول کرنے سے انکار کردے، تو وصیت باطل ہوجائے گی، اگر زندگی میں انکار کردے تو اس کا اعتبار نہیں۔ (قانون الاحوال الشخصیۃ العراقی، دفعہ:۷۱)

یتیم پوتے کے حق میں وصیت کا قانون

متعدد مسلم ممالک نے اپنے پرسنل لا میں یتیم پوتے کے حق میں وصیت کو واجب قرار دیا ہے، اسلامی شریعت کے لحاظ سے یتیم پوتے کو چچا اور پھوپھی کی موجودگی میں دادا، دادی کی میراث میں حصہ نہیں ملتا ہے حالانکہ کی اکثر و بیشتر پوتے ضرورت مند ہوتے ہیں اور کم عمری کی وجہ سے ہمدردی کے مستحق بھی، اس کے پیش نظر مسلم ملکوں نے اسلامی شریعت کی روح کو ملحوظ رکھتے ہوئے محروم پوتوں کے لئے وصیت کو واجب قرار دیا، تاکہ سماج میں عدل قائم ہوسکے، اس لئے کہ محروم پوتے کا کوئی جرم نہیں ہے، جس کے باپ کا انتقال اس کے دادا سے قبل ہوگیا، ایسی صورت میں اس پر دوہری مصیبت پڑتی ہے، ایک باپ سے محرومی اور حاجت وضرورت، چنانچہ اگر دادا اس کے باپ کے حصہ کے برابر اپنی مرضی سے وصیت نہیں کرتا ہے تو قانوناً اس پر وصیت کرنا واجب ہوگا، بشرطیکہ وہ ایک تہائی سے زائد نہ ہو، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿كتب عليكم إذا حضر أحدكم الموت إن ترك خيرا الوصية للوالدين والأقربين بالمعروف حقا على المتقين﴾۔[سورہ بقرہ:۱۸۰] (الوصايا والوقف فی الفقه الاسلامی ،ص۱۰۷)

پوتے کے حق میں قانوناً وصیت واجب ہونے کی شرطیں

مصری اور شامی قانون میں اس وصیت کے وجوب کے لئے دو شرطیں لگائی گئی ہیں:

۱۔ پوتا دادا کا وارث نہ ہو۔ اگر اسے میراث میں حصہ مل رہا ہے تو اس کے حق میں وصیت واجب نہیں ہوگی، خواہ اس کا حصہ کتنا ہی کم ہو۔

۲۔دادا نے پوتے کو وصیت واجبہ کے بقدر ہبہ نہ کیا ہو۔اگر دادا نے پوتے کو کچھ دے دیا اور وہ واجب مقدار سے کم ہے،تو اس پر اتنی مقدار میں وصیت واجب ہوگی،جس سے اس کا حصہ مکمل ہوجائے۔(الوصایا والوقف فی الفقہ الاسلامی،ص۱۰۸)

واجب وصیت کی مقدار

پوتے کو وراثت میں باپ کے حصہ کے بقدر ملے گا،یعنی اگر دادا کا انتقال باپ کی موجودگی میں ہو،تو جتنا حصہ باپ کو دادا کی میراث میں ملے گا،اتنی ہی مقدار میں یتیم پوتے کے حق میں وصیت واجب ہوگی، بشرطیکہ ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو،اگر زائد ہو تو ورثہ کی اجازت پر وصیت موقوف ہوگی۔

مثال کے طور پر ایک شخص ایک بیٹا، دو بیٹی اور پوتے کو چھوڑ کر دنیا سے گیا، ایسی صورت میں پوتے کو اتنا حصہ ملے گا جتنا اس کے باپ کو زندہ ہونے کی صورت میں ملتا،اور وہ حصہ کل ترکہ کا ایک تہائی ہوگا۔((الوصایا والوقف فی الفقہ الاسلامی،ص۱۰۸)

وصیت واجبہ مقدم ہوگی

قانون میں اس بات کی صراحت ہے کہ ایک تہائی مال میں سے وصیت واجبہ کی تکمیل سب سے پہلے کی جائے گی،اس کے بعد تہائی مال سے جو بچے تو اختیاری وصیت (یعنی وہ وصیت جو موصی نے اپنی مرضی سے وفات سے قبل کی ہو) کی تکمیل کی جائے گی۔

اگر تہائی مال سے تمام وصیت (واجبہ اور اختیاری) کا نفاذ ہوسکتا ہے،تو نفاذ کیا جائے گا اور اگر نہیں ہوسکتا ہے،تو وصیت واجبہ کو مقدم رکھا جائے گا۔(الوصایا والوقف فی الفقہ الاسلامی،ص۱۰۸)

غیر مسلم ممالک میں وصیت اور میراث کا حکم

غیر مسلم ملک میں ایک مسلم کا اگر انتقال ہوجائے اور اس کے اقارب واعزہ میں

مسلم وغیر مسلم دونوں ہوں،تو میت کا وارث کون ہوگا؟اگر قانون کے مطابق مسلم وغیر مسلم دونوں کو حصہ ملتا ہو، یا قانون کے مطابق حصہ ملتا ہو لیکن شریعت کے مطابق نہ ملتا ہو تو مسلمان کو کیا کرنا چاہئے؟

اس مسئلہ کی کئی صورتیں ہیں،اور الگ الگ نوعیت کے لحاظ سے الگ الگ احکام ہیں،تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

پہلی صورت

کسی مسلمان کا انتقال ہوجائے اور اس کے ورثہ میں مسلم اور غیر مسلم دونوں ہوں اور قانون دونوں کو وراثت میں حصہ دلاتا ہو،تو اس کے سامنے قانون کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، خاص طور سے جب بیوی غیر مسلم ہو اور شوہر کا انتقال ہوجائے،اور ورثہ میں بیوی کے علاوہ بچے بھی ہوں تو قانون کی رو سے بیوی کو میراث میں آدھا حصہ ملے گا۔

سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں مسلمان کو کیا کرنا چاہئے؟شمالی امریکہ کے فقہ اکیڈمی کے سکریٹری کی رائے ہے کہ یہ قانون چونکہ خلاف شریعت ہے،اس لئے اس پر لازم ہے کہ وصیت نامہ تحریر کرے اور اس میں شریعت کے مطابق ترکہ تقسیم کرنے کا حکم دے،یعنی بیوی کے لئے محض آٹھویں حصے کی وصیت کرے،اس لئے کہ اولاد کی موجودگی میں وہ اسی کی مستحق ہے۔اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

ولكم نصف ما ترك ازواجكم ان لم يكن لهن ولد، فان كان لهن ولد فلكم الربع مما تركن من بعد وصية يوصين بها او دين، ولهن الربع مما تركتم ان يكن لكم ولد فان كان لكم ولد فلهن الثمن مما تركتكم بعد وصية توصون بها اودين۔(سورہ نساء: ۱۲)(دیکھئے: ویب سائٹ، مقالہ بعنوان، التوارث بين المسلم وغيره)

دوسری صورت

کسی غیر مسلم کا انتقال ہوجائے اور اس کے ورثہ مسلمان ہوں اور قانون کے لحاظ

سے وہ وراثت کے حق دار ہوں، تو کیا ان کے لئے غیر مسلم کی میراث لینا درست ہے؟

اس سلسلہ میں علماء کے دو نقطہائے نظر ہیں:

پہلا نظریہ جمہور کا ہے کہ مسلمان کافر کا وراث نہیں ہوسکتا، ان کی دلیل وہ روایت ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوگا اور نہ ہی کافر مسلمان کا وارث ہوگا۔

روایت کے الفاظ ہیں: ''لا یرث المسلم الکافر ولا یرث الکافر المسلم'' (بخاری ومسلم کتاب الفرائض)

سعودی عرب کی مستقل فتوی کمیٹی اور دار الافتار مصر کا یہی فتوی ہے۔

دوسرا نظریہ ہے کہ مسلمان کے لئے کافر کی وراثت لینا جائز ہے، حضرت معاذ بن جبل، معاویہ بن سفیان، سعید بن مسیّب، مسروق بن اجدع کی بھی یہی رائے ہے، نیز شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

ان حضرات کی دلیل یہ حدیث ہے: الاسلام یعلو ولا یعلی علیہ'' (دار قطنی: ۳۹۵، بیہقی ۶/۲۰۵)

یعنی اسلام ہمیشہ غالب رہتا ہے اور کبھی مغلوب نہیں ہوتا، مسلمان کے لئے کسی کافر کا وارث ہونا اسلام کے غلبہ کی ایک مثال ہے۔

یورپین کونسل برائے تحقیق وافتاء نے یہی فتوی دیا ہے۔ (دیکھئے: ویب سائٹ، قرارات المجلس الاوربی للافتاء والبحوث)

تیسری صورت

یہ ہے کہ غیر مسلم مسلمان کے حق میں وصیت کرے، اگر ترکہ کی تقسیم وصیت کی بنیاد پر ہو اور غیر مسلم مسلمان کے لئے وصیت کرے، خواہ مسلمان غیر مسلم کا قریبی ہو یا نہ ہو، تو اس کے لئے وصیت قبول کرنا جائز ہے۔ (دیکھئے: ویب سائٹ، التوارث بین المسلم وغیرہ)

چوتھی صورت

بعض علماء کا خیال ہے کہ ایک مسلمان کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی غیر مسلم بیوی، والدہ یا کسی قریبی خاتون کے لئے میراث میں اس کے حصہ کے بقدر وصیت کردے۔

ان کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے: ﴿کتب علیکم إذا حضر أحدکم الموت إن ترك خیراً الوصیة للوالدین والأقربین بالمعروف حقا علی المتقین﴾۔ [سورہ بقرہ: ۱۸۰] (دیکھئے: ویب سائٹ، التوارث بین المسلم وغیرہ)

پانچویں صورت

اگر کوئی مسلمان نعوذ باللہ مرتد ہوجائے تو وہ مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: لا یرث الکافر المسلم'' (بخاری ومسلم، کتاب الفرائض)

جمہور فقہاء کا اس پر اتفاق ہے۔ الموسوعۃ الفقہیہ الکویتیہ میں ہے:

لاخلاف بین فقهاء المذهب ان المرتد –وهو من ترك الاسلام باختیاره وارادته–لا یرث احدا ممن یجمعه وایاهم سبب من اسباب المیراث ۔

(الموسوعۃ الفقہیہ الکویتیہ ۳/۲۵)

☆☆☆☆☆☆

اسلام کا نظام میراث اور اس میں خواتین کا حصہ
عقل ونقل کی روشنی میں

مولانا محمد زید مظاہری ندوی
(استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

اسلام ایک مکمل نظام حیات اور جامع دستور العمل

اسلام ایک مکمل نظام حیات اور جامع دستور العمل ہے، زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق اسلام کی واضح تعلیمات موجود نہ ہوں، مہد سے لے کر لحد تک، پیدائش سے لے کر موت تک زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اسلام نے دستور الٰہی پیش کیا ہے، اور اپنے پیروکاروں کو مخاطب کر کے کہا ہے:

"یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِیْ السِّلْمِ کَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ، إِنَّهُ لَکُمْ عَدُوٌّ مُبِیْنٌ۔"(سورہ بقرہ:۲۰۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو، کیونکہ وہ تو تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے بندوں کو ہدایت دی ہے کہ زندگی گذارنے میں ہر موقع کے لئے جو دستور تم کو دیا گیا ہے بس یہی سیدھا راستہ ہے، اس کے علاوہ جتنے بھی راستے ہوں گے وہ سب صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے ہوں گے، چنانچہ ارشاد ہے:

"وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ

سَبِیْلِهِ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِهٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۔"(سورہ انعام، ص: ۱۵۳)

ترجمہ: اور یہ بھی کہہ دیجئے کہ یہ میری سیدھی راہ ہے سو اسی راہ پر چلو، اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ تم کو اللہ سے جدا کر دیں گی، ان سب کا اللہ نے تم کو حکم دیا ہے، تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

اسلام نے اپنے پیروکاروں کو جو نظام حیات اور دستور العمل دیا ہے اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عقائد وعبادات سے لے کر معاملات ومعاشرت اور معیشت تک کی واضح ہدایات موجود ہیں، ہماری معاشرتی اور عائلی زندگی کا تعلق نکاح وطلاق اور میراث سے بھی ہے، جس کے متعلق قرآن پاک میں عبادات سے زیادہ وضاحت و صراحت سے احکام بیان کئے گئے ہیں، اس وقت احقر معاشرتی زندگی کے صرف ایک گوشہ (یعنی اسلام کا نظام میراث اور اس میں خواتین کا حصہ عقل ونقل کی روشنی میں) سے متعلق اسلامی تعلیمات کا خلاصہ عرض کرنا چاہتا ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ میراث کے تعلق سے خواتین کے لئے اسلام نے جو نظام بندگان خدا کو دیا ہے وہ عین عقل وفطرت کے مطابق ہے، اس سے بہتر نہ کوئی نظام تھا اور نہ ہی آئندہ اس کا تصور کیا جا سکتا ہے، اس نظام میراث کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا ہے:

"تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ، وَمَنْ یُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِیْنَ فِیْهَا، وَذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ، وَمَنْ یَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ یُدْخِلْهُ نَاراً خَالِداً فِیْهَا، وَلَهٗ عَذَابٌ مُهِیْنٌ۔"(سورہ نساء:۱۳، ۱۴)

ترجمہ: یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ اس کو ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ایسے لوگ ہمیشہ ان باغات میں رہیں گے، اور یہ زبردست کامیابی ہے، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز کرے گا اسے اللہ دوزخ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کو ایسا عذاب ہوگا جو ذلیل کر کے

رکھ دے گا۔

اسلام کا دیا ہوا یہ قانون میراث نیز اس کے دیئے ہوئے جملہ احکام سب کے سب انسانی فطرت کے مطابق اور نہایت عدل و عقل اور حق تعالیٰ کی رحمت پر مبنی ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر انسانوں کے خلقی ضعف اور بعض مالی حقوق کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا:

"إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا۔"(سورہ نساء، پ ۵، آیت ۲۹)

ترجمہ: یقین جانو اللہ تعالیٰ تم پر بہت مہربان ہے۔

یعنی اس کے جملہ احکام میں بندوں کے لئے حق تعالیٰ کی طرف سے شفقت و رحمت ہے۔

ان احکام کی خلاف ورزی کرنے پر نہ صرف یہ کہ آخرت تباہ و برباد ہوگی اور یوم جزاء میں ایسا شخص سخت عذاب کا مستحق ہوگا بلکہ اس دنیا میں بھی اس کی معاشرتی زندگی تباہ و برباد اور اس کا قلبی سکون غارت ہوگا، اس لئے اسلام کے دیئے ہوئے قانون معاشرت میں نظام میراث کو کتاب وسنت اور عقل وفطرت کی روشنی میں سمجھنے اور پورے انشراح کے ساتھ اس کے مطابق عمل کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ ایمان نام ہے احکام الٰہیہ کی حقانیت اور صداقت کے یقین اور دل سے ماننے کا، اور اسلام نام ہے اپنی طرف سے مکمل سپردگی اور بلا چوں وچرا کامل اطاعت کا، اس لئے اگر واقعۃً ہم اسلام وایمان کے مدعی ہیں تو اس کی جملہ ہدایات اور کتاب وسنت میں بیان کردہ تمام احکام کو تسلیم کرنا اور اس کے مطابق عمل کرنا فرائض اسلام وایمان میں سے ہے، ورنہ ہمارا اسلام کا دعوی محض دعوی بلا دلیل ہوگا۔

اسلامی قانون میراث کے مختلف مدارج

پہلا مرحلہ: میراث کے باب میں سب سے پہلا حکم جس کو اللہ تعالیٰ نے بندوں پر نازل کیا اور رسول اللہ ﷺ نے مہاجر وانصار صحابہ کے درمیان اس کو مشروع اور رائج فرمایا

جس کا تذکرہ سورہ انفال کی اس آیت میں ہے:

"إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ آوَوْا وَّنَصَرُوْا أُولٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ، وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَالَكُمْ مِنْ وَّلَايَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا، وَإِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيْثَاقٌ، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ، وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ۔"(سورہ انفال، پ ۹، آیت ۷۲، ۷۳)

ترجمہ: بیشک جو لوگ ایمان لائے دین کے لئے وطن چھوڑا اور اپنی جان و مال سے اللہ کے راستہ میں جہاد کیا، اور جن لوگوں نے (ہجرت کرنے والوں کو پناہ دی) اور مدد کی، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور جو لوگ ایمان تو لائے مگر (قدرت کے باوجود) ہجرت نہیں کی تو جب تک وہ ہجرت نہ کریں، تم لوگوں کی ان سے کوئی دوستی نہیں اور اگر وہ دین کے کام میں تم لوگوں سے مدد چاہیں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے مگر ایسی قوم کے مقابلہ میں نہیں جن کا تم سے معاہدہ ہو، اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے خوب دیکھ رہے ہیں، اور کفر کرنے والے ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

بخاری شریف کی روایت میں اس کی تفصیل موجود ہے:

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مہاجر صحابہ جب ہجرت کر کے مدینہ پاک آئے تو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے مقیم صحابہ یعنی انصار اور مہاجر صحابہ کے درمیان مواخاۃ (یعنی اخوت کا رشتہ) قائم فرمایا اگرچہ ان کے درمیان کسی نوع کی قرابت اور رشتہ داری نہ ہو، جس کے نتیجہ میں مہاجر وانصار، صحابہ ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے، لیکن ایک مدت کے بعد دوسری آیتوں سے یہ حکم منسوخ ہوگیا، روایت کے الفاظ یہ ہیں

"عن ابن عباس رضي الله عنهما قال: كان المهاجرون حين قدموا المدينة يرث الأنصاري المهاجري دون ذوي رحمه، للإخوة التي آخى النبي ﷺ بينهم، فلما نزلت لكل جعلنا موالي مما ترك الوالدان۔۔۔۔، قال:

نسختها والذين عقدت أيمانهم۔"(صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب ذوي الأرحام، حدیث ٦٧٤٧)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

سورہ انفال کی آخری آیت "وأولو الأرحام" میں قانون میراث کا ایک جامع ضابطہ بیان کیا گیا ہے، جس کے ذریعہ ایک عارضی حکم کو منسوخ کیا گیا ہے، جو اوائل ہجرت میں مہاجرین و انصار کے درمیان مواخاۃ کے ذریعہ ایک دوسرے کا وارث بننے کے متعلق جاری ہوا تھا۔

سورہ انفال کی اس آخری آیت کے آخری جملہ نے اسلامی وراثت کا وہ قانون منسوخ کر دیا جو اس سے پہلے پہلی آیات میں مذکور ہے، جس کی رو سے مہاجرین وانصار میں باہمی وراثت جاری ہوتی تھی، اگر چہ ان کے درمیان کوئی رشتہ داری نہ ہو، کیونکہ یہ حکم ایک ہنگامی حکم ہے جو اوائل ہجرت کے وقت دیا گیا تھا۔ (معارف القرآن، سورہ انفال، جلد۴، صفحہ۳۰۱)

قانون میراث کا دوسرا مرحلہ

شریعت مقدسہ کے قانون میراث میں تدریجی طور پر جو ارتقاء ہوا ہے اس کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ انصار ومہاجرین کے درمیان میراث کا حکم منسوخ ہو جانے کے بعد شریعت نے اس بات کا مکلّف بنایا کہ تمہارا ترکہ اور میراث کا مال اصلاً تمہارے بیٹے کے لئے ہے، بیٹے کے علاوہ دوسرے قریبی رشتہ داروں مثلاً ماں باپ وغیرہ کے لئے کچھ مال کی وصیت کر جانا تم پر فرض ہے، ان کے حق میں تم جو وصیت کر جاؤ گے اس کے مطابق تمہارا مال ان کو دیا جائے گا، چنانچہ مرنے والا اگر والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے لئے اپنے مال کی کچھ وصیت کر جاتا تو اس کی وصیت کے مطابق ان کو بھی مال مل جاتا، ورنہ بیٹے کے مال سے باپ کو بھی کچھ نہ ملتا تھا، یہ مرحلہ ایسا تھا کہ اس میں مرنے والے کو مرنے سے قبل اپنے مال کے متعلق وصیت کرنا فرض تھا، جس کا تذکرہ سورہ بقرہ کی اس آیت میں ہے:

"كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ، حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ۔"(سورہ بقرہ: ۱۸۰)

ترجمہ: جب تم میں سے کسی پر موت (کا وقت قریب) آجائے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر والدین اور رشتہ داروں کے لئے مناسب طریقہ پر وصیت کرنا فرض ہے، یہ تقویٰ والوں پر لازم ہے۔

بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ ابتداء میں مرنے والے کا مال اس کے لڑکے کو ملتا تھا، اور والدین کے لئے وصیت ہوتی تھی، یعنی والدین اور دوسرے رشتہ داروں کو بھی اگر مال کا استحقاق ہوتا تو اس کی وصیت کے مطابق ہوتا تھا، کیونکہ ابھی شریعت نے کسی رشتہ دار کا حصہ مقرر نہیں کیا تھا، اور اپنے مال سے متعلق یہ وصیت کرنا ہر شخص پر واجب تھا، بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو بھی منسوخ کر دیا، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"عن ابن عباسؓ قال: كان المال للولد، وكانت الوصية للوالدين، فنسخ الله من ذلك ما أحب، فجعل للذكر مثل حظ الأنثيين، وجعل للأبوين لكل واحد منهما السدس، وجعل للمرأة الثمن والربع، وللزوج الشطر والربع۔" (صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث الزوج مع الولد، حدیث ٦٧٣٩)

روایت کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

''ابتداء میں مورث کا سارا مال اس کے لڑکے کا ہوتا تھا، البتہ اس کے ماں باپ کو اس کی وصیت کے مطابق مال کا استحقاق ہوتا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا، اور بیٹے کے لئے بیٹی کا دوگنا اور ماں باپ میں سے ہر ایک کے لئے سدس (یعنی چھٹا حصہ) اور بیوی کے لئے ثمن (یعنی آٹھواں حصہ) اور بعض صورتوں میں ربع (یعنی چوتھائی حصہ) اور شوہر کے لئے نصف (یعنی آدھا حصہ) اور بعض صورتوں میں ربع (یعنی چوتھائی

حصہ) مشروع کر دیا۔

اسلامی قانون میراث کا تیسرا مرحلہ

اسلامی قانون میراث کا تیسرا مرحلہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ سورہ نساء کی آیت میراث "یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِیٓ أَوۡلَادِکُمۡ" پورا رکوع نازل ہوا، جس میں تعیین کے ساتھ ہر ہر وارث کے حصہ اور اس کی نوعیت و کیفیت کو بھی بیان کر دیا گیا ہے۔

علامہ عینیؒ اور دوسرے مفسرین و محدثین نے تصریح فرمائی ہے کہ مذکورہ آیت میراث نے سابقہ حکم کو بھی منسوخ کر دیا جس میں مرنے والے کو وصیت کرنا فرض قرار دیا گیا تھا۔ (عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری، جلد ۲۳، صفحہ ۲۴۲)

اسی کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کے سامنے ارشاد فرمایا جس کو امام ترمذیؒ نے نقل فرمایا ہے:

"إن اللہ أعطی لکل ذی حق حقہ فلا وصیة لوارث۔" (جامع الترمذی، أبواب الوصایا، حدیث ۲۱۲۰)

''اللہ تعالیٰ نے ہر ایک حق والے کو اس کا حق خود دے دیا ہے اس لئے اب کسی وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔''

اسی حدیث میں بروایت ابن عباسؓ یہ الفاظ بھی منقول ہیں: "لا وصیة لوارث إلا أن تجیزہ الورثة۔"

''کسی وارث کے لئے وصیت اس وقت تک جائز نہیں جب تک باقی سب وارث اجازت نہ دے دیں۔'' (معارف القرآن، جلد اول، صفحہ ۴۳۹)

اسلامی قانون میراث کا یہ تیسرا اور آخری مرحلہ ہے جس نے میراث کے سلسلہ کے سابقہ حکم کو بھی منسوخ کر دیا، اور قیامت تک کے لئے اب میراث کا یہی قانون متعین ہو گیا، رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اسی کے مطابق اعلان کر دیا، اور تمام صحابہ

اس کے شاہد بن گئے۔

آیت میراث میں ذکر کردہ احکام میراث اور وارثوں کے حصے اتنی وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں کہ اس میں کسی صحابی اور ائمہ مجتہدین میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے، نیز نماز و روزہ کی تعداد کی طرح اس کے احکام و سہام اتنے واضح اور بدیہی ہیں کہ ان میں کسی فرد یا جماعت کے لئے اپنی عقل و فہم اور کسی قیاس کی بھی گنجائش نہیں، شریعت نے نظام میراث میں خواتین کے جو بھی حصے متعین کئے ہیں وہ بھی بلاشبہ انسانی فطرت اور عدل و عقل کے مطابق ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے میراث کے باب میں خواتین کو کتنی اہمیت دی ہے، جس کا مختصر تذکرہ درج ذیل ہے:

رہتی دنیا تک سارے عالم پر اسلام کا احسان

جیسا کہ ماقبل میں عرض کیا گیا کہ اسلام سے پہلے دوسرے مذاہب اور دور جاہلیت میں عرب و عجم کے لوگوں میں نابالغ بچوں اور عورتوں کو میراث دینے کا رواج نہ تھا، ان کے عرف میں استحقاق میراث کے لئے ایسا مرد ہونا لازمی شرط تھی جو میدان جنگ میں لڑائی کر کے مال غنیمت حاصل کر سکے، اس بناء پر عورتیں اور چھوٹے بچے میراث سے محروم رہتے تھے، اسلام نے آ کر اس ظالمانہ رواج کو ختم کیا، اور قطعی طور پر حکم دیا کہ میراث کا استحقاق قریبی رشتہ داروں کو ہے خواہ مرد ہو یا عورت، بڑے ہوں یا چھوٹے، بالغ ہوں یا نابالغ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

"لِلرِّجَالِ نَصِیبٌ مِّمَّا تَرَکَ الۡوَالِدَانِ وَالۡأَقۡرَبُوۡنَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِیبٌ مِّمَّا تَرَکَ الۡوَالِدَانِ وَالۡأَقۡرَبُوۡنَ مِمَّا قَلَّ مِنۡهُ أَوۡ کَثُرَ نَصِیبًا مَّفۡرُوۡضًا۔" (سورہ نساء، آیت ۷)

ترجمہ: والدین اور قرابت داروں نے جو کچھ چھوڑا ہے اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے، اور والدین اور قرابت داروں کے متروکہ میں عورتوں کا بھی حصہ ہے، چاہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ مقرر کیا ہوا حصہ ہے۔

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

اسلام سے پہلے عرب اور عجم کی قوموں میں انسان کی صنف ضعیف یتیم بچے اور صنف نازک عورتیں ہمیشہ طرح طرح کے ظلم وستم کا شکار رہے ہیں، اول تو ان کا کوئی حق ہی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، اور اگر کوئی حق مان بھی لیا گیا تو مردوں سے اس کا وصول کرنا اور اس کا محفوظ رکھنا کسی کی قدرت میں نہ تھا۔

اسلام نے سب سے پہلے ان کو حقوق دلائے پھر ان حقوق کی حفاظت کا مکمل انتظام کیا، قانون وراثت میں بھی عام اقوام دنیا نے معاشرہ کے ان دونوں ضعیف اجزاء کو ان کے فطری اور واجبی حقوق سے محروم کیا ہوا تھا۔

عرب نے تو اصول ہی یہ بنالیا تھا کہ وراثت کا مستحق صرف وہ ہے جو گھوڑے پر سوار ہو، اور دشمنوں کا مقابلہ کر کے اس کا مال غنیمت جمع کرے۔ (روح المعانی، ج۴، ص:۲۱۰)

ظاہر ہے کہ یہ دونوں صنف ضعیف بچے اور عورتیں اس اصول پر نہیں آسکتیں، اس لئے ان کے اصول وراثت کی رو سے صرف جوان بالغ لڑکا ہی وارث ہوسکتا تھا، لڑکی مطلقاً وارث نہ سمجھی جاتی تھی، خواہ بالغ ہو یا نابالغ، اور لڑکا بھی اگر نابالغ ہوتا تو وہ بھی مستحق وراثت نہ تھا۔

رسول کریم ﷺ کے عہد مبارک میں ایک واقعہ پیش آیا کہ اوس بن ثابتؓ کا انتقال ہوا، اور دو لڑکیاں ایک لڑکا نابالغ اور ایک بیوی وارث چھوڑے، مگر عرب کے قدیم دستور کے مطابق ان کے دو چچازاد بھائیوں نے آکر مرحوم کے پورے مال پر قبضہ کرلیا، اور اولاد اور بیوی میں سے کسی کو کچھ نہ دیا، کیونکہ ان کے نزدیک عورت مطلقاً مستحق وراثت نہ سمجھی جاتی تھی، خواہ بالغ ہو یا نابالغ، اس لئے بیوی اور دونوں لڑکیاں تو یوں محروم ہوگئیں، اور لڑکا بوجہ نابالغ ہونے کے محروم کردیا گیا، لہٰذا پورے مال کے وارث دو چچازاد بھائی ہوگئے۔

اوس بن ثابتؓ کی بیوہ نے یہ بھی چاہا کہ یہ چچازاد بھائی جو پورے ترکہ پر قبضہ کر رہے ہیں، ان دونوں لڑکیوں سے شادی بھی کرلیں تاکہ ان کی فکر سے فراغت ہو، مگر انہوں نے یہ بھی قبول نہ کیا، تب اوس بن ثابتؓ کی بیوہ نے رسول کریم ﷺ سے عرض حال کیا، اور

اپنی اور اپنے بچوں کی بے کسی اور محرومی کی شکایت کی، اس وقت تک چونکہ قرآن حکیم میں آیت میراث نازل نہ ہوئی تھی، اس لئے آنحضرت ﷺ نے جواب دینے میں توقف کیا، آپ ﷺ کو اطمینان تھا کہ وحی الٰہی کے ذریعہ اس ظالمانہ قانون کو ضرور بدلا جائے گا، چنانچہ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

نیز ایک اور بات اسی لفظ "أقربون" نے یہ بتلائی کہ جس طرح مردوں کو مستحق وراثت سمجھا جاتا ہے اسی طرح عورتوں اور بچوں کو بھی اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ رشتہ اولاد کا ہو یا ماں باپ کا، یا دوسرے قسم کے رشتے ہوں ہر ایک میں رشتہ داری کی حیثیت لڑکے اور لڑکی میں یکساں ہے، جس طرح لڑکا ماں باپ سے پیدا ہوا ہے، اسی طرح لڑکی بھی انہیں سے پیدا ہوئی ہے، جب حق وراثت کا مدار رشتہ پر ہے تو چھوٹے بچے یا لڑکی کو محروم کرنے کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ (معارف القرآن، سورہ نساء، جلد۲، صفحہ۳۰۹)

اور جو لوگ نابالغ اولاد اور یتیم بچوں کو ان کا حق میراث نہیں دیتے بلکہ خود اس پر قابض ہو جاتے یا اپنے استعمال میں لے آتے ہیں، قرآن نے اس کے متعلق سخت وعید بیان فرمائی ہے، ارشاد خداوندی ہے:

"إِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ الْيَتَامٰى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا۔" (سورہ نساء، پ ٤، آیت ١٠)

ترجمہ: بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ بس اپنے پیٹ میں آگ ہی بھرتے ہیں اور عنقریب وہ دہکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ علامہ ابن کثیرؒ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

بعض روایات میں ہے کہ یتیم کا مال ناحق کھانے والا قیامت کے روز اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ پیٹ کے اندر آگ کی لپٹیں اس کے منہ، ناک اور کانوں، آنکھوں سے نکل رہی ہوں گی۔

اور رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک قوم قیامت کے روز اس طرح اٹھائی جائے گی کہ ان کے منہ آگ سے بھڑک رہے ہوں گے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن میں نہیں پڑھا "إن الذين يأكلون أموال۔۔۔۔الخ۔"

"عن أبي برزة أن رسول الله ﷺ قال: يبعث يوم القيامة القوم من قبورهم تأجج أفواههم نارا، قيل: يا رسول الله! من هم؟ قال: ألم تر أن الله قال: إن الذين يأكلون أموال۔۔۔الخ" (تفسير ابن كثير، جلد اول، صفحه ٤٥٦)

آیت کے مضمون کا خلاصہ یہ ہوا کہ یتیم کا مال جو ناحق کھایا جائے وہ درحقیقت جہنم کی آگ ہوگی، گو اس وقت اس کا آگ ہونا محسوس نہ ہو، اسی لئے رسول کریم ﷺ نے اس معاملہ میں شدید احتیاط کے لئے واضح ہدایات دی ہیں، حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "أحرّج مال الضّعيفين المرأة واليتيم۔"

"میں تم کو خاص طور پر دو ضعیفوں کے مال سے بچنے کی تنبیہ کرتا ہوں ایک عورت اور دوسرے یتیم۔" (تفسیر ابن کثیر، جلد اول، صفحہ ۴۵۶، معارف القرآن، جلد دوم، صفحہ ۳۱۵)

نیز یتیم کا مال کھانے والوں کے بارے میں صحیحین کی یہ روایت بھی ہے:

"عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: اجتنبوا السبع الموبقات، قيل: يا رسول الله! وما هي؟ قال: الشرك بالله، والسحر، وقتل النفس التي حرم الله إلا بالحق، وأكل الربا، وأكل مال اليتيم، والتولي يوم الزحف، وقذف المحصنات المؤمنات الغافلات۔" (صحيح بخاري، كتاب الوصايا، حديث ٢٧٦٦، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، حديث ٢٦٣)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو، صحابہ نے سوال کیا کہ وہ سات چیزیں کیا ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، جادو کرنا، ناحق کسی کا خون کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، میدان جنگ

سے پیٹھ پھیر کر بھاگنا اور بھولی بھالی پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا۔

استحقاق میراث کی بنیاد محض قرابت ہے نہ کہ خدمت وحاجت

اس موقع پر اس کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ قرآن پاک کی آیت "وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ" اور "مَا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ" سے فقہاء اور مفسرین نے یہ سمجھا اور بیان کیا ہے کہ:

وارثوں کے استحقاق میراث کی علت اور اس کی بنیاد خونی رشتہ اور قرابت داری ہے نہ کہ محض حاجت وخدمت اور دوسرے اسباب، مثال کے طور پر کسی شخص کا کوئی نافرمان بیٹا ہے، جس نے زندگی بھر اپنے باپ کی نافرمانی کی، نہ کبھی خدمت کی، اور نہ بیماری کے زمانہ میں کبھی قریب آیا، ساری خدمت، تیمار داری، تمام اخراجات وغیرہ دوسرے رشتہ داروں، بھائیوں وغیرہ نے برداشت کئے، تب بھی اس شخص کے مرنے کے بعد شرعی ضابطہ کے تحت وہ نافرمان بیٹا ہی اس کے مال کا وارث ہوگا، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ برسہا برس تک چونکہ اس کے بھائیوں نے خدمت کی ہے، لہٰذا ان کو اس کے مال کا وارث بنا دیا جائے۔

اسی طرح مثلاً کسی شخص کا انتقال ہوا اس کا ایک بیٹا نہایت غنی اور مالدار ہے جب کہ مرنے والے کا کوئی پوتا یا اس کی بہنیں سخت محتاج اور ضرورت مند ہیں، تو یہاں شرعی ضابطہ کے تحت یہ نہیں کیا جاسکتا کہ بیٹے کو اس کے غنی ہونے کی وجہ سے مال نہ دے کر اس کی پھوپھی یعنی مرنے والے کی بہنوں یا پوتوں کو محض ان کے فقر اور حاجت مند ہونے کی وجہ سے دے دیا جائے، اگر ایسا کیا جائے گا تو خلاف شرع اور ناجائز ہوگا، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس مسئلہ پر اچھی روشنی ڈالی ہے، تحریر فرماتے ہیں:

لفظ "أقربون" سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مال وراثت کی تقسیم ضرورت کے معیار سے نہیں بلکہ قرابت کے معیار سے ہے، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ رشتہ داروں میں جو زیادہ غریب اور حاجت مند ہو اس کو زیادہ وراثت کا مستحق سمجھا جائے، بلکہ جو

میت کے ساتھ رشتہ میں قریب تر ہوگا، وہ بہ نسبت بعید کے زیادہ مستحق ہوگا، اگرچہ ضرورت اور حاجت بعید کو زیادہ ہو، اگر اقربیت کے ضابطہ کو چھوڑ کر بعض رشتہ داروں کے محتاج یا نافع ہونے کو معیار بنالیا جائے تو نہ اس کا ضابطہ بن سکتا ہے، اور نہ یہ ایک طے شدہ مستحکم قانون کی شکل اختیار کرسکتا ہے، کیونکہ اقربیت کے علاوہ دوسرا معیار لامحالہ وقتی واجتہادی ہوگا، کیونکہ فقر وحاجت کوئی دائمی چیز نہیں، اس لئے کہ حالات بھی بدلتے رہتے ہیں اور درجات بھی، ایسی صورت میں استحقاق کے بہت سے دعوے دار نکل آیا کریں گے، اور فیصلہ کرنے والوں کو بھی اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہوگا۔ (معارف القرآن، جلد دوم، صفحہ ۳۱۱)

لڑکی کا حصہ لڑکے کے مقابلہ میں کم کیوں؟ ایک جائزہ

اسلام کے دیئے ہوئے نظام میراث میں بعض معترضین کی طرف سے یہ اشکال کیا جاتا ہے کہ بیٹے کے مقابلہ میں بیٹی کو، بھائی کے مقابلہ میں بہن کو نصف حصہ ملتا ہے، یعنی مرد کو عورت کے مقابلہ میں دوگنا ملتا ہے، ایسا کیوں؟ اس کی وجہ کیا ہے؟

اس کا اصولی جواب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ علیم وحکیم اور خالق ومالک ہے، اس نے اپنے بندوں کے لئے اپنی حکمت سے یہی حکم تجویز کیا ہے، بندوں کو اس پر ایمان لانا اور اس کے مطابق عمل کرنا بہر حال ضروری اور لازم ہے، اس میں چوں چرا کرنے کا کسی کو حق نہیں، اس کی حکمتوں کا احاطہ بندے نہیں کرسکتے۔

دوسرے لاکھوں کروڑوں بندوں کی لاکھوں کروڑوں عقلیں ہیں، اگر کسی بندہ کی عقل وفہم کے مطابق لڑکی اور لڑکے کے حصہ میں مساوات ہونا چاہئے، تو دوسرے عقلاء کے نزدیک لڑکے کی خصوصیات کی بناء پر اس کا دوگنا حصہ ہونا چاہئے، اب ہزاروں لاکھوں عقلوں میں سے کس کی عقل کو معیار قرار دیا جائے، اور کس کو ترجیح دی جائے، سیدھی بات یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ علیم وحکیم خالق ومالک اور شارع ہے، اس نے اپنے بندوں کے لئے جو بھی حکم مشروع کردیا سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس کا ماننا اور اس کے مطابق عمل کرنا بندوں

کے لئے ہر حال میں ضروری ہے۔

دوسرے یہ اعتراض بھی علی الاطلاق صحیح نہیں کہ شریعت میں میراث میں عورتوں کا حصہ مردوں کے مقابلہ میں ہمیشہ آدھا ہی ہوتا ہے، بہت سے صورتوں میں مردوں اور عورتوں کا حصہ برابر ہوتا ہے، بلکہ بعض صورتوں میں عورت کا حصہ مرد کے حصہ سے زیادہ بھی ہوجاتا ہے، جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

وہ صورتیں جن میں مردوں اور عورتوں کا حصہ برابر ہے

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

جن بعض صورتوں میں عورتوں کا حصہ مردوں کے برابر ہوتا ہے ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) میت نے ماں، باپ اور بیٹے کو چھوڑا ہو تو ماں اور باپ دونوں کو چھٹا حصہ ملے گا۔ (اس میں ماں اور باپ کا حصہ الگ الگ ہوگا)

(۲) اسی طرح اس نے اگر ماں، باپ اور دو بیٹیوں کو چھوڑا تب بھی ماں اور باپ دونوں کو چھٹا حصہ ملے گا، اور دو تہائی بیٹیوں کو ملے گا۔

(۳) اسی طرح اگر کسی عورت نے شوہر باپ، ماں اور ایک بیٹی کو چھوڑا تو اس صورت میں بھی ماں اور باپ چھٹے حصہ کے مستحق ہوں گے۔

(۴) ماں شریک بھائی، بہن کا حصہ بھی برابر ہوگا، جیسے ایک عورت نے شوہر، ماں اور ماں شریک بھائی کو چھوڑا تو ماں شریک بھائی چھٹے حصہ کا مستحق ہوگا، اگر شوہر اور ماں کے علاوہ صرف اخیافی بہن کو چھوڑا تو وہ بھی چھٹے حصہ کی ہی مستحق ہوگی۔

(۵) اسی طرح اگر کسی عورت کا انتقال ہوا اس کے ورثاء شوہر، ماں، اخیافی بھائی اور اخیافی بہن ہو تو نصف شوہر کا حصہ ہوگا، چھٹا حصہ ماں کا اور ایک تہائی میں بھائی اور بہن کا حصہ برابر ہوگا۔

(۶) بہت سی حالتیں ایسی ہیں کہ اگر مرنے والے کا ایک ہی وارث ہو، خواہ مرد

ہو یا عورت، وہ پورے ترکہ کا حقدار قرار پاتا ہے، جیسے باپ، بیٹا، بھائی، شوہر، ماموں اور چچا، اسی طرح خاتون رشتہ داروں میں ماں، بیٹی، بہن، بیوی، خالہ اور پھوپھی۔

مثلاً اگر کسی شخص کے انتقال پر صرف اس کا ایک بیٹا ہی باقی بچا تو وہ پورے ترکہ کا حقدار ہوگا، اس لئے کہ وہ عصبہ ہے، اسی طرح اگر اس نے صرف بیٹی کو چھوڑا ہو تو وہ پورے ترکہ کی حقدار ہوگی، نصف تو اس کا متعینہ حصہ ہوگا، اور باقی نصف بھی شرعی ضابطہ کے تحت اس کو بطور ''رد'' کے ملے گا۔

(۷) بعض دفعہ حقیقی بہن اور حقیقی بھائی کا حصہ بھی برابر ہو جاتا ہے، جیسے ایک عورت نے شوہر اور ایک حقیقی بھائی کو چھوڑا تو نصف شوہر کا حق ہوگا، اور نصف بھائی کا، اسی طرح اگر شوہر اور حقیقی بہن کو چھوڑا تو نصف شوہر کا حصہ ہوگا، اور نصف حقیقی بہن کا، اور اگر اس نے شوہر اور حقیقی بھائی کے علاوہ ایک بیٹی کو بھی چھوڑا ہو تو شوہر چوتھائی ترکہ کا اور بیٹی نصف ترکہ کی مستحق ہوگی، باقی بھائی کا ہوگا، اگر یہاں حقیقی بھائی کے بجائے حقیقی بہن ہو تو باقی اس کو ملے گا۔

(۸) بلکہ بعض دفعہ تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ حقیقی بھائی اور ماں شریک بہن کا حصہ برابر ہو جاتا ہے۔

مثلاً کسی عورت نے شوہر، ماں، ماں شریک بہن اور حقیقی بھائی کو چھوڑا ہو تو نصف ترکہ کا مستحق شوہر ہوگا، چھٹا حصہ ماں کو ملے گا، حقیقی بھائی اور اخیافی بہن دو چھٹے حصہ کے حقدار ہوں گے، حالانکہ رشتہ کے اعتبار سے یہ بھائی اس بہن سے زیادہ قریب ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں ورنہ بہت سی ایسی صورتیں بنتی ہیں جن میں عورت اپنے ہم درجہ مرد رشتہ دار سے زیادہ کی مستحق ہوتی ہے۔

وہ صورتیں جن میں عورتوں کا حصہ مردوں سے بھی زائد ہوتا ہے

نیز حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی تحریر فرماتے ہیں:

بہت سی صورتوں میں عورتوں کا حصہ مردوں سے بڑھ جاتا ہے، چند صورتیں ذیل میں نقل کی جاتی ہیں:

(۱) اگر کسی عورت کا انتقال ہوا اور اس نے شوہر، باپ، ماں اور دو بیٹیوں کو چھوڑا اور بالفرض اس کا ترکہ ساٹھ لاکھ روپئے پر مشتمل ہو تو دونوں بیٹیوں کو بتیس لاکھ روپئے فی کس سولہ لاکھ روپئے ملیں گے، اور اگر اس نے شوہر باپ اور ماں کے علاوہ دو بیٹوں کو چھوڑا ہو تو وہ پچیس لاکھ یعنی فی کس ساڑھے بارہ لاکھ روپئے کے حقدار ہوں گے۔

(۲) اسی طرح اگر کسی عورت کے ورثاء میں شوہر، ماں اور حقیقی بہنیں ہوں اور مثال کے طور پر اس کا ترکہ اڑتالیس لاکھ ہو تو دونوں بہنوں کو چوبیس یعنی فی کس بارہ لاکھ ملے گا، اور اسی صورت میں اگر دو بہنوں کے بجائے دو حقیقی بھائی ہوں تو ان کا حصہ سولہ لاکھ یعنی فی کس آٹھ لاکھ ہوگا، ان صورتوں میں عورت کا مقررہ حصہ دو تہائی اس حصہ سے بڑھ جاتا ہے، جو مرد کو بطور عصبہ حاصل ہوتا ہے۔

(۳) بعض صورتوں میں عورت نصف ترکہ کی مستحق ہوتی ہے، یہ اس کا مقررہ حصہ ہے جب کہ اس کے ہم درجہ مرد کا حصہ کم بنتا ہے، جیسے ایک عورت نے شوہر باپ ماں اور ایک بیٹی کو چھوڑا ہو تو اگر ترکہ ایک کروڑ چھپن لاکھ روپئے پر مشتمل ہو تو بیٹی بہتر لاکھ کی مستحق ہوگی، اس صورت میں اگر بیٹی کی جگہ بیٹا ہو تو اس کا حصہ پینسٹھ لاکھ ہوگا۔

(۴) بعض دفعہ تو یہ فرق بہت زیادہ ہو جاتا ہے، جیسے کسی عورت کے ورثاء میں شوہر، ماں اور حقیقی بہن ہو اور فرض کیجئے کہ مرحومہ کا ترکہ اڑتالیس لاکھ ہو تو بہن کا حصہ اٹھارہ لاکھ ہوگا، اور اس صورت میں اگر بہن کے بجائے بھائی ہو تو اس کا حصہ صرف آٹھ لاکھ ہوگا۔

(۵) بعض دفعہ عورت کا مقررہ تہائی حصہ بھی اپنے مقابل مرد رشتہ دار سے زیادہ ہو جاتا ہے۔

مثلاً ایک شخص نے بیوی، ماں، دو حقیقی بھائی اور دو ماں شریک بہنوں کو چھوڑا اور فرض کیجئے کہ مرنے والے کا ترکہ اڑتالیس لاکھ روپئے تھا تو دونوں ماں شریک بہنوں کو سولہ

لاکھ یعنی فی کس آٹھ لاکھ روپئے ملیں گے، اور دونوں حقیقی بھائیوں کا حصہ بارہ لاکھ یعنی فی کس چھ لاکھ ہوگا، اسی طرح اگر عورت نے شوہر، دو ماں شریک بہنوں اور دو حقیقی بھائیوں کو چھوڑا ہو اور مثلاً اس کا ترکہ ساٹھ لاکھ روپئے ہو تو دونوں بہنوں کا حصہ بیس لاکھ ہوگا، اور دونوں بھائیوں کا دس لاکھ۔

(۶) بعض دفعہ خواتین کا مقررہ حصہ ترکہ کا چھٹا حصہ ہوتا ہے، لیکن وہ اس کے مقابل مرد رشتہ دار سے بڑھ جاتا ہے، جیسے ماں شریک بہن کا مقررہ حصہ چھٹا حصہ ہے، اب اگر کسی عورت نے شوہر ماں ایک ماں شریک بہن اور دو حقیقی بھائیوں کو چھوڑا ہو تو اگر ساٹھ لاکھ ترکہ ہو تو بہن کو دس لاکھ ملے گا اور دو بھائیوں کو بھی دس لاکھ یعنی فی کس پانچ لاکھ ملے گا، اس طرح کی اور بھی متعدد صورتیں ہیں۔

وہ صورتیں جن میں صرف عورت ہی وارث بنتی ہے

آگے تحریر فرماتے ہیں:

بعض حالتیں ایسی ہیں کہ جن میں عورت وارث بنتی ہے، مرد وارث نہیں بنتا۔

جیسے ایک عورت نے، شوہر، باپ، ماں، بیٹی اور پوتی کو چھوڑا ہو تو پوتی چھٹے حصہ کی حقدار ہوگی، لیکن اس صورت میں اگر پوتی کے بجائے پوتا ہو تو اس کو کچھ نہیں ملے گا۔

اسی طرح اگر شوہر، حقیقی بہن اور باپ شریک بہن وارث ہو تو باپ شریک بہن چھٹے حصہ کی مستحق ہے، اور اگر اس کی جگہ باپ شریک بھائی ہو تو اس کو کچھ نہیں ملے گا، ان کے علاوہ بھی متعدد صورتیں ہیں جن میں خواتین حصہ پاتی ہیں اور ان کے مقابل مرد رشتہ دار حصہ نہیں پاتے۔ (خواتین کے مالی حقوق، صفحہ ۱۱ تا ۱۵)

البتہ عام حالات میں اکثر صورتوں میں شریعت کا حکم یہی ہے کہ "لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ" یعنی مؤنث کے مقابلہ میں مذکر یعنی لڑکی کے مقابلہ میں لڑکے کو اور بہن کے مقابلے میں بھائی کو دوگنا حصہ ملے گا، حکماء اسلام نے اس کی کچھ حکمتیں اور مصلحتیں

بیان کی ہیں، جو آگے آرہی ہیں۔

ایک ضروری تنبیہ اور غلط فہمی کا ازالہ

اس موقع پر یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ میراث کے باب میں شریعت نے جن جن وارثوں کے جو بھی حصے متعین کئے ہیں ان سب کا دار و مدار اصلاً اوامر الٰہیہ اور ایسے نصوص قطعیہ پر ہے جس میں عقل و قیاس کی کوئی گنجائش نہیں، فقہاء و اصولیین ایسے اوامر کو "امر تعبدی" سے تعبیر کرتے ہیں، جس طرح نماز میں رکعتوں کی تعداد، زکوٰۃ میں نصاب وغیرہ میں کسی قسم کی کمی وبیشی کا امکان نہیں اسی طرح میراث کے حصوں اور وارثوں کی تعیین میں ہزار مصلحتوں اور علتوں کے نکالنے کے بعد بھی کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی، دنیا بھر کے عقلاء، حکماء، علماء و قانون ساز کمیٹیاں بھی مل کر میراث کے باب میں عقلی مصلحتوں اور حکمتوں کو بیان کر کے کسی وارث کے حصہ میں کمی وبیشی یا کسی نوع کی تبدیلی کرنا چاہیں تو شرعاً ان کو اس کا حق حاصل نہیں۔

ان سب کے باوجود حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی کتاب "المصالح العقلية للأحكام النقلية" میں اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے "حجة الله البالغة" میں وارثوں کے حصوں کی تعیین کی کچھ مصلحتیں اور حکمتیں بیان کی ہیں، مثلاً کسی وارث کو حصہ ملنے یا زائد ملنے میں اس کی خدمت یا ضرورت و احتیاج کا بھی تذکرہ کیا ہے، جس کی بنیاد پر شاید کوئی یہ کہنے لگے کہ جب اس کی بنیاد خدمت و حاجت پر ہے تو فلاں موقع میں فلاں رشتہ دار نے زیادہ خدمت کی تھی یا وہ زیادہ حاجت مند ہے، لہٰذا اس کو زیادہ حصہ ملنا چاہئے، اور فلاں اس وصف سے محروم ہے، لہٰذا اس کو میراث سے محروم کر دینا چاہئے، یا اس کا حصہ کم کر دینا چاہئے، ایسا کرنے کی کسی کو اجازت نہیں، باقی حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور دوسرے حضرات نے میراث کے باب میں اس نوع کی جن عقلی مصلحتوں و حکمتوں کا تذکرہ کیا ہے، ان کی حیثیت محض حکمت و

مصلحت کی ہے نہ کہ علت کی، علت اور حکمت میں بڑا فرق ہے، احکام شرعیہ کا مدار شرعی علتوں پر ہوتا ہے نہ کہ محض مصلحتوں اور حکمتوں پر۔

مثال کے طور پر نماز وروزہ کی عقلی مصلحتیں اور اس کے کچھ روحانی وجسمانی فوائد بھی ہیں، مثلاً نماز پڑھنے سے تواضع پیدا ہوتی ہے، جسمانی ورزش بھی ہوتی ہے، نیز باجماعت نماز پڑھنے سے اتحاد واتفاق کا مظاہرہ ہوتا ہے، روزہ رکھنے سے قوت بہیمیہ کو شکست ہوتی ہے، یعنی نفس مغلوب ہوتا ہے، صحت کے لئے بھی روزہ رکھنا مفید ہے، زکوٰۃ دینے سے بخل کا ازالہ ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ، اب اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ نماز وروزہ اور ادائیگی زکوٰۃ کے بغیر بھی اس کو یہ اوصاف حاصل ہیں، لہٰذا نماز وروزہ کی اس کو کوئی ضرورت نہیں، یا نماز وروزہ کرنے کے بعد بھی کسی کے اندر یہ اوصاف پیدا نہیں ہوئے لہٰذا اس کا نماز روزہ باطل ہوا، ایسا سمجھنا ہرگز صحیح نہیں، کیونکہ احکام شرعیہ کا مدار اسرار ومصالح پر نہیں ہے، بلکہ علل شرعیہ پر ہے، اس لئے میراث کے متعلق جن حکماء اسلام نے بھی وارثوں کے حصوں کی عقلی حکمتیں و مصلحتیں بیان فرمائی ہیں وہ ان کی علل نہیں ہیں کہ جن کے پائے یا نہ پائے جانے سے حکم میں فرق پڑے، اور اس کی وجہ سے ہم وارثوں کے حصص شرعیہ میں کچھ ترمیم کرنے لگیں، ایسا کرنے کی ہرگز کسی کو اجازت نہیں، البتہ حکماء امت اور علماء راسخین نے وارثوں کے حصوں کی جو حکمتیں اور مصلحتیں بیان کی ہیں وہ محض اس وجہ سے کہ ان احکام شرعیہ پر عمل کرنے میں مزید اطمینان و انشراح حاصل ہو جائے، نہ کہ اس وجہ سے کہ ان مصلحتوں کو علتوں کا درجہ دے کر احکام میراث میں کچھ تبدیلی کی جائے۔

اس تمہید کے بعد ان حکمتوں و مصلحتوں پر نظر کرنا چاہئے جن کو میراث کے باب میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہم نے بیان فرمایا ہے۔

لڑکی کے مقابلہ میں لڑکے کو دوگنا ملنے کی عقلی مصلحتیں وحکمتیں

شریعت مقدسہ میں جن وارثوں کے جو بھی حصے متعین کئے گئے ہیں اگرچہ ان سب کی حیثیت امر تعبدی کی ہے کہ بندوں کو اس میں محض اپنی عقل وقیاس کے ذریعہ ذرہ برابر بھی کسی نوع کی تبدیلی، کمی وبیشی کی گنجائش نہیں، لیکن اس کے باوجود تمام حکماء اسلام کا دعویٰ ہے کہ شریعت نے جس وارث کا جو بھی حصہ متعین کیا ہے وہ عین عقل وفطرت، عدل وانصاف اور حکمت ومصلحت کے مطابق ہے، جس کی تفصیل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مطابق درج ذیل ہے:

شریعت نے میراث کے باب میں وارثوں کے مستحق یا محروم ہونے نیز کمی وبیشی کے ساتھ ان کے حصوں کے متعین ہونے کی بنیاد چار باتوں پر رکھی ہے:

(۱) عزت اور منصب میں مورث کی نیابت اور حمایت

(۲) خدمت ومحبت اور شفقت

(۳) صلہ رحمی اور قرابت

(۴) ضرورت وحاجت

یہ چار بنیادیں ہیں جن کی بناء پر شریعت نے وارثوں کو میراث کا مستحق بنایا ہے اور انہیں بنیادوں کی بناء پر ان کے میراث سے محروم ہونے نہ ہونے اور متعینہ حصوں میں کمی وبیشی کا فرق رکھا گیا ہے، میراث کے باب میں یہ چار بنیادیں ایسی ہیں جن کو حکماء اسلام نے قرآن پاک کی درج ذیل آیتوں سے سمجھا اور بیان کیا ہے، وہ آیتیں یہ ہیں:

(۱) ’’وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَى بِبَعْضٍ۔‘‘ (سورہ انفال: ۷۵)

ترجمہ: رشتہ دار ایک دوسرے (سے میراث) کے زیادہ حقدار ہیں۔

(۲) ’’الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ۔‘‘ (سورہ نساء، پ۵، آیت ۳۴)

ترجمہ: مرد عورتوں پر نگراں ہیں اس لئے کہ اللہ ہی نے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی ہے، اور اس لئے کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

(۳)لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيباً مَّفْرُوضاً۔"(سورہ نساء:۷)

ترجمہ: والدین اور قرابت داروں نے جو کچھ چھوڑا ہے اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے، اور والدین اور قرابت داروں کے متروکہ میں عورتوں کا بھی حصہ ہے، چاہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ مقرر کیا ہوا حصہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تصریح کے مطابق ان بنیادوں میں بھی سب سے زیادہ شریعت نے جس بات کا لحاظ کیا ہے، وہ قرابت اور خونی رشتہ ہے، اب ان بنیادوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے وارثوں کے مستحق یا محروم اور ان کے متعینہ حصوں کے تفاوت کو سمجھنا چاہئے۔

(۱)استحقاق میراث کی ایک بنیاد عزت و مرتبہ اور منصب میں نیابت اور قائم مقام ہونا ہے، نیز مورث کے جاہ و منصب کی حمایت اور حفاظت کرنا بھی ہے، اور انسانی فطرت کے لحاظ سے سب سے زیادہ اس کے مستحق، ذمہ دار، فکرمند، دخیل اور موثر وہ رشتہ دار ہوتے ہیں جو اس کے عمود اور صلب نسب میں شمار ہوتے ہیں، جیسے باپ، بیٹا، دادا، پوتا اس کے بعد بھائی، بہن، چچا وغیرہ، شریعت نے اس سلسلہ میں سب سے زیادہ ترجیح بیٹے کو دی ہے، کیونکہ انسانی فطرت وطبیعت اور عرف و عادت کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو بیٹا ہی باپ کے قائم مقام اور اس کا نائب سمجھا جاتا ہے، سلیم الطبع انسان کی خواہش اور اس کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ عزت و منصب میں اس کا بیٹا اس کے قائم مقام رہے، اسی کے خاطر لوگ نکاح کرتے اور اولاد کی تمنا کرتے ہیں، باپ اپنے بیٹے کا قائم مقام اور اس کا نائب بنے، یہ بات انسانی فطرت کے خلاف ہے، البتہ بیٹے کا اپنے باپ کے قائم مقام ہونا اور اس کی گدّی سنبھالنا یہ فطرت و عادت کے مطابق ہے اور اس نیابت میں بیٹے سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوسکتا، بیٹی اور دوسرے رشتہ دار بھی ہوتے ہیں تو اس درجہ میں نہیں جس درجہ میں بیٹا ہوتا ہے۔

نیز باپ کی عزت اور اس کے منصب کی حمایت و حفاظت کی جو فکر بیٹے کو ہوتی ہے

اور اس سلسلہ میں جو قربانی بیٹا دے سکتا ہے وہ بیٹی اور دوسرے رشتہ دار نہیں دے سکتے۔

نیز نسب اور خونی رشتہ میں بھی بیٹا اصل سمجھا جاتا ہے، کیونکہ خاندانی نسب اسی سے آگے چلتا ہے، شریعت نے بھی نسب میں باپ بیٹے کا اعتبار کیا ہے، اور ہر زمانہ میں عرف و عادت بھی یہی رہی ہے کہ کسی شخص کا سلسلہ نسب بیٹے سے چلتا ہے، بیٹی اور دوسرے رشتہ داروں سے نہیں، یعنی قرابت اور سلسلہ نسب چلنے میں بیٹے کے برابر کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح ضرورت و حاجت کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو بیٹے پر خود اس کی اور اس کی بیوی اور اولاد کے نفقہ کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے، اس کے برخلاف بیٹی جب تک غیر شادی شدہ ہے اس کا نفقہ باپ پر لازم ہے، شادی ہوجانے کے بعد اس کے نفقہ کی ذمہ داری اس کے شوہر پر عائد ہوتی ہے، اس کے اولاد کے نفقہ کی ذمہ داری بھی اس کے شوہر پر ہوتی ہے، بیوی پر نہیں، ان تمام وجوہات کی بناء پر شریعت نے میراث کا سب سے زیادہ مستحق بیٹے کو قرار دیا ہے، بیٹی میں مذکورہ بالا مصلحتیں و حکمتیں بیٹے کے مقابلہ میں کم درجہ میں پائی جاتی ہیں، کیونکہ باپ کا سلسلہ نسب اس سے نہیں چلتا، نیز بیٹے کی طرح بیٹی تمام امور میں اپنے باپ کی نیابت اور اس کی عزت و منصب کی حفاظت و حمایت بھی نہیں کرسکتی، ضرورت و حاجت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بیٹی کے مقابلہ میں بیٹے کی ضرورتیں و حاجتیں اس سے کہیں زائد ہیں اس لئے شریعت نے میراث میں بیٹی کے مقابلہ میں بیٹے کا حصہ دوگنا اور بیٹی کا بیٹے سے نصف رکھا ہے۔

یہ صرف ایک مثال ہے اسی طرح تمام ورثاء کے حصوں کو فرداً فرداً مذکورہ بالا چاروں بنیادوں کو سامنے رکھتے ہوئے اگر دیکھا جائے تو شریعت نے جس جس وارث کا جس صورت میں جتنا حصہ متعین کیا ہے یا کسی وارث کا حصہ کم کیا یا بالکل محروم کیا ہے وہ بلا شبہ عقل و فطرت اور انصاف کے مطابق ہے۔

دوسری مثال

اس کی ایک مثال اور لیجئے:

استحقاق میراث کا ایک سبب خدمت ومحبت اور شفقت بھی ہے، اور یہ سبب ماں، بیوی اور بیٹی میں بہ نسبت دوسرے رشتہ داروں کے زیادہ پایا جاتا ہے، اس لئے شریعت نے ماں بیوی اور بیٹی کو تو ہر حال میں وارث بنایا ہے، چنانچہ کسی صورت میں وہ محروم نہیں ہوتیں، پھر ان تینوں میں سب سے زیادہ شفقت ومحبت اور ہمدردی بندہ کو اپنی ماں سے حاصل ہوتی ہے، اس کے بعد بیوی سے، اس لئے شریعت نے ماں کا حصہ بیوی سے زائد ثلث (ایک تہائی) اور مورث کے اولاد ہونے کی صورت میں سدس (چھٹا حصہ) رکھا ہے، اور بیوی کا حصہ ربع (ایک چوتھائی) اور اولاد ہونے کی صورت میں ثمن (آٹھواں حصہ) مقرر کیا ہے، اور بیٹی کے اندر بھی شفقت وہمدردی دوسرے رشتہ داروں سے زیادہ ہوتی ہے، نیز باپ کی نسبت سے کسی درجہ میں وہ بھی اپنے باپ کی نیابت وحمایت کرتی ہے، لیکن بیٹے سے کم، اس لئے شریعت نے ماں اور بیوی سے زیادہ بیٹی کا حصہ متعین کیا ہے، یعنی بعض صورتوں میں نصف اور بعض صورتوں میں ثلثان (یعنی دو تہائی)، لیکن بیٹے کے مقابلہ میں بیٹی کا آدھا رکھا ہے، کیونکہ بیٹے کی طرح بیٹی نیابت وحمایت کے فرائض انجام نہیں دے سکتی۔ واللہ اعلم۔

اسی طرح دوسرے وارثوں کو سمجھنا چاہئے مثلاً مرنے والے کی بہنیں کہ ان کے اندر بھی میت کی طرف سے غم خواری، شفقت ومحبت کا عنصر پایا جاتا ہے، لیکن بیٹے، بیٹی، ماں اور بیوی سے کم، اس لئے بعض صورتوں میں ان کا حصہ کم ہوتا ہے، اور بعض صورتوں میں یہ محروم بھی ہوجاتی ہیں، جس کی تفصیل کتب میراث میں موجود ہے۔

اسی طرح اور دوسرے ورثاء کو اگر دیکھا جائے تو ان کے حصوں کی کمی اور محرومی انہیں چار بنیادوں کی بناء پر ہوگی، اگر کسی وارث میں بظاہر اس کے خلاف بھی ہو تو وہ یا تو کسی عارض کے سبب ہوگا یا بعض حالات میں اس وارث کی کسی خصوصیت کی بناء پر ہوگا، جو اس کے اندر پائی جاتی ہے۔

الغرض شریعت مقدسہ میں کسی بھی وارث کا حصہ کم یا زیادہ ہونا یا اس کا بالکل محروم ہونا بے معنی اور بلا وجہ نہیں بلکہ نہایت معقول اور صحیح بنیادوں پر ہے، کسی سلیم الطبع کامل العقل

کے نزدیک اس سے بہتر کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

یہ خلاصہ ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بیان کا۔

ایک بڑا مغالطہ اور اس کا جواب

ہوسکتا ہے کسی عقل مند کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب میراث کی بنیاد ان چار امور پر ہے، یعنی عزت ومنصب میں نیابت، یا خدمت وشفقت وغیر ذلک، تو اگر کوئی قریبی وارث بھی مثلاً بیٹا یا بیوی ان صفات سے خالی ہوں جن کی بنیاد پر میراث کا استحقاق ہوتا ہے تو کیا ایسی صورت میں بھی بیٹے یا بیوی کو وراثت کا استحقاق ہوگا؟ عقل کا تقاضا تو یہی ہے کہ جب کوئی وارث استحقاق میراث کی ان بنیادی صفات سے خالی ہو تو اس کو میراث سے محروم ہونا چاہئے، جب کہ شریعت ہر صورت میں وارث بناتی ہے، ایسا کیوں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ماقبل میں یہ بات عرض کی جاچکی ہے کہ استحقاق میراث کا اصل سبب تو قرابت داری یعنی خونی رشتہ ہونا ہے، باقی اوصاف جو حکماء اسلام نے بیان کئے ہیں، ان کی حیثیت علت کی نہیں ہے جس کے پائے جانے نہ پائے جانے سے اصل حکم میں فرق پڑتا ہے، بلکہ ان کی حیثیت محض مصلحت وحکمت اور نکتہ کی سی ہے کہ ان کے وجود وعدم سے نفس حکم میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ اب نفس قرابت ورشتہ داری ہی علت وسبب کے قائم مقام ہے، لہٰذا اب حکم کا مدار محض قرابت کی بناء پر ہوگا، ان اوصاف واسباب کی بناء پر نہ ہوگا۔

دینی مثالوں میں اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حالت سفر میں قصر صلوٰۃ یعنی بجائے چار رکعت کے دو رکعت پڑھنے کا حکم ہے، اور اصولیین کی تصریح کے مطابق اصل علت تو اس کی مشقت ہے، لیکن مشقت کا ہونا نہ ہونا یہ اعتباری امر ہے اور اس کا فیصلہ دشوار تر ہے کہ سفر میں مشقت ہے یا نہیں، کسی کو ہے کسی کو نہیں، کبھی ہے کبھی نہیں، ایک ہی سفر ایک شخص کے لئے پُر مشقت ہے تو دوسرے کے لئے وہی سفر بے مشقت اور نہایت آرام دہ، اس

لئے شریعت نے قصر صلوٰۃ کے لئے نفس سفر ہی کو مشقت کے قائم مقام کر دیا، اب خواہ سفر میں مشقت ہو یا نہ ہو، اگر سفر شرعی ہوگا تو قصر صلوٰۃ کا حکم بھی ہوگا، گو مشقت بالکل ہی نہ ہو، اور اگر سفر شرعی مسافت سے کم کا ہے تو قصر صلوٰۃ کا حکم نہیں ہوگا گو مشقت بہت زیادہ ہو۔

اسی طرح میراث کے مسئلہ کو سمجھنا چاہئے کہ بیٹا بیوی وغیرہ کے استحقاق میراث کا اصل سبب تو عزت و مرتبہ اور منصب میں نیابت اور خدمت و شفقت وغیرہ اسباب ہیں، لیکن اس کا فیصلہ کرنا کہ واقعی یہ وارث ان صفات سے متصف ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس درجہ کا ہے، اس کا کوئی پیمانہ اور معیار مقرر کرنا دشوار تر اور انتشار و اختلاف کا باعث تھا، اس لئے شریعت نے ان اسباب و اوصاف کا اعتبار نہ کر کے نفس قرابت اور خونی رشتہ کو ان اوصاف و اسباب کے قائم مقام کر دیا، لہٰذا اب میراث کا حکم اور اس کے حصوں کا استحقاق قرابت کی بناء پر ہوگا، نہ کہ اوصاف کی بناء پر، لہٰذا ایک بیٹا اپنے باپ کا وارث ہوگا، خواہ وہ کتنا ہی ناکارہ اور نافرمان ہو، جیسے حالت سفر میں قصر صلوٰۃ کا حکم ہوگا خواہ سفر کتنا ہی آرام دہ اور مشقت سے خالی ہو، جس طرح قصر صلوٰۃ میں نفس سفر کو مشقت کے قائم مقام کر کے حکم کو اس سے مربوط کیا گیا، اسی طرح باب میراث میں نفس قرابت کو ان اوصاف کے قائم مقام کر کے حکم کو اس سے مربوط کیا گیا۔

دنیاوی مثالوں میں اس کی مثال یہ سمجھنا چاہئے کہ ٹرینوں کے ذریعہ سفر کرنے میں سب جانتے ہیں کہ بعض ٹرینیں نہایت تیز رفتار سپر فاسٹ ہوتی ہیں، اس وجہ سے ان کا کرایہ بھی زیادہ ہوتا ہے، مثلاً ہمارے دیار میں شتابدی، گومتی وغیرہ، اس کے مقابلہ میں دوسری ٹرینیں پیسنجر وغیرہ سست رفتار منزل مقصود تک دیر میں پہنچاتی ہیں، اس لئے ان کا کرایہ بہت کم ہوتا ہے، اب فرض کیجئے کہ کوئی سپر فاسٹ ٹرین لیٹ ہو جائے یا کسی وجہ سے منزل مقصود تک بہت تاخیر سے پہنچائے اور اس کے مقابلہ میں پیسنجر جلد پہنچا دے تو کیا سپر فاسٹ کے مسافر کو دنیا کے عقلاء و وکلاء اس بات کا حق دیتے ہیں کہ سپر فاسٹ ٹرین کا اصل وصف جلدی پہنچنا ہے، اس وصف کے نہ پائے جانے کی وجہ سے تمام مسافرین کا کرایہ پیسنجر کے برابر ہونا

چاہئے، اور جو زائد کرایہ لیا گیا ہے وہ واپس ہونا چاہئے، آج تک ایسا مطالبہ کسی عقل مند نے نہیں کیا ہوگا، ایسا کیوں؟ اسی لئے کہ سپر فاسٹ کے کرایہ کی زیادتی کی علت اگرچہ اس کا تیز رفتار ہونا اور منزل مقصود تک جلد پہنچانا تھا، لیکن تیز رفتار یا سست رفتار ہونا ظنی امر ہے، مختلف احوال و عوارض کی بناء پر اس میں تخلف اور تقدیم و تاخیر بھی ممکن ہے، لہٰذا اب نفس ٹرین ہی کو اس وصف کے قائم مقام کر دیا گیا، لہٰذا کرایہ کی زیادتی کے حکم کا مدار اب نفس ٹرین ہی سے مربوط ہوگا، خواہ وہ وصف پایا جائے یا نہ پایا جائے، ٹرین جلدی پہنچائے یا تاخیر سے، کرایہ بہر حال اکسپریس کا ہی دینا ہوگا، کیونکہ نفس ٹرین ہی کو اس وصف کے قائم مقام کر دیا گیا ہے، اسی طرح میراث کے باب میں بھی ورثاء کے جو حصے شریعت نے متعین کئے ہیں وہ اگرچہ خاص اوصاف و اسباب کی بناء پر ہیں، لیکن ان اوصاف کے پائے جانے یا نہ پائے جانے کا فیصلہ بہت دشوار تھا، اس لئے نفس قرابت اور رشتہ داری ہی کو ان اوصاف و اسباب کے قائم مقام کر دیا گیا، اس لئے اب اس اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ بیٹا اگر نافرمان اور اس درجہ ناکارہ ہو کہ باپ کی نیابت کی اس کے اندر قطعاً اہلیت نہ ہو پھر بھی اس کو سب سے بڑا وارث اور مستحق میراث کیوں سمجھا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

دور کے رشتہ دار جو قریبی رشتہ داروں کی وجہ سے میراث سے محروم ہو گئے ہوں ان کے متعلق میراث پانے والوں کے لئے شریعت کی ضروری ہدایات

شریعت نے استحقاق میراث کے سلسلہ میں جو ضابطہ بیان کیا ہے اس کی بنیاد چونکہ قرابت و رشتہ داری ہے، اور اس میں بھی قریبی رشتہ داروں کو دور کے رشتہ داروں پر ترجیح دی گئی ہے، آیت "والأقربون" سے فقہاء اسلام نے "الأقرب فالأقرب" کا ضابطہ بیان کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اقرب یعنی قریبی رشتہ دار کے ہوتے ہوئے ابعد یعنی دور کے رشتہ دار کو میراث سے حصہ نہیں ملے گا، مثلاً مرنے والے کے باپ کے ہوتے ہوئے اس کے دادا کو میراث میں حصہ نہیں ملے گا، اور بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے کو حصہ نہیں ملے گا، نیز بیٹے کے ہوتے ہوئے مرنے والے کے بھائی بہنیں بھی محروم ہوں گی۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''جب وراثت کا مدار رشتہ داری پر ہو تو اصول یہ بنایا جائے کہ اگر نزدیک و دور کے مختلف رشتہ دار جمع ہوں تو قریبی رشتہ دار کو بعید پر ترجیح دے کر اقرب کے ہوتے ہوئے ابعد کو حصہ نہ دیا جائے، ہاں اگر کچھ رشتہ دار ایسے ہوں جو بیک وقت سب کے سب اقرب قرار دیئے جائیں اگرچہ وجوہ اقربیت ان میں مختلف ہوں تو پھر یہ سب مستحق وراثت ہوں گے، جیسے اولاد کے ساتھ ماں باپ یا بیوی وغیرہ، کہ یہ سب اقرب ہیں، اگرچہ اقربیت کی وجوہ مختلف ہیں۔'' (معارف القرآن، سورہ نساء، جلد۲، صفحہ۳۱۱)

لیکن جب قریبی وارثوں کو ان کا شرعی حصہ دیا جائے گا، تو دور کے رشتہ داروں کا بھی چونکہ میت سے خونی رشتہ ہے اس لئے میت کے مال سے دوسروں کو ملتا ہوا حصہ دیکھ کر طبعی طور پر ان کو کافی ملال ہوگا، دور کا رشتہ ہونے کی وجہ سے حصہ نہ ملنے سے ان کا دل افسردہ اور رنجیدہ ہوگا اور وہ حسرت بھری نگاہوں سے اس کو دیکھیں گے، اس لئے حق تعالیٰ نے ایسے موقع کے لئے ہدایت دی ہے:

"وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُوْلُوا الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِيْنُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُوْلُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفاً۔" (سورہ نساء: ۸)

ترجمہ: اور جب تقسیم کے وقت خویش واقارب، یتیم اور محتاج بھی موجود ہوں تو ان میں سے کچھ ان کو بھی دے دو، اور (نہ دے سکو تو) ان سے بھلی بات کہو۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

یعنی جو دور کے رشتہ دار، یتیم اور مسکین میراث میں حصہ پانے سے محروم ہو رہے ہوں، اگر وہ تقسیم میراث کے وقت آموجود ہوں تو میراث پانے والوں کا اخلاقی فریضہ ہے کہ اس مال میں سے باختیار خود کچھ حصہ ان کو بھی دے دیں جو ان کے لئے ایک قسم کا صدقہ اور موجب ثواب ہے، اور ایسے وقت میں جب کہ ایک مال بغیر کسی سعی وعمل کے محض خدا تعالیٰ کے دین سے انہیں مل رہا ہو تو صدقہ خیرات فی سبیل اللہ کا خود بھی داعیہ دل میں ہونا

چاہئے، جیسا کہ اس کی ایک نظیر دوسری آیت میں مذکور ہے: "كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ۔" (سورہ انعام، پ۸، آیت ۱۴۱) یعنی اپنے باغ کے پھل کھاؤ جب کہ وہ پھل دینے لگے، اور جس روز پھل کاٹو تو اس کا حق نکال کر فقراء ومساکین کو دے دو۔

خلاصہ یہ کہ میراث کی تقسیم کے وقت اگر کچھ دور کے رشتہ دار، یتیم اور مسکین وغیرہ جمع ہو جائیں جن کا کوئی حصہ ضابطہ شرعی سے اس میراث میں نہیں ہے تو ان کے جمع ہو جانے سے تم تنگ دل نہ ہو، بلکہ جو مال خدا تعالیٰ نے تمہیں بلا محنت عطا فرمایا ہے اس میں سے بطور شکرانہ کچھ عطا کر دو، اور غنیمت جانو کہ خرچ کا ایک اچھا موقع مل رہا ہے، اس موقع پر ان لوگوں کو کچھ دے دینے سے ان دور کے رشتہ داروں کی دل شکنی اور حسرت کا ازالہ ہو جائے گا، اس میں مرنے والے کا محروم الارث پوتا بھی آ گیا، اس کے چچاؤں اور پھوپھیوں کو چاہئے کہ اس کو اپنے اپنے حصہ سے بخوشی کچھ دے دیں۔

آخر آیت میں فرمایا: "وَقُوْلُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا" اگر یہ لوگ اس طرح تھوڑا سا دینے پر بھی راضی نہ ہوں بلکہ دوسروں کے برابر حصہ کا مطالبہ کرنے لگیں تو چونکہ ان کا یہ مطالبہ قانون شرع کے خلاف اور غیر منصفانہ ہے اس لئے ان کا مطالبہ پورا کرنے کی گنجائش نہیں، لیکن اس پر بھی ان کو کوئی ایسی بات نہ کہی جائے جس سے ان کی دل شکنی ہو بلکہ معقول طور پر ان کو سمجھا دیا جائے کہ شرعی قاعدہ سے میراث میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے، ہم نے جو کچھ دیا ہے وہ محض تبرعاً دیا ہے، اور ایک بات یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ ان لوگوں کو تبرعاً جو دیا جائے گا مجموعی مال میں سے نہیں، بلکہ بالغین ورثاء میں سے جو ہوں وہ اپنے حصہ میں سے دیں، نابالغ اور غائب کے حصہ میں سے دینا درست نہیں۔ (معارف القرآن، سورہ نساء، جلد۲، صفحہ۳۱۳، ۳۱۴)

تقسیم میراث سے پہلے کرنے کے تین کام

کتاب وسنت کی ہدایت کے مطابق مورث کے انتقال کے بعد سب سے پہلا

خرچ جو مورث کے ترکہ سے کیا جائے گا وہ اس کی تجہیز وتکفین اور تدفین کا ہے، (البتہ عورت کی تجہیز وتکفین کا خرچ مفتیٰ بہ قول کے مطابق اس کے شوہر پر لازم ہے)، اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ اگر اس پر کوئی قرض آتا ہو خواہ وہ بیوی کا مہر ہی کیوں نہ ہو، شرعی حکم کے تحت تجہیز وتکفین کے بعد سب سے پہلے اس کا قرض ادا کیا جائے گا، شریعت میں اس کی اس درجہ اہمیت ہے کہ مقروض میت کی رسول اللہ ﷺ نے نماز جنازہ نہیں پڑھائی اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"صلّوا علی صاحبکم۔"(صحیح بخاری، کتاب الحوالات، باب إن أحال دین المیت علی رجل جاز، حدیث ۲۲۸۹)

تم لوگ اس کے جنازہ کی نماز پڑھ لو میں نہیں پڑھاؤں گا، محض اس وجہ سے کہ وہ مقروض مرا ہے، اور اتنا ترکہ اس نے چھوڑا نہیں کہ جس سے اس کا قرض ادا ہو جائے۔

البتہ جب فتوحات کا دروازہ کھل گیا، اور آپ کے پاس گنجائش ہوگئی تو آپ خود میت کا قرض ادا فرماتے تھے، اور جنازہ کی نماز ادا فرماتے۔

"عن أبی ھریرۃؓ أن رسول اللہ ﷺ کان یؤتی بالرجل المتوفی علیه الدین، فیسأل: ھل ترك لدینه فضلا؟ فإن حدث أنه ترك لدینه وفاءً صلی، وإلا قال للمسلمین: صلوا علی صاحبکم، فلما فتح الله علیه الفتوح قال: أنا أولیٰ بالمؤمنین من أنفسھم، فمن توفی من المؤمنین فترك دیناً فعلي قضائه، ومن ترك مالا فلورثته۔"(صحیح بخاری، کتاب الکفالة، باب الدین، حدیث ۲۲۹۸)

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: میت (خواہ کتنا ہی صالح اور دین دار ہو) اگر مقروض ہوکر مرا ہے تو اس کی روح معلق رہتی ہے، یعنی نیک ارواح میں اس کو اس وقت شامل نہیں کیا جاتا جب تک کہ اس کا قرض ادا نہ کر دیا جائے۔

"عن أبی ھریرۃؓ عن النبی ﷺ أنه قال: نفس المؤمن معلقة بدینه حتی یقضیٰ عنه۔"(جامع الترمذی، أبواب الجنائز، حدیث ۱۰۷۸)

اس لئے فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ میت کے ترکہ سے سب سے پہلے اس کا قرض ادا کیا جائے اگرچہ اس میں ترکہ کا سارا مال ختم ہو جائے۔(درمختار، شامی وغیرہ)

ادائے قرض کے بعد تیسرے درجہ میں اس کی جائز وصیتوں کو پورا کرنے کا نمبر آتا ہے، اگر میت نے کوئی جائز وصیت کی تھی تو شرعی حکم کے مطابق صرف اور صرف تہائی مال میں سے اس کی وصیت کو نافذ کیا جائے گا، خواہ وہ وصیت کسی نیک کام مثلاً تعمیر مسجد ومدرسہ میں مال خرچ کرنے کی ہو یا کسی اجنبی یا رشتہ دار کو دینے کی وصیت ہو، تہائی مال سے اس کا پورا کرنا وارثوں پر ضروری ہے، البتہ اگر رشتہ داروں میں کسی ایسے رشتہ دار کے لئے وصیت کی ہے جس کا میراث میں بھی کچھ حصہ بنتا ہو تو ایسے وارث کے لئے وصیت کرنا ناجائز ہے، اور اس وصیت کو پورا کرنا بھی ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لا وصیة لوارث۔"(جامع الترمذی، أبواب الوصایا، باب ما جاء لا وصیة لوارث، حدیث ۲۱۲۰)

''کسی وارث کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں۔''

مثلاً مورث نے وصیت کی میرا اتنا مال یا فلاں جائداد ومکان میرے فلاں بیٹے، بیٹی کو یا بیوی کو دے دیا جائے، تو چونکہ شرعاً یہ وارث ہیں اس لئے ایسی وصیت کرنا ناجائز اور اس کے مطابق عمل کرنا بھی حرام ہے، الا یہ کہ تمام ورثاء بخوشی اس کی اجازت دے دیں تو یہ ان کا تبرع اور احسان ہوگا، اور نابالغ کی اجازت کا کوئی اعتبار نہیں، البتہ اگر اپنی زندگی میں ہبہ کے طور پر کسی کو مالک بنا دیا تو اس کا مسئلہ اس سے مختلف ہے، ایسی صورت میں وہ مالک بن جائے گا۔

الغرض ترکہ کے مال میں تیسرے نمبر پر جائز طریقہ سے اس کی وصیت کو پورا کرنا ہے، وصیت کو نافذ کرنے کے بعد چوتھے نمبر پر اب جتنا مال بچا ہے وہ سب وارثوں کا حق ہے، شریعت کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق اس کا ترکہ وارثوں کے درمیان تقسیم کرنا ضروری ہے۔

ضرورت اور مصلحت کی بنا پر وصیت کرنے کا طریقہ

کتاب وسنت کی ہدایت کے مطابق کسی وارث کے لئے حقیقت میں وصیت کرنا تو جائز نہیں، لیکن قانونی مصلحت سے یا مورث کے اس خطرہ اور اندیشہ کی وجہ سے کہ میرے مرنے کے بعد کمزور وارث مثلاً بیٹی اور نابالغ اولاد میراث سے اپنا حصہ نہیں پاسکیں گی، ایسی صورت میں اپنے کمزور وارثوں کو ضرر وظلم سے بچانے نیز وارثوں کے درمیان انتشار واختلاف سے حفاظت کے لئے مورث اگر اپنے وارثوں کے لئے وصیت نامہ مرتب کرتا ہے اور اپنی اس وصیت میں ہر وارث کے لئے اس کے شرعی حصہ کے مطابق (جو اس کو میراث میں ملنا ہے) وصیت کرتا اور قانونی مضبوطی کرتا ہے تو یہ نہ صرف جائز بلکہ بہتر اور پسندیدہ ہے، شرط اس میں یہی ہے کہ جملہ وارثوں میں جس وارث کے لئے مورث نے جتنے مال کی وصیت کی ہے وہ اس کے میراث کے شرعی حصہ سے نہ کم ہو نہ زائد، اس طرح وصیت کرنا وارثوں کے لئے بھی جائز بلکہ آج کے حالات میں مناسب اور بہتر ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ اپنے فتاوی میں تحریر فرماتے ہیں:

''اگر مورث (یعنی مرنے والا شخص) اپنے ترکہ میں اس طرح وصیت کر جائے کہ فلاں وارث کو فلاں چیز دی جائے اور فلاں وارث کو فلاں چیز، بشرطیکہ وہ اس کے شرعی حصہ سے کم نہ ہو تو جائز ہے، اور اگر کم ہو تو ناجائز ہے، کیونکہ اس میں وارث کے لئے وصیت ہے جو کہ ناجائز ہے۔

اور مذکورہ طریقہ کے مطابق حصوں کو متعین کر دینا یہ (بھی ایک طرح کی) تقسیم ہے، اور اس کا اختیار مورث کو دیا گیا ہے، اس لئے والد صاحب کو مثلاً ایسا کرنا چاہئے کہ سب وارثوں کے لئے ان کے شرعی حقوق کے موافق الگ الگ ایسے قرعے بنا کر کہ لڑکیوں کے ساتھ لڑکوں کی شرکت نہ ہو وصیت لکھ دیں کہ اس کے موافق تقسیم ہو۔ (امداد الفتاوی قدیم، ص ۳۳۷، جلد ۴)

ضروری تنبیہ

اس موقع پر ایک بڑی غلطی لوگ یہ کرتے ہیں کہ میت کے ادائے قرض یا تنفیذ وصیت کی تو فکر کرتے نہیں البتہ ترکہ کے مال سے ایصال ثواب، قرآن خوانی، تیجہ اور چالیسواں وغیرہ کا اہتمام کرتے ہیں، جس میں خاندان و برادری کے لوگوں کو جمع کر کے دعوت بھی ہوتی ہے، تو یاد رکھنا چاہئے کہ اگر میت کے مال یعنی ترکہ سے اس کے لئے ایصال ثواب کا اہتمام کیا جائے مثلاً میت کی طرف سے حج یا عمرہ کرایا جائے تو یہ بھی ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ اس میں وارثوں کا حق ہے، الّا یہ کہ تمام ورثاء خوشی سے راضی ہوں، دلی رضامندی شرط ہے، محض مروت وشرما حضوری کی اجازت کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں، اسی طرح نابالغ وارث کی اجازت کا بھی کوئی اعتبار نہیں، اس لئے بہتر صورت یہی ہے کہ میراث کو تقسیم کر دیا جائے پھر اپنی مرضی سے جس کا جتنا جی چاہے، اپنے طور پر میت کے لئے ایصال ثواب کر دے۔ واللہ اعلم۔

رسم ورواج کے مطابق ایصال ثواب کے غیر مشروع اور غلط طریقے اختیار کرنا تو بالکل ہی ناجائز ہے، تیجہ، چالیسواں وغیرہ میں جو کھانا پکنے اور کھلانے کا اہتمام ہوتا ہے وہ عموماً تقسیم میراث کے بغیر ترکہ کے مال سے ہوتا ہے اس کا کھلانا اور کھانا سب حرام ہے، یتیموں کو ان کا حصہ نہ دے کر خود کھانے اور کھلانے کو قرآن نے پیٹ میں دوزخ کی آگ بھرنے سے تعبیر کیا ہے، ایسے لوگ دوزخ میں جائیں گے، ارشاد ہے:

"إِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ الْيَتَامٰى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا۔" (سورہ نساء، ۱۰:)

ترجمہ: بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ بس اپنے پیٹ میں آگ ہی بھرتے ہیں اور عنقریب وہ دہکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔

تقسیم میراث کے عمل کو انجام دینے کے لئے تین کام

تجہیز وتکفین اور ادائے قرض وتنفیذ وصیت کے بعد چوتھے نمبر پر میت کا متروکہ مال اس کے تمام وارثوں کے درمیان تقسیم کرنا ضروری ہے، عملی طور پر اس کام کو انجام دینے کے لئے تین باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا مرحلہ

سب سے پہلے مرنے والے کے قریبی اور دور کے تمام رشتہ داروں مثلاً ماں، باپ، بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، بھائی، بہن، بیوی، دادا، دادی، چچا وغیرہ میں جو موجود ہوں ان سب کی تفصیل لکھی جائے اور اس پہلے مرحلہ میں موجود ورثاء کے درمیان شرعی طور پر سب کا حصہ متعین کیا جائے کہ مورث کے ترکہ سے کس وارث کو کتنا حصہ ملے گا، مثلاً نصف، ربع، ثمن، ثلثان، ثلث، سدس، ان حصوں میں کس وارث کا کتنا حصہ ہے اور کون محروم ہے، یہ پہلا مرحلہ ہوا، جس میں حصہ پانے والے موجود ہر وارث کے حصہ کی تعیین کی جائے گی۔

دوسرا مرحلہ

حصوں کی تعیین کے بعد دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ان حصہ پانے والے ورثاء میں اگر کوئی وارث اپنے حصہ کو خوش دلی سے نہیں لینا چاہتا، یا اپنے حصہ سے مستغنی ہو کر کسی اور رشتہ دار کو یا جملہ ورثاء کو اپنا حصہ دینے کو تیار ہے تو اس کی ہدایت کے مطابق عمل کیا جائے گا،

اس دوسرے مرحلہ میں بسا اوقات یہ صورت پیش آتی ہے کہ جملہ ورثاء میں سے کوئی وارث یہ کہتا ہے کہ میت کے ترکہ کا فلاں فلاں مال میرے قبضہ میں ہے یا فلاں زیور و جائداد میرے پاس موجود ہے جو میرے میراث کے حصہ سے بہت کم ہے، لیکن میں اتنے ہی حصہ لینے پر اکتفاء کرتا ہوں اس کے علاوہ مجھ کو کچھ نہیں چاہئے، یعنی ترکہ کے ایک حصہ کو لے کر باقی حصہ سے دست بردار ہو کر وہ مصالحت کرنا چاہتا ہے، سو اس مصالحت کی صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں، بعض صورتیں جائز ہیں اور بعض ناجائز، بعض میں مبادلہ کرنے سے سود بھی لازم آتا ہے، فقہاء نے اس نوع کی صورتوں کو "**کتاب الصلح**" میں تفصیل سے بیان کیا ہے، جس کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ صلح کی بعض شکلیں جائز ہیں، اور بعض

ناجائز، اس لئے مناسب صورت یہ ہے کہ مصالحت کی جو صورت بھی عمل میں لائی جائے اس کی تفصیل لکھ کر دارالافتاء سے فتویٰ حاصل کر کے اسی کے مطابق عمل کیا جائے۔

تیسرا مرحلہ

تقسیم میراث کا تیسرا مرحلہ جو سب سے بڑا مرحلہ ہوتا ہے وہ یہ کہ وارثوں کے درمیان ان کے حق اور حصوں کی تعیین کے بعد عملی طور پر اس کی تقسیم کس طرح کی جائے، کیونکہ کسی آدمی کے انتقال کے بعد اس کے ترکہ میں بسا اوقات مختلف قسم کے سامان ہوتے ہیں، اور بہت سے سامان ایسے بھی ہوتے ہیں جو ناقابل تقسیم ہوتے ہیں جیسے چھوٹی دکان، مکان، گاڑی، مشین، چکی وغیرہ کہ ان کی تقسیم ناممکنات میں سے ہے، لیکن شریعت نے اس کا بھی طریقہ بتلایا ہے، ہمارے فقہاء کرام نے اس کو "**کتاب القسمة**" کے عنوان سے تفصیل سے بیان کیا ہے، اور ہر مشکل کا حل اور پیچیدہ مسئلہ کی صورت بتلائی ہے، ناقابل تقسیم اشیاء میں "**مهایاة**" یعنی باری باری اس شئی کے استعمال کا طریقہ بتلایا ہے، یا جملہ اشیاء وسامان کی قیمتوں کا اندازہ کرنے یعنی کل ترکہ کی مجموعی قیمت کا اندازہ لگا کر اسی قیمت کے لحاظ سے بعض چیزیں بعض ورثاء کو اور بعض چیزیں دوسرے بعض ورثاء کو دینے کا طریقہ بتلایا ہے، اختلاف کی صورت میں قرعہ اندازی کرنے کی ہدایت کی ہے، شامی و عالم گیری وغیرہ میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

الغرض عملی طور پر تقسیم میراث کا عمل اگرچہ مشکل کام ہے لیکن شریعت نے اس کو آسان کر کے بتلایا ہے، اسلامی حکومت میں حکام کی طرف سے ایسے باصلاحیت افراد قاضی وقاسم متعین ہوتے تھے جو اسی کام کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے تھے، اس کام کو انجام دینے میں وقت صرف ہوتا اور دماغ سوزی بھی ہوتی ہے، اس لئے شریعت نے حکم دیا ہے کہ تقسیم املاک وتقسیم میراث کا کام جو بھی انجام دے گا، وہ اپنی اس محنت کے عوض خاطر خواہ اجرت کا مستحق ہوگا، اور اس کی اجرت ان شرکاء املاک یعنی وارثوں سے ان کے حصہ کے مطابق وصول کی جائے گی، یہ ساری تفصیلات کتب فقہ ہدایہ، شامی، عالم گیری وغیرہ میں

موجود ہے۔

الغرض تقسیم میراث کے عمل کو انجام دینے کے لئے ان تین مراحل پر بھی نظر کرنا ضروری ہے، جس کے بغیر یہ عمل انتہاء کو نہیں پہنچ سکتا، اور نہ ہی تقسیم میراث کا فائدہ وارثوں کو حاصل ہوگا، کیونکہ وارثوں کے حصہ کی تعیین تو محض ایک کاغذی کاروائی ہے، وہ بھی ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر عملی تقسیم بھی ناممکن ہے، لیکن اصل مقصود عملی تقسیم ہے، عام طور پر اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں اس میں عموماً ورثاء کے حصوں کو بیان کیا جاتا ہے، عملی طور پر اس کی تقسیم کس نوعیت اور کیفیت سے ہونا چاہئے عموماً اس سے تعرض نہیں کیا جاتا، ضرورت اس کی ہے کہ تقسیم میراث کی عملی صورت اختیار کرنے کا بھی لوگوں کو طریقہ بتلایا جائے، اور اس سے ان کو آگاہ کیا جائے۔ واللہ اعلم

☆☆☆☆☆

اسلام میں یتیم پوتوں کی وراثت

مولانا عبیداللہ اسعدی
(شیخ الحدیث جامعہ عربیہ، ہتھورا، باندہ)

کبھی یہ بھی غلط فہمی ظلم وزیادتی کا سبب بنا کرتی ہے یا اس کا احساس دلاتی ہے، دو آدمی آپسی معاملات رکھنے والے کبھی اس احساس میں مبتلا ہوکر کہ دوسرا حق دبا رہا ہے بہت دور چلے جاتے ہیں یا کبھی گفت وشنید سے حقیقت حال واضح ہوتی ہے۔

یتیم پوتے کی وراثت کا موضوع بھی اسی قسم کا ہے جو مسلمانوں کے عائلی مسائل میں بڑی اہمیت کا حامل ہے اور ہمارے ملک میں ایک طویل عرصہ سے موضوع بحث بنا ہوا ہے، حتی کہ تقسیم ہند سے قبل اور انگریزی عہد میں بھی اس بابت گفتگو ہوتی رہی اور اس وقت کے ہمارے ممتاز علماء نے اپنے حالات ووسائل کے اعتبار سے اس پر توجہ دی اور امت کی رہنمائی کی۔

معاملہ یہ ہے کہ عموماً لوگ اس مسئلہ میں جذباتیت اور صرف رحم وترحم کی سوچ رکھتے ہیں اور مسئلہ کو سمجھنے میں ''یتیم'' اور ''پوتے'' تک رہ جاتے ہیں، وراثت: اور اس کی حقیقت وحکمت کو سمجھنے کی زحمت نہیں کرتے، نتیجہ ان کو شریعت کے اس حکم میں ظلم وزیادتی کا پہلو نظر آتا ہے اور بقول بعض ممتاز ارباب افتاء ۲۷/صورتوں میں سے محرومی کی ایک شکل کو اہمیت دیتے ہیں اور ۲۶/سے آنکھیں بند کرلیتے ہیں، پھر یہ کہ دور دور سے سنتے، دیکھتے اور سمجھتے ہیں، جو لوگ مسئلہ کو صحیح طور پر جانتے، بتاتے اور سمجھاتے ہیں ان کے قریب جاکر ان سے سننے وسمجھنے کی سعی نہیں کی جاتی، جو حق وحقیقت ہے اس کا بھی علم نہیں ہوتا اور ایک خاص صورت کے حکم کو عام اور

عمومی سمجھ کر اسلام اور علماء اسلام کے حق میں الزام تراشی تک نوبت آجاتی ہے۔

دادا کے ترکہ میں پوتے کا حصہ اور پوتے کی شمولیت کی بہت سی شکلیں ہیں جن میں صرف ایک شکل محرومی کی ہے اور متعدد اہل تحقیق حضرات کی صراحت کے مطابق ۲۶/شکلیں حصہ پانے اور وراثت میں شمولیت کی ہیں، علماء محققین نے ایک نقشہ وچارٹ کی شکل میں اس پوری تفصیل کو واضح کیا ہے، امارت شرعیہ بہار کے ایک فاضل قاضی مولانا عبدالرازق صاحب نے اس موضوع سے متعلق اپنے رسالہ میں اس چارٹ کو پیش کیا ہے جس کے مطابق ۲۸/شکلیں بنتی ہیں ایک مہمل (کالعدم) ہے باقی ۲۷/ میں سے ۲۶/ وارث بننے کی ہیں اور ایک محرومی کی اور اس ایک شکل کے پروپیگنڈے نے ذہن ایسا خراب کردیا ہے کہ شریعت کا مستحکم ومستحسن نظام ظلم نظر آتا ہے، جب کہ ہماری شریعت، شریعت اسلامیہ وشریعت محمدیہ کا معاملہ یہ ہے کہ اس نے جانوروں کے بھی حقوق اس درجہ بتائے ہیں کہ ان کو ادا کرکے آدمی جنت ومغفرت کا مستحق قرار پاتا ہے اور ان کو ضائع کرکے اپنی آخرت کو برباد کرتا ہے تو انسانوں کے حقوق کا کیا کہنا، کمزور سے کمزور طبقہ وفرد کو وہ حقوق دئے ہیں، ان کی فکر وخیال اس حد تک کی ہے کہ ان کو آسمان تک پہونچادیا ہے، کتاب وسنت میں معاشرہ کے ہر کمزور فرد وطبقہ کی مدد ونصرت اور خیال وفکر کی ہدایات جابجا موجود ہیں جس میں غریب ومسکین ویتیم وبیوہ سب شامل ہیں۔

جس شریعت کے نبی نے خود یتیمی کی زندگی گذاری ہو اور اس حال کو سمجھا وپرکھا ہو اور جس کا کردار قبل نبوت بھی یہ رہا ہو کہ اولین وحی کی آمد پر آپ ﷺ کو جو ایک قسم کی فکر وپریشانی لاحق ہوئی تو آپ ﷺ کی جانثار وفا شعار زوجہ مطہرہ نے آپ ﷺ سے فرمایا: ''اللہ آپ کو ضائع نہیں کرسکتا

وَاللَّهِ مَا يُخْزِيكَ اللَّهُ أَبَدًا إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ (بخاری)

جس نبی کا فرمان یہ ہو

السَّاعِي عَلَى الْأَرْمَلَةِ وَالْمِسْكِينِ كَالْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوِ الْقَائِمِ اللَّيْلَ وَالصَّائِمِ النَّهَارَ۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

مَنْ قَبَضَ يَتِيمًا مِنْ بَيْنِ الْمُسْلِمِينَ إِلَى طَعَامِهِ وَشَرَابِهِ أَدْخَلَهُ اللَّهُ الْجَنَّةَ أَلْبَتَّةَ (ترمذی)

أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّةِ هَكَذَا (أَشَارَ بِإِصْبَعَيْهِ السَّبَّابَةِ وَالْوُسْطَى) (بخاری)

جس کی لائی ہوئی کتاب میں یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ (سورۃ البقرۃ: ۱۷۷)

اور اس سے بڑھ کر ''وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ'' کے ساتھ اس سے پہلے ''فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ'' (سورۃ الضحیٰ) فرمایا گیا ہے۔

اس مسئلہ کو صحیح طور پر سمجھنے اور سمجھانے کیلئے فلسفہ میراث اور وراثت اور شریعت کے نظام وراثت کو سمجھنے کی ضرورت ہے جو فطرت کے عین مطابق ہے اور ذی شعور انسانوں کے عقل وفہم کے عین مناسب اور اسی کے ساتھ رحم وترحم، دوسروں کی مدد ونصرت اور خیال وکفالت کی نسبت سے شریعت کا جو نظام ومزاج ہے اس کو بھی پورے طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ شریعت نے ایک طرف وراثت کے مضبوط اصول بنائے ہیں کہ ہر صاحب حق کو اس کا حق اور واقعی حق پورے طور پر ملے اور دوسری طرف وراثت کے نظام کو صحیح طور پر جاری کرنے کی صورت میں اگر کوئی ضرورت مند محروم رہ رہا ہو تو وہ وراثت سے محرومی کی بناء پر ضائع نہ ہو؛ بلکہ اس کی پوری طور پر کفالت کی جائے اور اس کی جملہ ضروریات کو پورا کرنے کی فکر کی جائے۔

ہر اہم چیز کے کچھ اصول وضوابط ہوتے ہیں، دنیا والوں کے نزدیک بھی ہوتے ہیں؛ چنانچہ دنیا کا نظام وراثت بھی خواہ کسی قوم وملک کا ہو یا کسی مذہب کا، آزاد وبیسرو پا نہیں ہے؛ بلکہ محدود ہے اور اس کے کچھ حدود ہیں انہیں کی بنیاد پر وراثت کی تقسیم ہوتی ہے اور شریعت اسلامیہ نے تو ہر چیز کو منضبط کر کے پیش کیا ہے تا کہ عدل وانصاف قائم ہو اور ظلم وجور کا دفعیہ کیا جا سکے۔

شریعت کا نظام وراثت یہ ہے کہ ہر رشتہ دار کو ہر حال میں ترکہ ملے ہی؛ ضروری نہیں، کم وبیش بھی ہوتا ہے اور محرومی کی شکل بھی پائی جاتی ہے۔

۱- ہر دور وقریب کا رشتہ دار وارث نہیں ہوتا بلکہ صرف قریبی قرابتدار ہی وارث ہوا کرتے ہیں، وراثت کے نظام کو قرابت سے جوڑا گیا ہے اور قرابتداروں کی ضرورت سے نہیں جیسے بالخصوص بیوی کے نفقہ کا حکم ونظام اس خاص رشتہ ونظام سے جوڑا گیا ہے اس سے قطع نظر کہ عورت کی مالی ومادی حیثیت کیا ہے؟ ورثہ یا ان میں سے بعض خواہ کتنے ہی مالدار کیوں نہ ہوں ترکہ میں ان کا مقررہ حق وحصہ ان کو ملنا ہے، اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور مورث کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ ایسا کوئی کام کر جائے جس کی وجہ سے مستحق وارث محروم ہو جائے۔

دوسری طرف جو رشتہ دار ضابطہ وراثت کے دائرہ میں نہیں آتے ان کو بطور وارث کچھ نہیں ملتا خواہ وہ کیسے ہی ضرورتمند کیوں نہ ہوں۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ بخاری میں مذکور ومعروف ہے کہ وہ حجۃ الوداع کے موقع پر شدید بیمار ہو کر مایوس ہو گئے تو انہوں نے اپنے کل مال کا صدقہ کرنا چاہا، اتفاق سے اس وقت ان کی ایک بیٹی تھی جو مالدار تھی، نبی اکرم ﷺ نے بمشکل تہائی کے صدقہ ووصیت کی اجازت دی اور ارشاد فرمایا: "إِنَّكَ أَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ أَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُونَ النَّاسَ"۔

۲- ان قریبی قرابتداروں کو اس طرح محدود کیا گیا ہے کہ وہ میت کے اہل

خانہ؛ ماں وباپ، میاں وبیوی اور اولاد ہیں، ماں باپ کے زمرہ میں ان سے اوپر کے لوگ دادا، دادی وغیرہ، اولاد کے زمرہ میں ان سے نیچے یعنی اولاد در اولاد سب آتے ہیں نیز ماں باپ کی اولاد کو بھی اس فہرست میں رکھا گیا ہے یعنی بھائی وبہن کو اور کچھ اور لوگ بھی وارثوں کی فہرست میں شامل ہیں۔

۳- وارث ہونے والوں میں کچھ لوگوں کے حصے متعین کر دیئے گئے ہیں اور کچھ کو حصے کے تعین کے بغیر وارث قرار دیا گیا ہے مثلاً زوجین میں سے ہر ایک کا حصہ متعین ہے، والدین میں سے ہر ایک کا متعین ہے، لڑکی یا بہن (لڑکے وبھائی) کے بغیر ہو تو ان کا حصہ متعین ہے اور اگر لڑکی کے ساتھ لڑکا یا بہن کے ساتھ بھائی ہو تو مرد کو عورت کا دوگنا دیا گیا ہے۔

۴- ایک اہم ضابطہ یہ ہے کہ مستحق ورثہ میں قریبی کی موجودگی میں دور والے کو وراثت نہیں ملتی، اسی لئے اولاد کے ہوتے ہوئے بھائی وبہن کو نہیں ملتا اور حقیقی بھائی وبہن کے ہوتے ہوئے باپ شریک بھائی بہن کو حصہ نہیں ملتا۔

۵- اسی طرح جس کی قرابت بالواسطہ ہو تو واسطہ کے ہوتے ہوئے اس کو حصہ نہیں ملتا، باپ موجود ہے تو دادا نیز بھائی وبہن مستحق نہیں ہوتے، صلبی اولاد موجود ہے حقیقی بیٹا وبیٹی ہو تو اولاد کی اولاد کو عموماً نہیں ملتا۔

۶- پوتے وپوتیوں کی قرابت بالواسطہ ہے، واسطہ موجود ہو تو پوتے وپوتی محروم ہوتے ہیں، یعنی بیٹے اگر موجود ہوں تو پوتے وپوتی محروم رہتے ہیں خواہ موجود بیٹے کی اولاد ہوں یا دوسرے مرحوم بیٹے کی (جو اپنے باپ سے پہلے مر گیا تھا)

۷- واسطہ موجود نہ ہو یعنی بیٹا تو بیٹوں کی اولاد بہر حال وارث ہوتی ہے خواہ صرف پوتے ہوں یا صرف پوتیاں ہوں یا دونوں ہی ہوں اگر صرف پوتے ہوں تو وہ عصبہ پوتے ہیں، متعین حصہ کے مستحق وارثوں کے بعد بچا ہوا ترکہ سب ان کا ہوتا ہے، اگر ان کے ساتھ پوتیاں بھی ہوں تو پوتے وپوتیوں کے درمیان "لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ" کے مطابق

تقسیم ہوتی ہے۔

۸-حتی کہ اگر صرف پوتیاں ہوں اور بیٹوں میں کوئی زندہ نہیں ہے تو پوتیاں حقدار وحصہ دار ہوتی ہیں دو یا زائد ہوں تو دو تہائی ان کو ملتا ہے، اگر ایک پوتی ہو تو آدھے ترکہ کی وہ مستحق ہوتی ہے۔

۹- یہی نہیں اگر ایک شخص کا انتقال ایک لڑکی اور ایک پوتی چھوڑ کر ہوتا ہے تو لڑکی چونکہ اقرب ہے تو اس کو آدھا ترکہ ملتا ہے اور ترکہ کا چھٹا حصہ پوتی کو ملا کرتا ہے جیسے کہ اگر صرف ایک پوتی اور بہن ہو تو پوتی کو آدھا اور ترکہ کا چھٹا حصہ بہن کو ملتا ہے۔

۱۰- پوتا و پوتی بیٹے و بیٹی کی طرح ہی وارث ہوتے ہیں اور جیسے بیٹا و بیٹی کو ترکہ میں حصہ ضرور ملتا ہے محرومی کا سوال نہیں اسی طرح اگر کسی کے انتقال کے وقت اولاد میں بیٹا و بیٹی نہ ہوں البتہ بیٹے کی اولاد پوتا و پوتی دونوں یا ایک ہے تو وہ اپنے باپ کی طرح شریعت کے ضابطہ کے مطابق وارث ہوتے ہیں۔

۱۱- ایک آدمی کا انتقال اس حال میں ہو کہ صرف ایک پوتا ہو اور بیوی و ماں باپ نہ ہوں تو اس کا کل ترکہ پوتے کو ہی ملتا ہے۔

۱۲- ایک آدمی کا انتقال اس حال میں ہو کہ دو یا زائد لڑکیاں اور ایک پوتا ہو تو لڑکیوں اور دیگر ذوالفروض کو دینے کے بعد باقی پوتے کو ہی ملتا ہے۔

۱۳- مرتے وقت صرف بیوی اور پوتا ہو تو بیوی کے حق کے بعد سب پوتے کا ہی ہوتا ہے۔

۱۴- ایک بات بطور اصول یہ ذہن میں رہے کہ شریعت کے نظام میں وارث دو طرح کے ہیں: ترکہ میں حصہ پانے والے اور ایسے جن کو ترکہ میں کسی حال میں حصہ نہیں ملتا، جس کے وارث ہونے اور ترکہ میں حصہ پانے کی کوئی شکل نہیں ان کو اصطلاح میں ''محروم'' کہتے ہیں اور جو لوگ مستحق تو ہوتے ہیں مگر بعض حالات کی وجہ سے ان کو حصہ نہیں ملتا ان کو ''محروم'' نہیں بلکہ ''محجوب'' کہا جاتا ہے، اس تفصیل کے مطابق پوتا ''محجوب'' تو

ہوتا ہے (مستحق وراثت قرابت داروں میں شامل ہونے کے باوجود کبھی وراثت سے کچھ نہیں پاتا) لیکن محروم نہیں ہوتا اور نہ محروم ورثہ میں اس کا شمار ہے کیوں کہ محروم وہ ہے جس کو کبھی اور کسی حال میں کچھ نہ ملے۔

۱۵- قرآن کریم میں آیت میراث میں ورثہ کا حق وحصہ بیان کرتے ہوئے سب سے پہلے اولاد کا تذکرہ ہے، جس کے تحت بالاتفاق صلبی اولاد کے ساتھ بیٹوں کی اولاد بھی داخل وشامل ہے، جب کہ آدمی کے مرتے وقت بیٹے زندہ نہ ہوں بلکہ پوتے ہوں اگرچہ ساتھ میں بیٹیاں بھی ہوں، ملاحظہ ہو سورہ نساء کی آیت:

"يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ"۔(سورہ نساء: ۱۱)

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں فرائض ومیراث کے بیان میں سب سے پہلے اسی آیت کا تذکرہ کیا ہے اور آگے وارثوں کا ذکر کرتے ہوئے اولاد، بیٹوں وبیٹیوں کا تذکرہ دوسروں سے پہلے کیا ہے اور اس کے بعد مرنے والے کے بیٹے کے موجود نہ ہونے کی صورت میں پوتوں کا تذکرہ کیا ہے اور اس بیان میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے جس پر پوری امت متفق ہے:

"وَلَدُ الْاَبْنَاءِ بِمَنْزِلَةِ الْوَلَدِ إِذَا لَمْ يَكُنْ دُوْنَهُمْ وَلَد ذكرهم كذكرهم وَ اُنْثَاهُمْ كَاُنْثَاهُم يَرِثُوْن كَمَا يَرِثُوْنَ"۔

اور اسی کے ساتھ یہ جملہ بھی بھی نقل کیا ہے: ولا يرث ولد الا بن مع الابن۔

ایسے ہی بیٹی کے ساتھ اگر پوتی ہو تو نصف بیٹی کا اور ایک چھٹا حصہ پوتی کا اس کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ پوتے و پوتیاں آدمی کی اولاد ہی ہوتی ہیں اس حیثیت سے شریعت نے ان کا پورا خیال کیا ہے، مورث زندہ ہے تو اس پر ذمہ داری ہوتی ہے، اور مر گیا تو اس سے ان کو وراثت ملتی ہے اور جیسا کہ آچکا ہے کہ دسیوں صورتوں میں پوتے و پوتی میراث میں حصہ دار وحقدار ہوتے ہیں بس ایک صورت ان کی محرومی کی ہے۔

یہ محرومی وراثت وترکہ میں حصہ کی ہے شریعت کے مقرر کردہ ضابطوں کی وجہ سے اور وراثت کے اصول ونظام کی وجہ سے کہ مرنے والے کی حقیقی اولاد، بیٹا جب موجود ہے جو اقرب ہے تو بالواسطہ دور کا وارث یعنی پوتا ترکہ میں حق وحصہ نہیں پائے گا۔

لیکن اس کا یہ مطلب کہ ایسی صورت میں پوتے و پوتی کو ضیاع کیلئے چھوڑ دیا جائے گا اور ان کی کفالت وخبر گیری کا کوئی نظام شریعت نے نہیں رکھا؟ ایسا نہیں ہے، شریعت نے ان کی نگہداشت، کفالت، تربیت، گذر بسر کی فکر وذمہ داری کا پورا پورا نظم کیا ہے دنیا کے ہر نظام سے بڑھ کر، مورث (دادا) کی زندگی میں بھی اور اس کے بعد کیلئے بھی جس کی مختصر تفصیل یہ ہے:

۱- شریعت کا نظام یہ ہے کہ جس انسان کے پاس گذر بسر کے ذرائع نہ ہوں اور وہ مجبور ہو (بچہ، نابالغ، مجنون، مفلوج وغیرہ نیز عورت) تو اس کی کفالت گھرانہ وخاندان کے ان قریبی افراد پر ہوتی ہے جو وارثوں میں شمار ہوتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کے حق میں فرمایا گیا ہے: "وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ" باپ پر نفقہ کی ذمہ داری کو بیان کرنے کے بعد یہ ذکر کیا گیا ہے، اس صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے اور امام بخاریؒ نے اسی کو بنیاد بنا کر ذکر کیا ہے کہ کوئی شکل نہ بنے تو ماں پر یہ ذمہ داری عائد ہوجاتی ہے؛ حالانکہ شریعت نے عورتوں پر اپنے نفقہ کا بوجھ نہیں رکھا (کمانے کا) تو دوسروں کا کیسے ہوسکتا ہے مگر حالات کے تحت یہ بھی حکم ہے، لہٰذا یتیم پوتے کی کفالت دادا پر ہے، وہ ان کی پوری پرورش کا ذمہ دار ہے، جبکہ وہ صاحب وسعت ہو۔

۲- اور اگر بالفرض وہ صاحب وسعت نہ ہو تو دوسرے ایسے اعزہ جو ورثہ کی فہرست میں ہوں جیسے چچا اور ماموں وغیرہ بھی، یہ سب یتیم کی کفالت کر کے اس کو اس لائق بنائیں گے کہ وہ خود اپنا بوجھ برداشت کر سکے۔

۳- دادا صاحب وسعت ہے تو اس کا یہ بھی فرض بنتا ہے کہ اپنے بعد کیلئے بھی پوتوں کے گذر بسر کا نظم کرے، یوں کہ اپنی ملکیت کا ایک حصہ پوتوں کو باقاعدہ ہبہ کردے

اور ان کو اس کا مالک بنادے، اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے کہ دادا کی موت کے بعد ترکہ میں پوتوں کو حصہ نہیں ملے گا۔

۴- اور اگر ہبہ کی صورت نہ اپنا سکے تو کم از کم یہ تو کرے کہ اپنے بعد کیلئے پوتوں کے حق میں وصیت کر جائے کہ اس کے ترکہ میں سے ایک تہائی یا اس کے اندر ایک مناسب حصہ پوتوں کو دے دیا جائے، تاکہ ان کی محرومی کی تلافی ہوسکے۔

آدمی کیلئے یوں تو وصیت کرنا ضروری نہیں ہے لیکن خاص حالات میں نہ صرف یہ کہ ایسی وصیت پسندیدہ واولی ہوجاتی ہے بلکہ ضروری بھی ہوجاتی ہے جب کہ ایسا نہ کرنے میں اس قسم کے ضرورت مندوں کے ضیاع کا اندیشہ ہو۔

۵- بات آچکی ہے کہ یتیم کی کفالت صرف دادا کی ذمہ داری نہیں بلکہ دادا نہ ہو یا دادا صاحب وسعت نہ ہو تو چچا کی ذمہ داری وہی ہے جو دادا کی ہے، چچا کو بھتیجوں کی پرورش وتربیت کی پوری فکر کرنی چاہئے اور ضرورت کے مطابق ان کو ہبہ ووصیت کی شکل اپنانی چاہئے۔

حتی کہ بالفرض دادا صاحب وسعت ہے مگر اس نے نہ ہبہ کیا اور نہ وصیت تو چچا کا فرض بنتا ہے کہ وہ محروم ومجبور بھتیجے کا خیال کرے اور اس پر خرچ کرے بلکہ مستقبل کیلئے اور مستقبل میں نظم کیلئے ہبہ کی شکل اپنائے۔

۶- دادا و چچا وغیرہ اپنی ذمہ داری محسوس نہ کریں تو خاندان کے دیگر افراد نیز محلّہ ومعاشرہ کے ذمہ دار افراد کو چاہئے کہ دادا و چچا وغیرہ سے بات کر کے ان کو پوتے وبھتیجوں کیلئے مناسب نظم پر مجبور کریں۔

۷- اور ایسی کوئی شکل نہ ہوسکے تو اسی صورت میں حکومت کے ساتھ ساتھ معاشرہ کے صاحب وسعت افراد کی بھی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ کمزور ومجبور اور بے بس افراد کی زندگی کو بچانے اور ان کو قیمتی بنانے کی فکر کریں اور اس کیلئے ایثار وقربانی کریں۔

۸- آج ضرورت ہے کہ شریعت کے ان ٹھوس ومضبوط اور نہایت مضبوط کارآمد

احکام ونظام کو اچھی طرح سمجھا جائے اور لوگوں کے درمیان اس کو پھیلایا وعام کیا جائے۔

سورہ نساء جس میں اسلام کے وراثت کے نظام کو پورے طور پر بیان کیا گیا ہے اس میں اس تفصیل سے پہلے تین آیات ہیں جن کو شریعت کا نظام ومزاج سمجھنے کیلئے سامنے رکھنا چاہئے، ان تین آیات سے پہلے بھی بطور تمہید آیت نمبر ۲؍ سے لے کر ۷؍ تک اسی سلسلہ کی چیزیں ذکر کی گئی ہیں اور خصوصیت سے یتیموں کی بابت کافی ہدایات دی گئی ہیں، یہ تین آیات ۸، ۹، ۱۰ ہیں جن کا اس موقع سے صرف ترجمہ ذکر کیا جارہا ہے جو بیان القرآن سے لیا گیا ہے۔

آیت: ۸- اور جب (وارثوں میں ترکہ کے) تقسیم ہونے کے وقت آموجود ہوں رشتہ دار (دور کے) اور یتیم اور غریب لوگ تو ان کو بھی اِس (ترکہ) میں (جس قدر بالغوں کا ہے اس میں) سے کچھ دے دو اور ان کے ساتھ خوبی سے بات کرو۔

آیت: ۹- اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہئے کہ اگر اپنے بعد چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ جاویں تو ان کی ان کو فکر ہو سو ان لوگوں کو چاہیے کہ خدا تعالیٰ سے ڈریں۔ اور موقع کی بات کہیں۔

آیت: ۱۰- بلاشبہ جو لوگ یتیموں کا مال بلا استحقاق کھاتے (برتتے) ہیں اور کچھ نہیں اپنے شکم میں آگ بھر رہے ہیں اور عنقریب جلتی آگ میں داخل ہونگے۔

☆☆☆☆☆

یکساں سول کوڈ: قانونی اور تاریخی جائزہ

مولانا عتیق احمد بستوی
(سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء، لکھنو)

مئی ۱۹۹۵ء میں سپریم کورٹ کی ایک بنچ جو (جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس آر اے سہائے) پر مشتمل تھی اس نے تبدیلیٔ مذہب کے بعد دوسری شادی کے بارے میں ایک فیصلہ دیا۔

کیس کی نوعیت یہ تھی کہ چار ہندو عورتوں نے اپنے شوہروں کے خلاف یہ دعویٰ کیا تھا کہ ان کے شوہروں نے اسلام قبول کیا اور دوسری شادی کر لی، لہٰذا ان کے شوہروں پر تعزیرات ہند کی دفعہ ۴۹۴ کا اطلاق کرتے ہوئے دوسری شادی کو باطل قرار دیا جائے اور سزا نافذ کی جائے، سپریم کورٹ کی مذکورہ بالا بنچ نے ہندو عورتوں کی دادرسی کرتے ہوئے ان کے نومسلم شوہروں کی دوسری شادی کو باطل اور غیر قانونی قرار دیا اور کہا ایک ہندو شوہر کا مذہب اسلام قبول کر لینے کے بعد دوسری شادی کر لینا انصاف، مساوات اور نیک چلنی کی صریح خلاف ورزی ہے اور انصاف کی اصل روح کی بنیاد پر شادی ناجائز ہے۔

سپریم کورٹ کی مذکورہ بالا بنچ نے اصل مقدمہ کا فیصلہ کرنے کے ساتھ حکومت ہند کو یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کی طرف متوجہ کیا اور مرکزی حکومت کو ہدایت دی کہ اگست ۱۹۹۶ء تک ایک حلف نامہ داخل کرے جس میں اس بات کی وضاحت ہو کہ تمام شہریوں کے لئے یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کے سلسلے میں اس نے کیا کیا اقدامات کئے۔

احقر نے اس وقت سپریم کورٹ کے مذکورہ بالا فیصلے اور یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ پر

کورٹ کے زور دینے کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون لکھا تھا جس میں مذکورہ بالا فیصلے کا قانونی ودستوری تجزیہ تھا اور یونیفارم سول کوڈ کے مسئلہ کا قانونی اور تاریخی جائزہ پیش کیا تھا، یہ مضمون میری کتاب ''ہندوستان میں نفاذ شریعت'' میں شائع ہوا۔ (ص ۴۷ تا ۸۲)

اس وقت مرکز میں کانگریس پارٹی کی حکومت تھی، سپریم کورٹ کے مذکورہ فیصلہ کے بعد یونیفارم سول کوڈ پر بحث پورے ملک میں پھر زندہ ہوگئی تھی، جن صوبوں میں بی جے پی کی حکومت تھی ان میں سے بعض صوبوں نے اپنے یہاں یونیفارم سول کوڈ مرتب اور لاگو کرنے کے عزم وارادہ کا اظہار کردیا تھا۔

اس وقت ملک میں یونیفارم سول کوڈ کی بحث پھر زور وشور کے ساتھ جاری ہے اس وقت مرکز اور اکثر صوبوں میں بھارتیہ جنتا پارٹی برسر اقتدار ہے اس کے مینوفیسٹو میں بھی یونیفارم سول کوڈ بنانے اور نافذ کرنے کا وعدہ شامل رہا ہے لیکن اس وقت مرکزی حکومت سے بڑھ کر بھاجپا کی بعض صوبائی حکومتیں یونیفارم سول کوڈ کی تیاری اور نفاذ کے لئے زیادہ پرجوش نظر آرہی ہیں، موضوع کے مختلف پہلوؤں سے ہمارا واقف ہونا ضروری ہے اس لئے اپنے مذکورہ بالا مضمون کا اتنا حصہ جو'' یکساں سول کوڈ کے مسئلہ کا قانونی اور تاریخی جائزہ'' پر مشتمل ہے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے تاکہ اس مسئلہ کی سنگینی اور اس کی صحیح نوعیت ہمارے سامنے واضح ہو۔

یونیفارم سول کوڈ (یکساں شہری قانون) کا حساس اور نازک مسئلہ دستور ہند سے جڑا ہوا ہے اس لئے سب سے پہلے دستور ہند کی روشنی میں اس مسئلہ کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

آزاد ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی میں خواندگی اور بحث وتمحیص کے بعد موجودہ دستور ہند ۲۹ر نومبر ۱۹۴۹ء کو منظور ہوا، کچھ دفعات فوری طور پر نافذ کردی گئیں اور باقی آئین کے نفاذ کے لئے ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کی تاریخ طے پائی۔

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا تقسیم ملک کے نام پر پیدا ہونے والے لرزہ خیز حالات نے ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں سوالیہ نشان لگادیا، برادران وطن کا

ذہن یہ تھا کہ جب مسلمانوں نے پاکستان بنوالیا تو اب انہیں ہندوستان میں رہنے کا کیا حق ہے، ہندوستان کے بچے کھچے مسلم قائدین اس کوشش میں شب وروز لگے ہوئے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے پاؤں جم جائیں ان کے دلوں سے خوف وہراس دور ہو، ان ہنگامہ خیز اور غیر معتدل حالات میں دستور ہند مرتب اور منظور ہوا۔

دفعہ ۴۴ دستور ہند میں کس طرح شامل ہوئی

یکساں سول کوڈ کا تصور ہماری جدوجہد آزادی کے دور میں کہیں بھی موجود نہیں تھا، بلکہ اس کے برعکس جمعیۃ علماء ہند نے کانگریس کا ساتھ اسی شرط پر دیا تھا کہ مسلمانوں کو آزادی کے بعد اپنے دینی معاملات شریعت کے مطابق طے کرنے کا اختیار ہوگا اور ان کے پرسنل لا (عائلی قوانین) میں کوئی مداخلت نہ کی جائے گی۔

یونیفارم سول کوڈ کا تصور اچانک ابھر کر اس وقت سامنے آیا جب کہ آئین ساز اسمبلی ملک کا آئین تیار کرنے میں مصروف تھی، اس مرحلہ میں بنیادی حقوق سے متعلق ذیلی کمیٹی کی ۲۸ر مارچ ۱۹۴۷ء کی میٹنگ میں مسٹر ایم۔ آر مسانی کی طرف سے ایک تجویز رکھی گئی کہ بنیادی حقوق میں ایک شق یکساں سول کوڈ کی بھی شامل کی جائے جس کا اطلاق بلاتفریق مذہب تمام شہریوں پر ہو پہلے مرحلہ میں کمیٹی کی اکثریت نے یہ تجویز مسترد کردی لیکن ۳۰ر مارچ ۱۹۴۷ء کی میٹنگ میں تجویز پھر پیش ہوئی، اس کے بعد ذیلی کمیٹی نے معمولی اکثریت سے یہ فیصلہ کیا کہ یکساں سول کوڈ کی ایک کلاز سماجی پالیسی کے رہنما اصولوں میں شامل کرلی جائے۔

پارلیمنٹ میں جب دستور ہند کی خواندگی ہوئی اور دفعہ ۴۴ جو یکساں سول کوڈ کو آئینی حیثیت دینے پر مشتمل ہے زیر بحث آئی تو بہت سے مسلم ممبران نے اس کے خلاف آواز اٹھائی، اور دفعہ ۴۴ کے مضر اثرات کو ختم کرنے کے لئے مختلف ترمیمات پیش کیں لیکن یہ ترمیمات منظور نہ ہوسکیں مثلاً محمد اسماعیل صاحب مرحوم کی پیش کردہ بعض ترمیمات یہ ہیں:

(۱) دفعہ ۳۵ میں درج ذیل شق کا اضافہ کردیا جائے ''کسی گروپ یا فرقہ کو اپنے پرسنل لا سے دستبردار ہونے کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا، اگر اس کے پاس ایسا قانون موجود ہے''۔ (آئین ساز اسمبلی ڈیبٹ، جلد ۷ ص ۵۴۰)

(۲) دفعہ ۱۳ کی کلاز (۱) کی سب کلاز (جی) میں یہ نیا سب کلاز جوڑ دیا جائے ''کوئی شخص جس گروپ یا فرقے سے تعلق رکھتا ہو یا اس سے تعلق کا اظہار کرتا ہو اس کے پرسنل لا پر عمل کرنے کی آزادی''۔ (آئین ساز اسمبلی ڈبیٹ، جلد ۷ ص ۷۲۱)

طویل بحثوں کے باوجود مسلم ممبران پارلیمنٹ کی پیش کردہ ترمیمات جن کا مقصد پرسنل لا کو دفعہ ۴۴ کی زد سے بچانا تھا منظور نہ ہوسکیں، ترمیم کا مطالبہ کرنے والوں کو ڈاکٹر امبیڈکر نے یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی:

''یہ محض حکومت کو اختیار دیا جارہا ہے جس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مذہبی، شخصی قوانین کو ختم کردینا ضروری ہوگا، خواہ ملک کے مسلمان، عیسائی یا کوئی اور فرقہ اس سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کرے، کسی کو یہ خطرہ نہ ہونا چاہئے کہ صرف اختیار کے مل جانے کی وجہ سے حکومت اس پر عمل کے لئے اصرار کرے گی۔

حکومت کے اختیار عملاً محدود ہوا کرتے ہیں، خواہ لفظی طور پر آپ انہیں کتنا ہی غیر محدود کرلیں، کیونکہ حکومت اپنے اختیارات کا استعمال اس طرح نہیں کرسکتی جس کے نتیجہ میں مسلمان بغاوت پر آمادہ ہوجائیں، اگر حکومت کسی وقت ایسا کرنے کی سوچے تو اسے فاتر العقل کہنا چاہئے۔''

خلاصہ یہ کہ بہت سے ممبران پارلیمنٹ کی زوردار مخالفت کے باوجود دفعہ ۴۴ بلا کسی ترمیم واضافہ کے منظور کرلی گئی، اس طرح ہمارا دستور ایک کھلے ہوئے تضاد کا شکار ہوگیا۔

ایک طرف اس دستور کے حصہ سوم میں بنیادی حقوق کے تحت دفعہ ۲۵ میں لکھا گیا ''تمام اشخاص کو آزادئ ضمیر اور آزادی سے مذہب قبول کرنے اس کی پیروی اور اس کی تبلیغ کرنے کا مساوی حق ہے، بہ شرط یہ کہ امن عامہ، اخلاق عامہ، صحت عامہ اور اس حصہ کی

دیگر توضیحات متأثر نہ ہوں۔ (ص ۴۶)

دوسری طرف حکومت کو اختیار دیا گیا بلکہ ہدایت دی گئی کہ یکساں سول کوڈ نافذ کرکے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی سلب کرے۔

دستور کی دفعہ ۲۵ اور دفعہ ۴۴ میں تضاد

دستور کی ان دو دفعات ۲۵، ۴۴ کا تضاد سمجھنے کے لئے ہمیں کچھ تفصیل سے دستور ہند پر نظر ڈالنی ہوگی۔

دستور ہند بائیس حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں مملکت اور اس کے علاقوں کی تعیین وتفصیل بیان کی گئی ہے، حصہ دوم میں ہندوستانی شہریت کے قوانین بیان کئے گئے ہیں۔

دستور کے حصہ سوم میں ہندوستانی شہریوں کے آئینی حقوق تفصیل سے درج کئے گئے ہیں، دستور ہند کے اس حصہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ بنیادی حقوق کے تحت دفعہ ۱۳ میں تحریر ہے۔

(۱) وہ سب قوانین جو اس آئین کی تاریخ نفاذ سے عین قبل بھارت کے علاقہ میں نافذ ہوں، جہاں تک وہ اس حصہ کے متناقض ہوں تناقض کی حد تک باطل ہوں گے۔

(۲) مملکت ایسے قانون نہ بنائے گی جو اس حصہ سے عطا کئے ہوئے حقوق کو چھین لے یا ان میں کمی کرے اور کوئی قانون جو اس فقرہ کی خلاف ورزی میں بنایا جائے خلاف ورزی کی حد تک باطل ہوگا۔

بنیادی حقوق کے اس حصہ میں بہت سے حقوق ہیں مثلاً مساوات کا حق، حق آزادی، آزدئ مذہب کا حق، ثقافتی اور تعلیمی حقوق، آئینی چارہ جوئی کا حق وغیرہ۔

دفعہ ۲۵ تا ۲۸ کا تعلق مثبت یا منفی طریقہ پر آزادی مذہب سے ہے دفعہ ۲۵ میں کہا گیا ہے۔

دفعہ ۲۵ (۱) تمام اشخاص کو آزادی ضمیر اور آزادی سے مذہب قبول کرنے، اس کی پیروی اور اس کی تبلیغ کرنے کا مساوی حق ہے، بہ شرطیکہ امن عامہ، اخلاق عامہ، صحت عامہ

اوراس حصہ کی دیگر توضیعات متاثر نہ ہوں۔

(۲) اس دفعہ کا کوئی امر کسی ایسے موجودہ قانون کے نفاذ کو متاثر نہ کرے گا اور نہ وہ ایسے قانون کے بنانے میں مملکت کا مانع ہوگا جو

(الف) کسی معاشی، مالیاتی، سیاسی یا دیگر غیر مذہبی سرگرمی کو جس کا تعلق مذہبی عمل سے ہوسکتا ہو منضبط کرے یا اس پر پابندی لگائے۔

زیر بحث دفعہ ۲۵ میں آزادی مذہب کے حق کو امن عامہ، اخلاق عامہ، اور صحت عامہ کی زنجیروں سے جکڑ کر عدلیہ اور انتظامیہ کو لامحدود اختیارات دیدیے گئے ہیں کہ جس مذہبی عمل اور سرگرمی کو چاہیں اخلاق عامہ، امن عامہ، صحت عامہ کے لئے مضرت رساں ہونے کے بہانے روک دیں اور اس پر قانونی پابندی عائد کردیں۔

دستور کا چوتھا حصہ مملکت کی حکمت عملی کے رہنما اصول پر مشتمل ہے اس حصہ کی دفعات کے بارے میں دفعہ ۳۷ میں تحریر ہے۔

اس حصہ کی دفعات کوئی عدالت نافذ نہ کرسکے گی لیکن اس کے باوجود وہ اصول جو اس میں قلمبند کئے گئے ہیں مملکت کی حکمرانی کے لئے بنیادی ہیں اور مملکت کا فرض ہوگا کہ قوانین بنانے میں ان اصولوں کا اطلاق کرے۔

دستور کے حصہ چہارم (دستور کے رہنما اصول) کی دفعہ ۴۴ میں کہا گیا ہے۔

ریاست کوشش کرے گی کہ پورے ملک میں شہریوں کے لئے یکساں شہری قانون ہو۔

اوپر تفصیل سے یہ بات گذر چکی ہے کہ مسلمان ممبران پارلیمنٹ کی شدید تر مخالفتوں کے باوجود یکساں سول کوڈ کی دفعہ (دفعہ ۴۴) مملکت کے رہنما اصولوں میں شامل کرلی گئی، آئین ساز اسمبلی میں ایک طاقتور لابی موجود تھی جو مذہب کی عملداری انتہائی محدود کرنے بلکہ اسے ختم کرنے پر تلی ہوئی تھی، زندگی کے دوسرے میدانوں سے مذہب کی عملداری پہلے ہی ختم ہوچکی تھی۔

شریعت ایکٹ کا پس منظر ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے بڑی تیز رفتاری کے

ساتھ عدلیہ کا پورا ڈھانچہ تبدیل کرکے رکھ دیا، ۱۸۶۲ء میں اسلامی تعزیرات کو منسوخ کرکے تعزیرات ہند کا نفاذ عمل میں آیا، ۱۸۶۴ء میں زبردست قدم اٹھاتے ہوئے برطانوی حکومت ہند نے مسلمان قاضیوں کی تقرری موقوف کردی، ۱۸۶۴ء سے قبل ہر علاقہ میں حکومت کی طرف سے مسلمان قاضی مقرر کیے جاتے تھے جو مسلمانوں کے خانگی اور عائلی تنازعات میں شریعتِ اسلامی کے مطابق فیصلے دیا کرتے تھے، ۱۸۷۲ء میں اسلامی قانون شہادت کی حکمرانی عدالتوں سے ختم کردی گئی، اس کی جگہ انسانی ذہنوں کا تراشا ہوا قانون شہادت نافذ کیا گیا، غرضیکہ ایک ایک کرکے اسلامی قصر عدالت کی ساری اینٹیں جدا کرکے پورے عدالتی نظام کو غیر اسلامی خطوط پر استوار کیا گیا اور یہ سب کچھ سنگینوں کی نوک پر اور جبر وتشدد کے سہارے کیا گیا، مسلمانوں کی آہ وفریاد اور رونالہ واحتجاج نے کوئی اثر نہیں کیا۔

انگریزوں نے یہ سب کارروائیاں جوش غضب اور جذبۂ انتقام میں کیں، انہیں اس بات کا بے پناہ غصہ تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں نے برطانوی سامراج کا استقبال کرنے کے بجائے قدم قدم پر اس کی شدید مزاحمت کی اور ہندوستان سے انگریزوں کا اقتدار ختم کرنے کے لئے ہر خطرہ مول لیا۔

امتداد زمانہ کے ساتھ انگریزوں کے جذبۂ انتقام میں کچھ کمی ہوئی، انگریز حکام نے محسوس کیا کہ برطانوی حکومت ہند سے مسلمانوں کی نفرت وعداوت کا سب سے اہم سبب ان کے دینی معاملات میں صریح مداخلت ہے، بالآخر مرکزی مجلس قانون ساز کے مسلم اراکین کی تحریک اور کوششوں سے ۱۹۳۷ء میں شریعت ایکٹ منظور ہوا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''وراثت، نکاح، فسخ نکاح بشمول طلاق، ایلاء، ظہار، لعان، خلع، مبارات، نفقہ، مہر، ثبوتِ نسب، امانت، جائداد، حق شفعہ، ہبہ، اوقاف کے معاملات میں مسلمانوں پر لازمی طور پر پرسنل لا کا اطلاق اختیار ہوگا۔''

شریعت ایکٹ منظور ہونے سے ہندوستان میں اسلام کے عائلی قوانین کو بڑی حد تک تحفظ حاصل ہوا۔

تحریک آزادی اور مسلم پرسنل لا

بیسیوں صدی کے ابتدائی دہوں میں پورا ہندوستان تحریک آزادی کے نعروں سے گونج رہا تھا، ہندوستان کی تمام قومیں ہندوستان کی آزادی کے لئے جان و مال کی بازی لگارہی تھیں، ہندوستانی مسلمان جدوجہد آزادی کا ہراول دستہ تھے، تحریک آزادی میں مسلمان علماء، قائدین اور عوام اپنے ملی تناسب آبادی سے کہیں زیادہ حصہ لے رہے تھے، کانگریس کے صف اول کے قائدین میں بہت سے علماء اور مسلم رہنما شامل تھے، جمعیۃ علماء ہند کانگریس کے شانہ بشانہ جدوجہد آزادی میں شریک تھی، اس لئے آزادی سے پہلے کانگریس نے اپنے متعدد سالانہ کانفرنسوں کی قراردادوں میں مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے مسئلہ کو شامل کیا، مسلمانوں سے صریح وعدہ کیا اور یقین دہانی کرائی کی آزادی کے بعد مسلم پرسنل لا کا پورا تحفظ کیا جائے گا اور اس میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔

دستورِ ہند اور مسلمان

آزادی کی صبح بڑی قربانیوں اور تمناؤں کے بعد طلوع ہوئی لیکن یہ صبح جس کا مدتوں سے انتظار تھا مسلمانوں کے لئے بڑی بھیانک ثابت ہوئی، تقسیم ملک کے نتیجہ میں نفرت وعداوت کا بادل پورے ملک پر چھا گیا، بے گناہوں کے خون سے ہندوستان کی سرزمین لالہ زار ہوگئی، مسلمانوں نے آزادی کا جو سہانا خواب دیکھا تھا وہ بکھر کر رہ گیا، انہیں حالات میں جب کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود و بقا پر سوالیہ نشان لگ گیا تھا دستورِ ہند مرتب اور منظور ہوا، ہندوستان میں بچے کھچے مسلم قائدین اس جدوجہد اور فکر میں لگے ہوئے تھے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کے پیر اکھڑ نہ جائیں، دستور ہند کے واضعین نے مذہب، زبان، تہذیب کی آزادی کو بنیادی حقوق میں شامل ضرور کیا لیکن مذہب کی آزادی کا دائرہ کہاں تک ہے اس کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کی اور اس کے دائرہ کا تعین عملاً عدلیہ اور انتظامیہ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ حیرت یہ ہے کہ جس دستورِ ہند میں پسماندہ اقوام اور

بعض اقلیتوں کے تعلق سے معمولی جزئیات کی تفصیل موجود ہے اسی دستور میں اقلیتوں کے پرسنل لا کے تحفظ سے متعلق ایک جملہ بھی موجود نہیں ہے، مسلم اراکین پارلیمنٹ نے ایسی بعض دفعات دستور میں شامل کرانے کی کوشش کی لیکن انہیں ناکامی ہوئی، ستم بالائے ستم یہ ہے کہ دستور میں مسلم اراکین کی مخالفت کے باوجود یکساں سول کوڈ کی دفعہ (دفعہ ۴۴) شامل کردی گئی، واضعین دستور نے دفعہ ۴۴ شامل کرکے اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے سروں پر ننگی تلوار لٹکا دی تاکہ جب بھی حالات سازگار ہوں اقلیتوں کے پرسنل لا کا سر قلم کیا جاسکے۔

یکساں سول کوڈ کی تشکیل وتنفیذ کی کوشش

یکساں سول کوڈ کی تدوین وتنفیذ کی دفعہ (دفعہ ۴۴) کو دستور میں شامل کرتے وقت قانون ساز اسمبلی میں جو بحثیں ہوئیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ پرسنل لا کو مذہب سے دائمی طور پر جدا کرنے کے مقصد سے یہ دفعہ دستور میں شامل کی گئی، دستوری طور پر پارلیمنٹ کو یکساں سول کوڈ کی تشکیل وتنفیذ کا اختیار دیا گیا بلکہ حکومتِ ہند کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں پوری کوشش کرے۔

حکومتِ ہند اپنی اس ''ذمہ داری'' سے غافل بھی نہیں ہے، مسلم پرسنل لا کو ختم کرکے یونیفام سول کوڈ نافذ کرنے کے لئے کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہے، اپنے کو مسلمان کہنے والے ان تجدد پرستوں کے مہمل خیالات کو ہوا دی جارہی ہے جو اسلام کے عائلی قوانین میں اصلاح وتبدیلی کا مطالبہ کررہے ہیں، مغرب پرست مسلم خواتین کی تنظیمیں قائم کراکے مسلم پرسنل لا کو عورتوں کے حق میں ظلم عظیم ثابت کرنے کی کوششیں جاری ہیں، اس بات کی برابر کوشش جاری ہے کہ مسلمانانِ ہند کا ایک معتد بہ طبقہ مسلم پرسنل لا کو ختم کرکے یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑا ہو، تاکہ یہ کہا جاسکے کہ ہم نے خود مسلمانوں کے مطالبہ پر یہ اقدام کیا ہے، ہمارا قومی پریس اسلام کے عائلی قوانین کو ہدف بنانے والے واہی تباہی مضامین کو شہ سرخیوں میں جگہ دیتا ہے اور اسلامی قوانین کی حمایت

میں لکھے گئے فاضلانہ مضامین اور مراسلوں کو کسی گوشہ میں بھی شائع کرنے کا روادار نہیں۔

دستورِ ہند میں اس بات کی صراحت کردی گئی ہے کہ ''رہنما اصول'' کی دفعات عدالتوں کے ذریعہ قابلِ نفاذ نہیں، اس کے باوجود شاہ بانو کیس کے فیصلہ (۱۹۸۵ء) سے لے کر سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ (مئی ۱۹۹۵ء) تک عدالت عالیہ کے معزز جج صاحبان اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے دفعہ ۴۴ کے نفاذ پر مسلسل اصرار کررہے ہیں اور اپنے تہلکہ خیز فیصلوں کے ذریعہ حکومت کو یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے لئے مہمیز کرتے رہتے ہیں۔

مذہبی آزادی اور مذہبی عمل کی تشریح

مذہبی آزادی اور مذہبی عمل کی تشریح وتعبیر میں سپریم کورٹ کے مختلف فیصلوں کا جائزہ بہت سے چونکا دینے والے حقائق کا انکشاف کرتا ہے، ہندوؤں کی طرف سے دائر مقدمات میں وہ سارے کام مذہبی عمل قرار دیئے جاتے ہیں جنہیں برادران وطن مذہبی عمل شمار کرنا چاہیں حتی کہ مختلف یاترائیں نکالنا اور متنازعہ مقامات پر کسی بھی مذہبی عنوان سے لاکھوں کا مجمع اکٹھا کرنا مذہبی عمل قرار پاتا ہے خواہ ان کی اجازت دینے سے پورے ملک کا امن وامان درہم برہم ہوجائے اور شدید خونریزی کا خطرہ ہو، اس کے برخلاف اگر عدالتِ عالیہ میں مسلمانوں کا معاملہ زیر بحث ہو تو مذہبی آزادی اور مذہبی عمل کا دائرہ انتہائی محدود ہوجاتا ہے، نکاح وطلاق وغیرہ کے معاملات کو مذہبی عمل میں داخل کرنا قابل غور ہوجاتا ہے، غرضیکہ مذہبی آزادی اور مذہب پر عمل کی تشریح میں عدالتِ عالیہ کے بہت سے فاضل جج صاحبان کے پاس دو پیمانے ہیں اکثریت کے لئے ایک پیمانہ اور اقلیت کے لئے دوسرا پیمانہ۔

یکساں سول کوڈ اور مسلمان

ملک کی آزادی کے بعد (انتہائی مختصر مدت کو چھوڑ کر) مرکز میں کانگریس کی حکومت رہی، آزادی کے چند سال بعد ہندو قوم کے لئے مختلف عائلی قوانین پارلیمنٹ میں منظور کئے گئے جو ہندو کوڈ بل کے نام سے مشہور ہوئے، ہندو کوڈ بل کو بہت سے مذہبی ہندوؤں

نے پسند نہیں کیا اور اسے مذہب میں مداخلت قرار دیا لیکن سیاسی رہنماؤں نے ہندو اراکین پارلیمنٹ کو یہ ذہنی رشوت دی کہ ہندو کوڈ بل کی منظوری یکساں سول کوڈ کے لئے مضبوط قدم ہے جب ہندو قوم پارلیمنٹ کے ذریعہ منظور شدہ عائلی قوانین قبول کرلے گی تو مسلم پرسنل لا کو ختم کرنا اور یکساں شہری قانون کو نافذ کرنا انتہائی آسان ہوجائے گا، حکومت کے ذمہ داروں کی طرف سے وقتاً فوقتاً یہ باتیں کہی جاتی رہیں اور مسلمانوں کو کبھی دھمکا کر اور کبھی نرم لہجہ میں یکساں سول کوڈ کو قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔

جب ہندو پرسنل لا کو نئی شکل دی جارہی تھی اس وقت کے مرکزی وزیر قانون مسٹر پاٹکر نے کہا تھا ''ہم نے اپنے آئین کے نفاذ (۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء) کے بعد اسپیشل میرج ایکٹ، ہندو میرج ایکٹ پاس کیے ہیں اب ہندو قانونِ وراثت کا مسودہ پارلیمنٹ میں زیر غور ہے یہ سب ضابطۂ دیوانی یکساں بنانے کے اقدامات ہیں''۔ (۲۵ر اگست ۱۹۵۵ء کی ریڈیائی تقریر)

۱۹۶۳ء میں حکومت نے ایک کمیشن مقرر کرنا چاہا تھا جس کا مقصد مسلم پرسنل لا میں تبدیلی پر غور وفکر اور اس کے لئے عملی راہوں کو تلاش کرنا تھا، مسلمانوں کی ہمہ گیر مخالفت کے نتیجہ میں یہ کمیشن مقرر نہیں کیا گیا اور وزیر قانون نے پارلیمنٹ میں یہ کہہ کر بحث ختم کردی کہ حکومت اس وقت مسلم پرسنل لا میں کوئی ترمیم کرنا مناسب نہیں سمجھتی۔

۱۹۷۳ء میں مرکزی وزیر قانون مسٹر گھوکھلے نے متبنیٰ بل کو پیش کرتے ہوئے پارلیمنٹ میں کہا، یہ مسودۂ قانون یونیفارم سول کوڈ کی طرف ایک مضبوط قدم ہے۔

مارچ ۱۹۷۳ء میں گوجندر گڈکر (چیرمین لاکمیشن) نے کہا تھا: ''مسلمانوں کو یونیفارم سول کوڈ قبول کرنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کرلینا چاہئے، اگر انہوں نے خوش دلی کے ساتھ یہ تجویز منظور نہیں کی تو قوت کے ذریعہ نافذ کیا جائے گا۔''

حکومت کی طرف سے یکساں سول کوڈ کے لئے فضا ہموار کرنے، خصوصاً مسلمانوں کو مسلم پرسنل لا سے دستبرداری پر آمادہ کرنے کے لئے کوششیں برابر جاری رہیں، مسلمانوں

کی نبض ٹٹولنے اوران کے سیاسی موڈ کا اندازہ لگانے کے لئے بہت تھوڑے تھوڑے عرصہ میں یکساں سول کوڈ کا شوشہ چھوڑا جاتا رہا اوراب تک یہ سلسلہ جاری ہے، سپریم کورٹ کا زیر بحث فیصلہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

ہندو عائلی قوانین میں اصلاح کا مقصد

یہ کہنا بہت بڑی فریب دہی ہے کہ ہندوقوم ملک کی یکجہتی اور قانون میں یکسانیت لانے کے لئے اپنے عائلی قوانین (پرسنل لا) میں تبدیلی واصلاح پر آمادہ ہوئی اوراس نے ملک کے مفاد کے لئے اپنے مذہبی جذبات کی قربانی دی، واقعہ یہ ہے کہ ہندو مذہب میں انسانی فطرت سے میل کھاتے ہوئے قابل عمل عائلی قوانین موجود ہی نہیں، ہندوؤں کی مختلف قوموں اوران کے مختلف خطوں میں شادی بیاہ وغیرہ کے تعلق سے الگ الگ رسم ورواج تھے اور یہ رسم ورواج انتہائی متضاد اور مختلف تھے، بیوہ عورتوں کو دوسری شادی کا حق نہیں تھا، ان کے لئے کمال کی بات یہ تھی کہ اپنے متوفی شوہر کی چتا میں جل کر راکھ ہوجائیں اوراپنی وفاداری کا ثبوت پیش کریں، میاں بیوی کے تعلقات خواہ کتنے ہی کشیدہ ہوجائیں ہندورسم ورواج میں طلاق کی گنجائش نہیں تھی، میراث وغیرہ کے بارے میں بھی ہندو مذہب کے قوانین انتہائی غیر عادلانہ تھے اس صورت حال نے ہندوقوم کے قائدین کو مجبور کیا کہ وہ غیر فطری اور ظالمانہ رسم ورواج کو ختم کرنے کے لئے پارلیمنٹ کے ذریعہ ہندوکوڈ بل پاس کرائیں، ہندوکوڈ بل دیوانی قوانین میں یکسانیت لانے کے لئے ہرگز منظور نہیں کیا گیا ورنہ اسپیشل میرج ایکٹ کے بعد ہندو میرج ایکٹ (۱۹۵۵ء) منظور کرانے کی کیا ضرورت تھی، علاوہ ازیں خود ہندوکوڈ بل کی مختلف دفعات میں بہت سے معاملات کو رسم ورواج پر چھوڑ دیا گیا ہے، ایسی صورت میں قانون میں یکسانیت کہاں پیدا ہوئی۔ (ملاحظہ ہو ہندو میرجز ایکٹ کی دفعہ (۱) ۱۷ اور (۲) ۱۷۔

چور دروازوں سے مسلم پرسنل لا میں مداخلت

ابھی تک مسلم پرسنل لا کو ختم کرنے کا راست اقدام نہیں کیا جاسکا ہے لیکن مختلف چور دروازوں سے اس پر نقب لگائی جاتی رہی ہے، پارلیمنٹ اور مختلف صوبائی اسمبلیوں نے ایسے مختلف قوانین منظور کئے ہیں جن کی زد اسلام کے عائلی قوانین پر پڑتی ہے، تعزیرات ہند میں بھی ایسی متعدد دفعات شامل کی گئی ہیں جن سے مسلم پرسنل لا کا نفاذ بری طرح مجروح اور متأثر ہوا ہے اسی طرح سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس کے بہت سے فیصلے بھی مسلم پرسنل لا میں دخل انداز ہوئے ہیں، افسوس ہے کہ اب تک ہمارے پاس ان قوانین اور فیصلوں کی مکمل فہرست بھی نہیں ہے جس سے پرسنل لا کے مختلف حصے مجروح ہوئے ہیں، بہت سے قوانین انتہائی خاموشی سے پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں پاس ہوجاتے ہیں اور ہمارے مسلم اراکین پارلیمنٹ کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس قانون کی زد کہاں پڑسکتی ہے، جب عدالتوں کے ذریعہ ان قوانین کے مطابق فیصلہ ہوتا ہے اور شاہ بانو کیس جیسی صورت حال پیدا ہوتی ہے تو ہمارے کان کھڑے ہوتے ہیں اور ہم آنکھ ملتے ہوئے مقابلہ کی تیاری شروع کرتے ہیں۔

یکساں سول کوڈ اور بھاجپائی حکومتیں

جسٹس کلدیپ سنگھ کے حالیہ فیصلہ کے بعد یونیفارم سول کوڈ کا مسئلہ پھر بحث ومباحثہ کا موضوع بن گیا ہے، قومی پریس میں اسلام کے عائلی قوانین کے خلاف انتہائی زہر افشانی کی جارہی ہے، طبقۂ نسواں کے تعلق سے مسلم سماج کی تصویر انتہائی مسخ کرکے پیش کی جارہی ہے اور مسلم خواتین کے حال زار پر آنسو بہائے جارہے ہیں، بھارتیہ جنتا پارٹی نے خاص طور پر اس مسئلہ کو ہوا دی ہے اور اسے اپنا انتخابی ایشو بنانے کا فیصلہ کیا ہے، یونیفارم سول کوڈ کے مسئلہ پر بھاجپائی قائدین اور وزراء اعلی کی کئی میٹنگیں ہوچکی ہیں انہوں نے مرکز پر زور دیا ہے کہ سپریم کورٹ کی ہدایت کے مطابق جلد از جلد یکساں سول کوڈ مدون اور نافذ کرے، بھاجپا نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ اگر مرکز نے اس مسئلہ کے بارے میں سرد مہری

کا ثبوت دیا تو جن صوبوں میں بھاجپا یا اس کی حلیف پارٹیوں کی حکومت ہے وہاں یکساں سول کوڈ جلد از جلد نافذ کیا جائے گا۔ (گجرات، دہلی، راجستھان، مہاراشٹر)

کیا صوبائی حکومتیں مسلم پرسنل لا میں مداخلت کرسکتی ہیں؟

بھاجپا کے اس عزم اور فیصلہ پر بہت سے لوگوں کو حیرت ہے کہ کیونکہ دفعہ ۴۴ کی مخاطب مرکزی حکومت ہے اس کی رو سے مرکزی حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ملک کے تمام شہریوں کے لئے یکساں سول کوڈ مدون کرنے اور نافذ کرنے کی کوشش کرے، دفعہ ۴۴ کے اعتبار سے یونیفارم سول کوڈ کی تدوین وتنفیذ کی ذمہ داری مرکزی حکومت پر عائد ہوتی ہے، صوبے اس کے مخاطب اور مجاز نہیں لیکن بھاجپا کے اس فیصلے پر استعجاب دستور ہند کے ناقص مطالعہ پر مبنی ہے، صورت حال یہ ہے کہ قانون سازی کے تعلق سے دستورِ ہند میں تین فہرستیں درج ہیں فہرست (۱) میں وہ امور گنائے گئے ہیں جن کے بارے میں قانون سازی کا اختیار صرف مرکزی حکومت کو ہے، فہرست (۲) میں وہ امور درج ہیں جن کے بارے میں قانون سازی کا اختیار صرف ریاستی حکومت کو ہے اور فہرست (۳) میں ان امور کا اندراج ہے جن کے بارے میں قانون سازی کا اختیار مرکزی حکومت کو بھی ہے اور صوبائی حکومتوں کو بھی، ان امور میں پرسنل لا کے مسائل بھی ہیں چنانچہ فہرست (۳) میں شامل پانچواں امر یہ ہے کہ دفعہ ۵، بیاہ وطلاق، اطفال ونابالغان، وصیتیں، وفات بلا وصیت اور وراثت خاندان مشترکہ اور بٹوارہ سب امور جن کے متعلق عدالتی کارروائی کے فریق اس آئین کی تاریخِ نفاذ کے عین قبل اپنے شخصی قانون کے تابع تھے۔ (بھارت کا آئین ص ۷۵۳)

غرضیکہ پرسنل لا کے مسائل میں قانون سازی کا اختیار مرکز اور صوبوں دونوں کو ہے اس لئے اگر مختلف صوبوں کی بھاجپائی حکومتیں مسلم پرسنل لا کو ختم کرنے کے لئے اپنے صوبوں میں یکساں عائلی قوانین نافذ کریں تو ان کے لئے کوئی بڑی دستوری رکاوٹ موجود نہیں ہے، بہت سے بہت یہ ہوگا کہ شریعت اپلیکیشن ایکٹ ۱۹۳۷ء (جو ایک مرکزی

قانون ہے) سے صوبائی قوانین کا ٹکراؤ ہوگا، ایسی صورت میں مرکزی حکومت اگر سنجیدگی سے اس پر کوئی ایکشن لینے کو تیار ہوگی تب تو ان صوبائی قوانین کی راہ میں کچھ قانونی رکاوٹ پیدا ہوسکتی ہے لیکن اگر مرکزی حکومت نے خاموشی اختیار کی تو تنہا مسلمانوں کی چارہ جوئی سے ان صوبائی قوانین کو ختم کرانا انتہائی مشکل ہوگا، بنیادی حقوق کی دفعہ ۲۵ (جس میں اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے اور اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی آزادی دی گئی ہے) کس حد تک ان بھاجپائی صوبائی حکومتوں کے عزائم میں حائل ہوسکتی ہے یہ سمجھنا ان لوگوں کے لئے مشکل نہیں ہے جو سپریم کورٹ کے مختلف فیصلوں پر نگاہ رکھتے ہیں اور مسلم پرسنل لا کے بارے میں عدالت ہائے عالیہ کے اکثر جج صاحبان کا موڈ سمجھتے ہیں۔

اوپر کے صفحات میں یہ جائزہ پیش کیا گیا کہ موجودہ ہندوستان میں اسلام کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لا) اور اسلامی تشخص کو کیا خطرات درپیش ہیں، دستور ہند کی آڑ میں اسلام کی معاشرتی اور عائلی قوانین کو سبوتاژ کرنے کے لئے کس قدر منظم اور مسلسل کوششیں ہورہی ہیں، اور دستور ہند مسلم پرسنل لاء کو کس حد تک تحفظ فراہم کرتا ہے۔

یکساں سول کوڈ اور اقلیتیں

یکساں سول کوڈ کا شوشہ بار بار چھوڑنے سے صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ملک کی دوسری اقلیتیں بھی مضطرب اور فکر مند ہیں، ۲۴ ستمبر ۱۹۹۵ء کو امرتسر میں منعقدہ عائلی سکھ کانفرنس میں سکھوں کے علاحدہ پرسنل لا پر زور دیا گیا اور کانفرنس نے یکساں سول کوڈ کو تسلیم نہ کرنے کا اعلان کیا۔ (قومی آواز لکھنؤ، ۲۵ ستمبر ۱۹۹۵ء)

ہندوستان میں آباد عیسائی (کرسچین) بھی اپنے علاحدہ پرسنل لا کو مرتب اور منظور کرانے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں، یونیفارم سول کوڈ انہیں بھی تسلیم نہیں، بدھسٹوں کی طرف سے بھی اس قسم کی آواز اٹھ چکی ہے، بہت سے ہندو قبائل بھی یکساں سول کوڈ کے سیلاب میں بہنے کو تیار نہیں، انہیں اپنے قبائلی رسم ورواج اور طریقۂ زندگی پر حد درجہ اصرار

ہے، خلاصہ یہ ہے کہ یکساں سول کوڈ مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان کی دوسری مذہبی اور تہذیبی اقلیتوں کو بھی منظور نہیں، خود ہندوؤں کے بہت سے فرقے اور قبائل بھی اسے مسترد کرتے ہیں۔

اسی طرح ہندوؤں کے بہت سے اہل فکر ودانش یکساں سول کوڈ کے نعرہ کو بے وقت کی راگنی اور بے فائدہ عمل تصور کرتے ہیں، یہ تو ہمارے قومی پریس کی سحر کاری ہے کہ اس نے یونیفارم سول کوڈ کے مطالبہ کو پوری قوم کا مطالبہ بنا کر پیش کیا ہے حالانکہ درحقیقت اس کے حامی بہت اقلیت میں ہیں، ہندوؤں کا ایک بہت مختصر اور جارح طبقہ ہی یکساں سول کوڈ کا داعی اور منادی ہے۔

اس لئے اگر دفعہ ۴۴ کی منسوخی کے لئے سنجیدہ اور منظم جدوجہد کی جائے تو اس کے لئے رائے عامہ ہموار کرنا کوئی دشوار تر کام نہیں، ظاہر ہے کہ یہ کام آناً فاناً نہیں ہوسکتا ہے بلکہ اس کے لئے بڑی ہوشمندی اور حکمتِ عملی سے طویل جدوجہد کرنی ہوگی، ان تمام اقلیتوں اور مذہبی اور تہذیبی اکائیوں کو ساتھ لینا ہوگا جو یکساں سول کوڈ کو اپنے مذہب اور ثقافت کے لئے خطرہ تصور کرتی ہیں، افہام وتفہیم اور مذاکرات سے ہندو اہل سیاست اور اہل فکر ودانش کو بھی اس بات کا قائل بنانا ہوگا کہ یکساں سول کوڈ پر اصرار ملک کے لئے مفید نہیں بلکہ انتہائی ضرر رساں ہے، یکساں سول کوڈ کی جنگ چھیڑنے سے ہندوستانی قوم کی بہترین دماغی صلاحیتیں ملک کی تعمیر میں صرف ہونے کے بجائے بری طرح ضائع ہوں گی، باشندگانِ ملک کا ایک بڑا طبقہ اضطراب اور کشمکش میں مبتلا ہوگا اور ملک کی سیاست اور معیشت پر اس کے برے اثرات مرتب ہوں گے۔

یکساں سول کوڈ اور قومی یک جہتی

یکساں سول کوڈ کے حامیوں کی یہ فرمودہ دلیل اپنا وزن کھو چکی ہے کہ یکساں سول کوڈ کے نفاذ سے ملک میں اتحاد اور یک جہتی کو فروغ ہوگا، ظاہر ہے کہ جو قانون کروڑوں

انسانوں کے مذہبی عقائد اور دینی جذبات کو بھینٹ چڑھا کر طاقت کے نشہ میں نافذ کیا جائے گا، اس کے ذریعہ ملک میں نفرت اور عداوت کی کاشت ہی ہوگی، ایسے قانون کے ذریعہ اتحاد ویک جہتی کو فروغ ہونے کے بجائے تفرقہ بندی اور بدامنی ہی کو فروغ ہوگا، اس لئے یہ کہنا بڑی بے عقلی اور ہٹ دھرمی کی بات ہے کہ یکساں سول کوڈ کے نفاذ سے قومی یک جہتی پیدا ہوگی۔

قانون اور طاقت کے زور پر یکساں شہری قانون (یونیفارم سول کوڈ) مرتب کر کے اسے نافذ کرنے کی بات کرنے والے اس حقیقت واقعہ کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ملک کے بعض سرحدی صوبوں (مثلاً ناگالینڈ، میزورم وغیرہ) میں ملک کی آزادی کو ایک مدت گذرنے کے بعد اس وقت حالات پر قابو پایا جاسکا جب ملک کے دستور میں ان علاقوں کے باشندوں کو خصوصی تحفظات فراہم کئے گئے، ان کے مذہبی اور قبائلی رسم ورواج عدالتی سسٹم وغیرہ کو دستوری ضمانت دی گئی، بلکہ مرکزی پارلیمنٹ کی بالادستی کو قربان کرتے ہوئے دستور ہند میں یہ بات بھی شامل کر لی گئی کہ پارلیمنٹ کا پاس کردہ کوئی قانون جو فلاں فلاں امور سے متعلق ہو وہاں اس وقت تک نافذ نہیں ہوسکتا جب تک کہ علاقائی یا صوبائی اسمبلی اس کی توثیق نہ کر دے۔

مثلاً ریاست ناگالینڈ کے بارے میں دستور کے حصہ ۲۱ میں دفعہ ۳۷۱ (الف) اس طرح ہے:

دفعہ ۳۷۱-الف-(۱) اس آئین میں کسی امر کے باوجود

(الف) ناگاؤں کی مذہبی یا سماجی رسوم

(۲) ناگاؤں کے رواجی قانون

(۳) اور ضابطۂ دیوانی اور فوجداری عدل گستری، جس میں ناگاؤں کے رواجی قانون کے مطابق فیصلے شامل ہیں۔

(۴) اراضی اور اس کے ذرائع ووسائل کی ملکیت اور انتقال سے متعلق ہو۔

ریاست ناگالینڈ پر نہ ہوگا بغیر اس کے کہ ناگالینڈ کی قانون ساز اسمبلی قرارداد کے ذریعہ ایسا فیصلہ کرے (بھارت کا آئین ۲۰۰۱ء تک ترمیم شدہ) ص ۳۷۰-۳۷۱۔

میزورم کے بارے میں بھی اسی طرح کی خصوصی دفعہ وضع کرکے دستور ہند میں شامل کی گئی، چنانچہ دستور ہند کی دفعہ ۳۷۱ (ز) اس طرح ہے۔

۳۷۱ (ز) اس آئین میں کسی امر کے باوجود

الف- امور مندرجہ ذیل کے متعلق پارلیمنٹ کا کوئی ایکٹ میزورم ریاست کو تب تک لاگو نہیں ہوگا جب تک میزورم ریاست کی قانون ساز اسمبلی کی قرارداد کے ذریعہ اس طرح طے نہیں کیا جاتا ہے، یعنی

(۱) میزو لوگوں کی مذہبی یا سماجی رسوم

(۲) میزو روایتی قانون اور ضابطہ

(۳) سول اور فوجداری انصرام جہاں فیصلے میزو روایتی قانون کے مطابق ہوتے ہیں۔

(۴) ملکیت اور انتقال اراضی

بشرطیکہ اس فقرہ کی کوئی بات آئین (ترپنویں ترمیم) ایکٹ ۱۹۶۸ء کی تاریخ نفاذ سے ٹھیک پہلے میزورم یونین ریاستی علاقہ میں نافذ کسی مرکزی ایکٹ کو لاگو نہیں ہوگی۔ (بھارت کا آئین، ص ۳۲۷-۳۲۸، شائع کردہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۲۰۰۱ء)

اقلیتوں خصوصاً مسلم اقلیت کے پرسنل لاز (عائلی شرعی قوانین) کو پامال کرنے کی کوشش خواہ عدلیہ کی طرف سے ہو یا مقننہ اور انتظامیہ کی طرف سے ملک کے مفاد میں نہیں ہے، ان اقدامات سے قومی یک جہتی کے بجائے منافرت کو فروغ ہوتا ہے اور ملک کی کسی چھوٹی سے چھوٹی اقلیت کو بھی فکر واضطراب میں مبتلا کرکے اور اس کے مذہبی جذبات واحساسات کو مجروح کرکے ملک ترقی نہیں کرسکتا۔

ایک ناگزیر عمل

دفعہ ۴۴ کی منسوخی یا اس میں استثناء کی مہم ایک ناگزیر عمل ہے جسے ہر قیمت پر انجام دیا جانا چاہئے، خواہ اس کے لئے کتنی ہی طویل اور صبر آزما جدوجہد کرنی پڑے، دستور ہند کے مرتب اور منظور ہونے کے بعد اس میں سو سے زائد بار تبدیلیاں ہوچکی ہیں لہذا اگر ہندوستان کی مذہبی اور تہذیبی اقلیتیں اور ہندوؤں کے مختلف قبائل اور فرقے جو یکساں سول کوڈ کے نظریاتی طور پر مخالف ہیں متحد ہوکر دفعہ ۴۴ کی منسوخی یا اس میں ترمیم واستثناء کے لئے منصوبہ بند اور منظم جدوجہد کریں تو اس میں کامیابی کوئی مشکل عمل نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندوں میں یکساں سول کوڈ کے حامی بہت اقلیت میں ہیں لیکن ذرائع ابلاغ پر کنٹرول کی وجہ سے انہوں نے یہ تأثر پیدا کردیا ہے کہ ہندوستان کی غالب اکثریت یونیفارم سول کوڈ کے حق میں ہے، یکساں سول کوڈ کی مخالفت میں اگر لاکھوں کا مجمع ہوجائے تو بھی اسے ہمارا قومی پریس کوئی اہمیت نہیں دیتا، اگر بڑی سیر چشمی کا مظاہرہ کیا تو اخبار کے کسی گوشہ میں مختصر سی خبر دیدی کہ چند سو قدامت پرست یکساں سول کوڈ کی مخالفت میں جمع ہوئے، اس کے برخلاف اگر چند نام نہاد ''ترقی پسندوں'' نے یکساں سول کوڈ کی حمایت اور وکالت میں کوئی جلسہ یا سمپوزیم کیا جس میں بہ مشکل چند درجن لوگ شریک ہوئے تو ہمارا قومی پریس اس کی خبروں کو شہ سرخیوں میں جگہ دیتا ہے، انگریزی اور ہندی کے بڑے اخبارات کے کئی کئی کالم اور صفحات اس کے لئے وقف کردئے جاتے ہیں۔

پرسنل لاز کو دستوری تحفظ دینے کا مطالبہ

میرا خیال یہ ہے کہ اقلیتوں کے پرسنل لاز کی حفاظت کے لئے محض دفعہ ۴۴ کی منسوخی بھی کافی نہیں ہے بلکہ دستور کے بنیادی حقوق کی دفعات میں کسی مناسب جگہ پر مسلم پرسنل لا اور دوسری اقلیتوں کے پرسنل لاز کی حفاظت کی دفعہ بھی شامل کی جانی چاہئے تاکہ چور دروازوں سے مسلم پرسنل لا وغیرہ میں مداخلت کا سلسلہ بند ہو، صورت حال یہ ہے کہ آزادی کے بعد مرکزی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں نے مختلف قوانین منظور کرکے دانستہ یا

نادانستہ طور پر مسلم پرسنل لا میں مداخلت کی ہے، کریمنل لا (قانون تعزیرات) کی مختلف توضیعات سے اسلام کے عائلی قوانین پر زد پڑتی ہے، یوپی کے خاتمۂ زمینداری ایکٹ نے عورتوں کو زرعی زمینوں میں وراثت پانے سے محروم کر رکھا ہے۔

دستور ہند میں دئے ہوئے حق قانون سازی کے مطابق پرسنل لا کے دائرہ میں شامل امور (نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ) کے بارے میں قانون سازی کا اختیار مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت دونوں کو ہے، ملاحظہ ہو دستور ہند کی دفعہ ۲۶۴ فہرست ۳ کا نمبر ۵۔ دستور ہند کی دفعہ ۴۴ پر جس کے حوالے سے موجودہ حکومت ہند یونیفارم سول کوڈ نافذ کرنے کی ٹھانے ہوئے ہے اور ہر قیمت پر اسے پارلیمنٹ سے منظور کرانا اور نافذ کرنا چاہتی ہے۔ یہ دفعہ دستور کے چوتھے باب ''مملکت کی حکمت عملی کے رہنما اصول'' کے ذیل میں آتی ہے۔

اس باب میں کل پندرہ دفعات ہیں۔ دستور ہند کا یہ باب چہارم دفعہ ۳۶ سے شروع ہو کر دفعہ ۵۱ پر ختم ہو جاتا ہے۔ دستور کے اس باب کی ۱۳ دفعات (دفعہ ۳۸ تا ۵۱) جن میں رہنما ہدایات دی گئیں ہیں ان کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں، تو یہ بات صاف طور سے محسوس ہوتی ہے کہ ہندوستان کی حکومتوں نے بہت سی دفعات کو نظر انداز کر رکھا ہے، بلکہ وہ جن پالیسیوں پر عمل پیرا ہیں، وہ پالیسیاں رہنما اصولوں کی دفعات کی صریح خلاف ہیں اور ملک کو ان دی گئی ہدایات کے بالکل مخالف سمت میں لے جایا جا رہا ہے۔

مثلاً دفعہ ۳۹ میں ہے:

حکمت عملی کے کچھ اصول، جن پر مملکت عمل کرے گی، مملکت اپنی حکمت عملی کو خاص طور سے اس امر کے اطمینان کے لئے عمل میں لائے گی کہ (الف) مرد اور عورت سب شہریوں کو مساوی طور پر معقول ذرائع معاش کا حق حاصل ہو۔

(ب) قوم کے مادی وسائل کی ملکیت اور ان پر نگرانی کی اس طرح تقسیم ہو، جس سے حتی المقدور عام بھلائی مقصود ہو۔

(ج) معاشی نظام اس طرح نہ چلایا جائے جس سے دولت اور پیداوار کے ذرائع ایک جگہ جمع ہو کر عوام کے لئے مضرت رساں ہوں۔

بھارت کا آئین سہ لسانی ایڈیشن ص (۲۲۳)

دستور کی دفعہ ۳۹ الف یہ ہے۔

مساویانہ انصاف اور مفت قانونی امداد۔ مملکت اس امر کو یقینی بنائے گی کہ قانونی نظام پر ایسا عمل درآمد ہو، جس سے مساوی مواقع فراہم کرتے ہوئے انصاف کو فروغ ہو اور بالخصوص مناسب قانون سازی سے یا اسکیمیں مرتب کر کے یا کسی دیگر طریقے سے مفت قانونی امداد، اس طرح فراہم کی جائے جس سے اس امر کا تیقن ہو کہ معاشی یا دیگر نا اہلیتوں کی بنا پر کسی شہری کو انصاف حاصل کرنے کے حق سے محروم نہیں رکھا گیا ہے۔

(بھارت کا آئین سہ لسانی ایڈیشن ص ۲۲۴)

دفعہ ۴۳ الف ہے

صنعتوں کے انتظام میں کام گاروں کا اشتراک

مملکت مناسب قانون سازی کے ذریعہ یا کسی دیگر طریقہ سے ایسے اقدامات کرے گی جن سے کسی صنعت سے وابستہ اداروں یا کارخانوں یا دیگر تنظیموں کے انتظامیہ میں کام کرنے والے اشخاص کے اشتراک کی ضمانت ہو۔

(بھارت کا آئین ص ۲۲۵)

اس باب کی دفعہ ۴۷ ہے۔

مملکت اپنے لوگوں کی غذائیت کی سطح اور معیار زندگی کو بلند کرنا اور صحت عامہ کو ترقی دینا اپنے اولین فرائض میں شمار کرے گی، اور خاص طور سے مملکت اس امر کی کوشش کرے گی کہ طبی اغراض کے سوا نشہ آور مشروبات اور مضر صحت مفرد ادویہ کے استعمال کی ممانعت کرے گی (۲۲۷)

اگر ہم باب چہارم کی تمام دفعات کا تفصیل سے جائزہ لیں، تو یہ بات واضح ہو

جائے گی کہ ان میں سے اکثر دفعات کو یا تو ہماری حکومتوں نے نظر انداز کر دیا ہے۔ یا ان پر عمل آوری کے سلسلے میں ایک قدم بھی نہیں بڑھایا ہے، یا ان دفعات کے خلاف اقدامات کئے ہیں اور پالیسیاں بنائی ہیں، ملک میں معاشی توازن قائم کرنا جو حکومت کی اہم ذمہ داری ہے، اس سے تمام حکومتوں کی چشم پوشی، بلکہ اس کے خلاف اقدامات کرنا بدیہی حقیقت ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ملک کی دولت کا (۷۰) ستر فیصد (۱۰۰) سو سے کم سرمایہ داروں کی ملکیت اور کنٹرول میں ہے اور ملک کی آبادی کا ایک بڑا حصہ ضروریات زندگی کو ترس رہا ہے ان کے پاس صبح وشام کا کھانا بھی نہیں ہے۔ اور شراب بندی نیز منشیات کی روک تھام، جس پر ہندوستان کی حکومتوں کو باب چہارم کی ہدایات کے مطابق بھرپور توجہ دینی چاہیئے تھی ان پر کوئی کنٹرول نہیں ہے، بلکہ شراب اور منشیات کی لت بڑھتی جارہی ہے اور نسلوں کو تباہ کررہی ہے۔

ان تمام اہم کاموں کو چھوڑ کر موجودہ حکومت ہند کی پوری کوشش ہے کہ دفعہ ۴۴ پر عمل کرے اور یونیفارم سول کوڈ کو پارلیمنٹ سے پاس کرا کر نافذ کردے۔ حالاں کہ حکومت کے پاس یونیفارم سول کوڈ کا کوئی خاکہ بھی نہیں ہے۔

اترا کھنڈ کی بھاجپا حکومت نے صوبائی سطح پر جو یونیفارم سول کوڈ متعارف کرایا ہے وہ یونیفارم سول کوڈ ہرگز نہیں ہے، بلکہ اسلامی شریعت کے چند قوانین میں مداخلت کی بدبختانہ کوشش ہے، جسے کسی حال میں قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت تو موجودہ حکومت خالص سیاسی مقاصد کیلئے یونیفارم سول کوڈ کا شور مچارہی ہے اور ہندو مسلم منافرت کا ماحول پیدا کر کے الیکشن میں کامیابی کی اسکیمیں بنارہی ہے۔

اگر حکومت اپنے اس اقدام میں سنجیدہ اور بہی خواہ ہوتی اور واقعۃ پورے ملک کے لئے یکساں سول کوڈ بنانے کیلئے پرعزم ہوتی تو اسے سب سے پہلے دستور کی دفعہ ۳۷۱ کے ختم کرنے کا اقدام کرنا چاہیئے تھا، جس طرح اس نے کشمیر سے متعلق دستور کی دفعہ ۳۷۰ کو یک لخت ختم کیا۔ کیوں کہ دفعہ ۳۷۱ میں ناگالینڈ-آسام-منی پور-آندھراپردیش، سکم، میزورم،

ارونا چل وغیرہ کے بارے میں جو تحفظات دئے گئے ہیں، ان کی موجودگی میں وہاں کے لوگوں پر یونیفارم سول کوڈ کا نفاذ نہیں ہوسکتا۔ خواہ اسے قانون ساز اداروں سے منظور کرا کر نافذ بھی کردیا جائے، اس طرح کئی کروڑ لوگ اس قانون کے اطلاق سے خارج رہیں گے اس لئے ہندوستان میں قائم ہونے والی جو حکومت بھی نتائج سے آنکھیں بند کر کے دفعہ ۴۴ کو پورے ملک میں نافذ کرنا چاہے۔ اس کیلئے یہ ضروری ہوگا کہ پہلے دفعہ ۳۷۱ کو ختم کرے۔

خود ہندوؤں میں پرسنل لا کے مسائل میں جتنے اختلافات ہیں اور جتنے مختلف رسم و رواج ہیں ان کے پیش نظر صرف ہندوؤں کے لئے بھی پرسنل لا کے مسائل میں یکساں قانون نہیں بنایا جاسکتا اسی لئے ہندو کوڈ بل میں قدم قدم پر یہ ذکر کیا گیا ہے، کہ جہاں کوئی دوسرا کسٹم یا رواج ہو وہاں اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اللہ تعالی ملک کے حکمرانوں کو توفیق دے کہ اپنے وقتی سیاسی مقاصد کیلئے ایسے اقدامات نہ کریں جن سے ملک کو نقصان پہونچے اور باشندگان ملک کے درمیان امن و بھائی چارگی کے بجائے عداوت ومنافرت پیدا ہو۔

خدانخواستہ اگر موجودہ حکومت اپنے گھٹیا سیاسی مقاصد کیلئے سوچے سمجھے بغیر عجلت میں یونیفارم سول کوڈ کے نام پر کوئی ایسا قانون لے آتی ہے جو اسلامی شریعت کے خلاف ہو تو مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا۔ مسلمانوں نے اللہ کی بندگی اختیار کی ہے وہ اللہ کی اتاری ہوئی شریعت پر عمل کرنے کے پابند ہیں۔ اپنی خوشی سے وہ اپنے اوپر شریعت کو نافذ کریں گے۔ اور ماضی کی طرح مستقبل میں بھی اسلامی راستے پر گامزن رہیں گے جو ان کیلئے دنیا اور آخرت میں کامیابی کا راستہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆